تاریخ دستورِ انگلستان

مولف

سید علی محسن
سابق ریڈر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی

ترقی اردو بورڈ
حکومتِ ہند
نئی دہلی

تاریخ دستورِ انگلستان

مولف

سید علی محسن

سابق ریڈر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی

ترقی اردو بورڈ

حکومت ہند

نئی دہلی

تاریخ دستورِ انگلستان

۱۴۸۵ء سے زمانۂ حال تک

سیّد علی محسن ایم اے، ایم ایڈ (عثمانیہ)

(سابق ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶ء)

سابق ریڈر شعبہ تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن)

جنوری سنہ ۱۹۷۶ء

پہلا ایڈیشن ، تین ہزار

© ترقی اردو بورڈ وزارت تعلیم وسماجی بہبود، حکومت ہند

قیمت (۶) روپے

تقسیم کار اور ناشر :

انجمن ترقی اردو ، اردو ہال حمایت نگر ، حیدرآباد (۲۹)

زیر اہتمام : سری نیواس لاہوٹی

مطبع : سیاست آفسٹ پریس ۔ حیدرآباد (۱)

تاریخ دستورِ انگلستان
سنہ 1485ء سے زمانۂ حال تک

فہرستِ ابواب

باب	عنوان	صفحہ
۱۔ پہلا باب	تمہید ـ پندرھویں صدی تک دستوری ارتقاء	۱
۲۔ دوسرا باب	ٹیوڈروں کے عہدِ حکومت میں دستوری ترقی	۶
۳۔ تیسرا باب	شاہانِ اسٹورٹ ـ (۱) ـ جیمز اول اور پارلیمنٹ۔	۲۹
۴۔ چوتھا باب	شاہانِ اسٹورٹ ـ (۲) ـ چارلس اول اور دستوری کشمکش (۱)	۴۴
۵۔ پانچواں باب	شاہانِ اسٹورٹ ـ چارلس اول ـ پارلیمنٹ کی کامیابی (۲)	۶۱
۶۔ چھٹا باب	دولتِ عامّہ ـ دستوری تجربات	۷۳
۷۔ ساتواں باب	عودِ شاہی سنہ 1660ء ـ چارلس دوم	۸۲
۸۔ آٹھواں باب	زرین انقلاب ـ جیمز دوم	۱۰۳
۹۔ نواں باب	پارلیمانی شاہی کا آغاز ـ ولیم سوم اور میری	۱۱۶
۱۰۔ دسواں باب	پارلیمانی شاہی کا آغاز ـ این	۱۳۰
۱۱۔ گیارھواں باب	ہنوویرین خاندان ـ کابینہ کا ارتقاء ـ جارج اول و جارج دوم	۱۳۹
۱۲۔ بارھواں باب	کابینی ارتقاء میں مزاحمت ـ جارج سوم (۱)	۱۵۷
۱۳۔ تیرھواں باب	پٹ کی وزارت اور کابینی ارتقاء ـ جارج سوم (۲)	۱۷۱
۱۴۔ چودھواں باب	پارلیمانی اصلاح کی ضرورت	۱۹۱

۱۵۔ پندرھواں باب پارلیمانی اصلاح ۔ قانونِ اصلاح 1832ء ۔ ۱۹۹
۱۶۔ سولہواں باب انیسویں اور بیسویں صدی میں عدلیہ اور حکومتِ مقامی کی تنظیم جدید ۲۱۶
۱۷۔ سترھواں باب پارلیمانی اصلاح ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ۲۲۷
۱۸۔ اٹھارواں باب کابینی ارتقاء انیسوی صدی میں ۔ تاج، کابینہ اور دارالعوام ۲۳۹
۱۹۔ انیسواں باب دارالامراء کے اختیارات میں تخفیف ۲۵۴
۲۰۔ بیسواں باب پارلیمانی اصلاح بیسویں صدی میں ۲۶۶
۲۱۔ اکیسواں باب کیبنٹ عہدِ حاضر میں ۔ دستور پر جنگِ عظیم کے اثرات ۲۷۲
۲۲۔ بائیسواں باب دستور کے جدید رجحانات ۔ (مفوضہ قانون سازی انتظامی دادرسی، وغیرہ اور دولتِ مشترکہ) ۲۹۴
۲۳۔ تیئسواں باب دستورِ انگلستان کی خصوصیات ۳۱۸

پیش لفظ

رابندرناتھ ٹیگور نے کئی سال پہلے یہ شکایت کی تھی کہ مادری زبان اور تعلیمی زبان میں جو دُوری اور علیحدگی ہندوستان میں پائی جاتی ہے وہ دُنیا کے کسی اور مُلک میں نظر نہیں آتی۔ مُلک کو آزاد ہوئے رُبع صدی سے زیادہ مُدت گذر چکی لیکن اس تعلق سے ہمارے اندازِ فکر میں ابھی تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔

اس دوران میں کئی ماہرینِ تعلیم نے اہلِ ملک کو اس خرابی کی طرف متوجہ بھی کیا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے واضح الفاظ میں اس خیال کا اظہار کیا کہ حُصولِ علم کے لیے جو زبان اختیار کی جائے وہ ایسی ہو کہ طالب علم آسانی کے ساتھ معلومات حاصل کر سکے، صحت کے ساتھ بے کم و کاست ہر مسئلے پر سوچ سکے اور وضاحت کے ساتھ دوسروں کو اپنی بات سمجھا سکے۔ اور اس مقصد کو مادری زبان ہی بدرجۂ اتم پورا کر سکتی ہے۔ کیوں کہ غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے طالب علم کی ساری توانائی مطالب کو سمجھنے کی بجائے الفاظ کے رٹنے میں صرف ہو جاتی ہے۔

انگریزی کے بارے میں اس اظہارِ خیال سے کسی کو غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ جیسا کہ کوٹھاری کمیشن نے کہا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انگریزی یا دوسری عالمی زبانوں کو مُلک بدر کر دیا جائے، بلکہ خود ان زبانوں سے بہتر استفادے کا اِنحصار اس بات پر ہے کہ پہلے ہماری اپنی تعلیم زیادہ مؤثر، بامقصد اور سُود مند ہو۔ اور اس کے لیے مادری زبان کو حُصولِ علم کا ذریعہ بنانا لازمی ہے۔

کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کو شائع ہوئے بھی دس سال ہو گئے لیکن اس پر خلوصِ دل سے عمل کرنے کی ابھی تک مُلک کو توفیق نہیں ہوئی۔

ان مایوس کن حالات میں اُمید کی ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوئی ہے۔ حکومت ہند نے ملک کی چودہ اہم زبانوں میں سے ہر ایک کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے ایک ایک کروڑ روپوں کی رقم فراہم کی ہے جس سے ہر ریاست اپنی علاقائی زبان کی توسیع واشاعت کے لیے ضروری اقدامات کر رہی ہے۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے اس کے لیے خود مرکز میں وزارتِ تعلیم کے تحت ایک ادارہ ترقی اُردو بورڈ کے نام سے قائم کیا گیا ہے جو اردو زبان میں مختلف قسم کا لٹریچر تیار کرا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ اس ریاست کے کالجوں میں پڑھنے والے اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبا کے لیے نصابی کتابیں تیار کرے۔ انجمن نے اس غرض سے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کے مطابق فنون، سائنس اور کامرس کے شعبوں میں کم و بیش ستر کتابیں عثمانیہ یونیورسٹی کے موجودہ اور سابقہ اساتذہ سے لکھوائی جا رہی ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اگر حالات سازگار رہے تو اُمید ہے کہ دو ڈھائی سال کے اندر یہ کام پورا ہو جائے گا۔

میں انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کی طرف سے ترقی اُردو بورڈ کے اراکین اور خاص کر اس کے صدر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

انجمن کے معتمد تنظیمی، سری نواس لاہوٹی صاحب نے مقامی طور پر اس کام کو آگے بڑھانے میں بڑی اَن تھک کوشش کی جس کے لیے وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

اُردو ہال
حمایت نگر، حیدر آباد

حبیب الرحمٰن
معتمد انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش

حرفِ اوّل

تاریخ دستورِ انگلستان کو عام طور پر ایک دشوار اور کٹھن مضمون سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ قارئین یہ دیکھیں گے کہ اس مضمون کا نہج اور اس کے موضوعات عام تاریخوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہیں۔ اُردو داں طبقہ کے لئے ایک دشواری اور یہ ہے کہ اس موضوع پر اُردو میں کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوتی۔ کسی زمانے میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کا کام حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ دارالترجمہ نے انجام دیا تھا۔ مگر اب یہ سارا ذخیرہ بالکل ناپید ہے۔ اور یوں بھی جہاں تک مجھے اس وقت یاد ہے کہ دستورِ انگلستان کی صرف دو کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا تھا۔ یہ دونوں کتابیں باوجود تلاش کے مجھے کہیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ ان میں سے ایک تو انٹرمیڈیٹ کے لئے تھی، دوسری بی اے کے لئے۔ ثانی الذکر کتاب اگر کہیں دستیاب بھی ہو جائے تو بی اے کے موجودہ نصابی ضروریات کے لئے ناکافی اور غیر ہم آہنگ ثابت ہوگی۔

اُردو کی ترقی اور فروغ کے لئے وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کے تحت اُردو بورڈ دہلی نے نصابی کتب کی تیاری کا کام وسیع پیمانے پر شروع کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس وقت نہ صرف مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم کا کام جاری ہے بلکہ تصنیف و تالیف کی بھی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ اسی ضمن میں جب تاریخ دستورِ انگلستان پر یونیورسٹی کے طلبا کے لئے کسی کتاب کے لکھوانے کا خیال پیدا ہوا تو استاذی پروفیسر حبیب الرحمٰن نے یہ کام میرے سپرد فرمایا۔ میں اس قدر افزائی کے لئے ان کا شکرگزار ہوں۔

"تاریخ انگلستان" سے مجھے ہمیشہ غیر معمولی شغف رہا۔ یوں تو ایک طویل درس و تدریس کی زندگی میں "شعبۂ تاریخ" کے دوسرے مضامین پڑھے بھی ہیں اور پڑھاتے بھی ہیں اور ان کے وسیع مطالعہ کا موقعہ ملا ہے لیکن تاریخ انگلستان سے ایک خاص فطری لگاؤ سا تھا۔ اس

دلچسپی نے اس مضمون کے وسیع تر اور بالاستیعاب مطالعہ کے مواقع پیدا کئے۔ اور یہ مطالعہ صرف فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے لئے نہیں بلکہ زیادہ تر اپنے شوق کی تکمیل کے لئے تھا۔ اسی دلچسپی نے میرے اس کام کو آسان بنایا۔ سالہا سال کی محنت کام آئی۔ اور میں اس قابل ہو سکا کہ اس کتاب کو جو عثمانیہ یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب کے مطابق لکھی گئی ہے صرف آٹھ مہینوں کی قلیل مدت میں تیار کر سکوں۔

اس کتاب کی تیاری میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مواد کی پیش کشی میں تاریخی صحت اور صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ حتی الامکان کوئی ایسی بات نہیں لکھی گئی ہے جس کی تصدیق اس مضمون کے علماء اور اساتذہ کی کتب سے نہ ہوتی ہو۔ یوں تو انسان کی کوئی کوشش عیب سے خالی نہیں مگر میں نے حتی الوسع اس کتاب کو ایسی خامیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے جو عجلت پسندی بے پرواہی یا مطالعہ کی تنگ دامانی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

اصطلاحات کے ترجمہ کے سلسلہ میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ سلیس اور آسان ہو۔ بعض تراجم تو میں نے وہی اختیار کئے ہیں جو آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کئے گئے تھے اور جو میری طالب علمی کے زمانہ سے میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ مگر جہاں جہاں میری یادداشت نے میرا ساتھ نہیں دیا میں نے اپنے طور پر ترجمہ کیا ہے۔ اس میں سلاست اور معنویت دونوں کا لحاظ رکھا ہے۔ مثال کے طور پر "INSTRUMENT OF GOVERNMENT" کا ترجمہ بعض اوقات "آلۂ حکومت" کیا جاتا ہے مگر یہ ترجمہ مجھے پسند نہیں آیا کیونکہ آلہ کے لفظ کے ساتھ ہی اوزار اور آلات کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ "انسٹرومنٹ آف گورنمنٹ" اصل میں ایک دستور ہے، اس لئے میں نے اس کا ترجمہ "آئینِ حکومت" کیا ہے اور میری ناقص رائے میں یہ بہتر بھی ہے۔

ہر چند یہ کتاب یونیورسٹی کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے لیکن اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے سنجیدہ اور علم دوست طبقہ کے لئے بھی مفید ثابت ہو جو اس مضمون سے دلچسپی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ پیش کش طلباء، اساتذہ اور اس مضمون سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ آخر میں مجھے اپنی علمی نارسائی کے اعتراف کے سوا کچھ اور عرض کرنا نہیں ہے۔

سید علی محسن

سلیم نگر، حیدرآباد ۳۶

فروری ۱۹۷۵ء

پہلا باب

تمہید

پندرہویں صدی تک
دستوری اِرتقاء پر ایک طائرانہ نظر

سیکسن دَور کے مقامی اِدارات کی اہمیت

انگلستان کے دستور کی تاریخ صدیوں پُرانی ہے۔ دنیا کے موجودہ دساتیر میں شاید یہ واحد دستور ہے جس کی صورت گری کسی دستور ساز اسمبلی یا کنونشن میں نہیں ہوئی بلکہ جس کو تاریخ نے اپنے ہاتھوں ڈھالا ہے۔ موجودہ دستور صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ اس کی بنیادیں سیکسن دَور تک پہنچتی ہیں۔ ہر دَور اور ہر صَدی میں کچھ نہ کچھ ترقی ہوتی رہی۔ سیکسنوں نے جو سیاسی اِدارے بنائے تھے ان سے نارمنوں نے فتح (۱۰۶۶ء) کے بعد بھی کام لیا۔ ان قدیم سیاسی اِداروں کو نارمنوں نے مٹانے کی کوشش نہیں کی، البتہ بقدرِ ضرورت ان میں ترمیم کی۔ نارمن چونکہ فرانس سے آئے تھے، اس لئے وہ نظام جاگیری اپنے ساتھ لیتے آئے جو اس وقت تمام یورپ میں پھیلا ہُوا تھا۔ انگلستان میں نظام جاگیری کی ترویج سے ایک بڑا سیاسی اور سماجی انقلاب رُونما ہوا۔ اس نظام کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا۔ سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کے جو نقشے فتح کے بعد اُبھرے وہ اس نظام کے آئینہ دار تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے انگلستان کی تاریخ فی الحقیقت نظام جاگیری کے عروج و زوال کی تاریخ ہے۔ نارمنوں نے فتح کے بعد مرکزی حکومت کا ڈھانچہ بالکل بدل دیا۔ مرکزی سیاسی ادارے اسی نظام کے زیرِ اثر تشکیل پائے، لیکن مقامی حکومت کو زیادہ تر اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ نارمنوں نے ایک بڑی عقلمندی یہ کی کہ انھوں نے مقامی حکومت کے قدیم اداروں کو نہیں چھیڑا بلکہ اُنکو زیادہ مضبوط اور طاقتور بنانے کی کوشش کی۔ اِن اداروں کی سب سے

اہم خصوصیت یہ تھی کہ مقامی حکومت، مقامی لوگوں کے ہاتھ میں تھی ۔ مرکز اس میں زیادہ دخیل نہیں تھا۔ یہاں شروع سے ہی حکومتِ خود اختیاری (لوکل سلف گورنمنٹ) کی داغ بیل ڈالی گئی تھی ۔ سلف گورنمنٹ کی اِسپرٹ کو نارمنوں نے نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کو زیادہ قوی اور کارکرد بنانے کی کوشش کی ۔

مقامی اِدارات میں "نمائندگی" کا اُصول

مقامی حکومت کے اِداروں میں نمائندگی (REPRESENTATION) کا اصول ہمیشہ کارفرما رہا۔ سیاسی معاملات کی انجام دہی میں "نمائندگی" کے تصور کی اہمیت، انگریزوں کا ایک قدیم ورثہ ہے جو اُن کو اپنے ٹیوٹانی اجدادِ سے حاصل ہوا ہے ۔ سیکسنوں کے زمانے میں، اور بعد بھی، ایک عرصہ تک سیاسی تنظیم کی سب سے ابتدائی اور چھوٹی وحدت ٹاون شِپ یا پیرِش (موضع) کی تھی ۔ یہاں مقامی باشندے، اپنے موضع کا انتظام، اپنی مقامی مجلس کے ذریعہ سے کرتے تھے جو عام طور پر "موٹ" (MOOT) کہلاتی تھی ۔ مقامی حکومت کی دو اور وحدتیں تھیں ۔ ایک ہنڈرڈ (HUNDRED)، دوسرے شائر۔ ہنڈرڈ کی حیثیت ایک تعلقہ کی سی تھی ـــ اور شائر مِثل ایک ضلع کے تھا ۔ ان کی اپنی اپنی مجلسیں ہوا کرتی تھیں جو علی الترتیب ہنڈرڈ، موٹ اور شائر کورٹ کہلاتی تھیں ۔ قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ ہنڈرڈ اور شائر کی مجلسوں میں ٹاون شِپ کے نمائندے جن کی تعداد چار یا پانچ ہوتی، نشست کرتے تھے ۔ اسی طرح ہنڈرڈ بھی اپنے نمائندے شائر کو روانہ کیا کرتا تھا ۔ مقامی حکومت کا یہ نظام صدیوں برقرار رہا ۔ نارمنوں کے زمانہ میں گشتی عدالتیں جب ملک کے اندرونی حصّوں کا دَورہ کرتیں تو ان کو مقامی مجالس کی کارکردگی کی جانچ کا موقعہ ملتا ۔ یہ عدالتیں مرکز اور مقامی حکومت کے درمیان رابطہ کا ایک ذریعہ تھیں ۔ ان سے ملک بھر میں جرائم کے انسداد اور خاطیوں اور مجرموں کو سزا دینے کا کام لیا جاتا تھا ۔ اضلاع اور دیہات میں دَورہ کرکے یہ حکّام تشخیص اور تحصیلِ محاصل کا کام بھی انجام دیتے تھے ۔ مختصر یہ کہ گشتی عدالتوں کے حکّام مرکزی حکومت کے نمائندوں کی حیثیت شائر اور ہنڈرڈ کی مجالس میں نہ صرف وہاں کے مقامی سربرآوردہ اشخاص سے ملتے تھے بلکہ ٹاون شِپ کے نمائندوں سے بھی ان کا ربط پیدا ہوتا تھا ۔ اس انتظام نے مرکز اور مقامی حکومت کے مختلف اجزاء میں ایک باہمی تعلق پیدا کر رکھا تھا ۔ اس تعلق کی بُنیاد "نمائندگی" کے اصول پر تھی ۔ بارھویں صدی کے اختتام تک اس میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوا ۔ شاہی ججوں کے ورود کے موقعہ پر ان کے سامنے مقدمات کی پیش کشی کے لئے کارونروں (CORONERS) کے انتخاب کے طریقہ کو رائج کیا گیا ۔ طے کیا گیا تھا کہ

ان عہدہ داروں کا انتخاب، ہر شائر کے لئے وہاں کی مجلس میں ہوا کرے۔ اس طریقہ پر عمل درآمد نے لوگوں کو مقامی حکومت کے انصرام میں "انتخابی اصول" سے روشناس کیا۔ تیرھویں صدی تک انتخاب کے ذریعہ سے نمائندگی کا تصور کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اور مقامی حکومت کے اداروں میں اس سے وسیع طور پر کام لیا جانے لگا تھا۔

مرکز اور منتخب نمائندے

مقامی حکومت کی مختلف سطحوں پر منتخبہ نمائندوں سے کام لینے کا تجربہ کچھ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ اسی طریقہ کو مرکزی حکومت نے بھی اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ تیرھویں صدی میں بادشاہ کو اکثر روپیہ کی ضرورت لاحق رہتی تھی۔ بادشاہ کی اس ضرورت کی تکمیل میں ہر طبقے اور ہر علاقہ کو اپنا حصہ ادا کرنا تھا۔ عموماً شہروں اور ضلعوں سے (SHIRES) سے امداد طلب کی جاتی تھی۔ اس امداد کے تعین کے لئے اس سے بہتر کیا طریقہ کار ہو سکتا تھا کہ مقامی نظم ونسق کی وحدتوں، بشمل شائر اور ٹاؤن شپ وغیرہ کے نمائندوں کو طلب کیا جائے اور ان کے اپنے علاقوں کی سکت و استطاعت کے مطابق ان سے جو رقمی امداد مل سکتی ہے اس کی گنجائش معلوم کی جائے۔ اس طرح منتخبہ نمائندوں سے کام لینے کی جو مشینری، مقامی حکومت کی سطح پر کارآمد اور مفید ثابت ہوئی تھی اب اس سے مرکز کی سطح پر کام لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔

تیرھویں صدی سے اضلاع اور شہروں سے وقتاً فوقتاً نمائندے محض بادشاہ کو رقمی امداد فراہم کرنے کے لئے طلب کئے جاتے رہے۔ ان کا انتخاب، شرف کی نگرانی میں، اضلاع کی مجالس میں ہوتا تھا۔ اس قسم کے اجتماعات نے دستور کی ترقی کی ایک نئی شاہ راہ کھول دی۔ اس سے آئندہ ایک ایسی قومی اسمبلی کی صورت گری کے امکانات پیدا ہو گئے جس میں مقامی علاقوں کے منتخبہ نمائندے شرکت کر سکتے تھے۔ پارلیمنٹ کے ارتقاء کا اس کو پہلا قدم سمجھنا چاہیئے۔

1295ء کی پارلیمنٹ اور آئندہ دستوری ارتقاء

شاہی اغراض کے لئے مقامی علاقوں سے منتخبہ نمائندوں کے طلب کئے جانے کا طریقہ کثرت عمل درآمد سے تیرھویں صدی میں اتنا مستحکم ہو گیا کہ 1295ء تک ایک قومی پارلیمنٹ تشکیل پا گئی۔ اس میں اضلاع اور شہروں کے نمائندوں کے ساتھ امراء اور اساقفہ کو بھی طلب کیا گیا تھا۔

اس پارلیمنٹ کو دستوری تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ کیونکہ آئندہ زمانے میں پارلیمنٹ اسی ڈھنگ اور اسی نمونہ پر طلب کی جانے لگی ۔

تیرھویں صدی کے اختتام تک پارلیمنٹ کی ترکیب و ہیئت متعین ہوگئی تھی ۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اس نے نہ صرف مستحکم حیثیت حاصل کرلی بلکہ اپنے اختیارات میں روز افزوں اضافہ کرتی رہی ۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پارلیمنٹ کے وجود میں آنے کا ایک بنیادی سبب، بادشاہ کی روپیہ کی مجبوری تھی ۔ روپیہ کے حاصل کرنے کے لئے اس نے پارلیمنٹ کو طلب کرنا شروع کیا ۔ بادشاہ کی اسی مجبوری سے، پارلیمنٹ برابر فائدہ اٹھاتی رہی ۔ اور اس سے اپنے لئے بہت سے حقوق اور اختیارات حاصل کرنے شروع کئے ۔ اس دو سو سالہ عرصہ میں دو سمتوں میں پارلیمنٹ نے اپنے آپ کو بہت طاقتور کرلیا ۔ ایک حق تو اس نے یہ حاصل کیا کہ اس کی مرضی اور رضامندی کے بغیر بادشاہ کوئی ٹیکس عاید نہیں کرے گا ۔ دوسرے یہ کہ قانون سازی اس کی شرکت اور تعاون کے بغیر ناجائز ہوگی ۔ ان دونوں امور میں پارلیمنٹ کے اختیارات مسلّمات دستور میں سے بن گئے ۔ نیز اس دور میں اس نے یہ کوشش بھی کی کہ بادشاہ کے مشیروں اور وزیروں پر اس کا کنٹرول قائم ہو جائے ۔ ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا جاتا تھا کہ بادشاہ صرف ایسے اشخاص کو پریوی کونسل کی رُکنیت اور وزارتی عہدے سپرد کرے جو پارلیمنٹ کے اعتماد کے حامل ہوں ۔ چودھویں صدی سے ناپسندیدہ عمائدین اور مشیرانِ سلطنت کو مواخذہ کے ذریعہ سے سزا دینے کا حق بھی حاصل کرلیا گیا ۔ غرض چودھویں اور پندرھویں صدی میں پارلیمنٹ بادشاہ کے اختیارات پر تحدید عاید کرنے کی کوشش کرتی رہی ۔ اور اس طرح نارمنوں کی مطلق العنان شاہی کو ایک محدود شاہی میں تبدیل کرنے کے لئے پیہم کوشش جاری رکھی ۔

لنکسٹری تجربہ کی ناکامی

پندرھویں صدی کے آغاز میں لنکسٹری خاندان کی تخت نشینی نے اس کوشش کو بڑی حد تک کامیاب کردیا ۔ اس دور میں پارلیمنٹ بادشاہ پر چھائی ہوئی رہی اور بادشاہ اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ اس کی حیثیت ایک دستوری حکمران کی سی ہوگئی ۔ مگر لنکسٹریوں کا یہ دستوری تجربہ ناکام ثابت ہوا ۔ کیوں کہ ادارہ شاہی کی کمزوری نے ایسی طاقتوں کو سر اُٹھانے کا موقع عطا کردیا جو شخصی مفادات اور ذاتی اغراض کے لئے، ملک کے امن وامان کو نیست و نابود کرنا چاہتے تھے ۔ نظامِ جاگیری کے پروردہ، ان خانہ برانداز عناصر نے شاہی اقتدار کی گرفت ڈھیلی دیکھ کر ملک میں وہ اودھم مچائی کہ الامان والحفیظ ۔ تقریباً

۵

تیس سال تک طاقتور جاگیرداروں اور بیرنوں نے ملک میں جدال وقتال کا بازار ایسا گرم رکھا کہ امن و امان اور نظم وضبط کے تاروپود بکھر کر رہ گئے۔ پارلیمنٹ نے بادشاہ کو تو دبا لیا تھا لیکن قوم کے ان شرپسند عناصر کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ دستوری ترقی تو بلاشک وشبہ بڑی تیز رفتاری سے عمل میں آئی تھی لیکن قوم کی نہ کوئی ذہنی تربیت ہوئی تھی نہ وہ ڈسپلن اور نظم وضبط کی خوگر تھی۔ قومی ڈسپلن کی عدم موجودگی میں' محدود شاہی کا قیام ملک کے لئے بہت تباہ کن ثابت ہوا۔

تیس سال کی خانہ جنگی کے بعد جب ٹیوڈروں نے حکومت سنبھالی تو ان کو ورثہ میں ایک ترقی پذیر دستور تو ملا لیکن تجربہ نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس پر عمل آوری' موجودہ فتنہ وفساد کی فضا میں خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لئے ٹیوڈروں نے کمال دانشمندی سے دستور کی اساس کو نقصان پہنچائے بغیر ایک طاقتور شاہی قائم کر دی۔

دُوسرا باب

ٹیوڈروں کے عہد حکومت میں دستوری ترقی

ہنری ہفتم کی تخت نشینی

ٹیوڈر خاندان کی حکومت کا آغاز سنہ 1485ء سے ہوا۔ گزشتہ تیس سال کی خانہ جنگی کا خاتمہ، باسورتھ کے میدان میں ہوا جب کہ ہنری ڈیوک آف رچمنڈ نے رچرڈ سوم کو شکست دی اور تلوار کے زور سے انگلستان کے تخت و تاج کا مالک ہوگیا۔ ہنری کا سلسلۂ نسب لنکاسٹریوں سے ملتا تھا۔ اس طرح لنکاسٹری دوبارہ تخت و تاج کے بزورِ شمشیر حقدار بن گئے اور یارکیوں کو ان کے مرجّح قانونی حقوق کے باوجود حکومت سے بے دخل کردیا۔ ہنری کی میدانِ جنگ میں کامیابی ایسی موثر اور فیصلہ کن تھی کہ پارلیمنٹ نے اسے تخت و تاج کا پیش کش کرکے اس فیصلہ کی قانونی توثیق کردی جو تلوار نے پہلے ہی کردیا تھا۔ پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں ہنری کو انگلستان کا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ اس طرح ٹیوڈر خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ ہنری نے ' ہنری ہفتم کا لقب اختیار کیا۔ ٹیوڈروں کے دورِ حکومت کا آغاز انگلستان کی سیاسی اور دستوری تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ دستوری نقطۂ نظر سے یہ بات کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے کہ ہنری کو اپنی بادشاہت کی توثیق کے لئے رسمی طور پر پارلیمنٹ سے تاج حاصل کرنا پڑا۔ اس بات کو بڑی نظریاتی اہمیت حاصل ہے۔ یہ پارلیمنٹ کے اس حق کا ادّعا تھا کہ صرف پارلیمنٹ بادشاہ کو منتخب کرسکتی ہے۔ اور یہ کہ انگلستان کا تاج اسی کے سر پر رکھا جاسکتا ہے جس کو پارلیمنٹ پسند کرے۔ ہرچند کہ اس زمانے میں پارلیمنٹ کی کمزوری مسلّمہ تھی، اور حق تو یہ ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے نہ وہ کسی کو بادشاہ بناسکتی اور نہ کسی کو بادشاہت سے بے دخل کرسکتی تھی اور اس مرحلہ پر اس نے

جو کچھ کیا' وہ صرف اس قدر تھا کہ 'تلوار نے جو کچھ فیصلہ کیا تھا اسے اس نے بے چوں وچرا تسلیم کر لیا. مگر اس بے بسی کے باوجود بادشاہت کے جواز کے لئے اس کی منظوری ناگزیر خیال کی گئی. ہنری اپنے حق کو قانونی طور پر مستحکم کرنا چاہتا تھا. قانونِ توریثِ اولادِ اکبر (.PRIMOGENITURE) کی رُو سے لنکاسٹریوں کو' یارکیوں کے مقابلے میں حقِ وراثت نہیں پہنچتا تھا. اس لئے یہ ضروری تھا کہ ہنری کی تخت نشینی کے لئے پارلیمنٹ کی توثیق حاصل کی جائے. پارلیمنٹ کے اس اختیار کے بارے میں قطعی کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ "توریثِ اکبر" کے قانون کو نظر انداز کر کے کسی بھی جونیئر لائن (اولادِ اصغر) کے فرد کو اپنی مرضی سے بادشاہ بنا سکتی تھی. یہ اختیار واضح طور پر پارلیمنٹ نے 1399ء کے دستوری انقلاب کے ذریعے حاصل کر لیا تھا.

یہ جو کچھ بھی ہوا وہ دستور کے رسمی تقاضوں کی تکمیل تھی. ورنہ ہنری ہفتم حقیقی معنی میں تخت و تاج کے لئے پارلیمنٹ کا رہینِ منت نہیں تھا. اس لحاظ سے ہنری کی تخت نشینی دستور کی استواری کا ذریعہ نہ بن سکی. زمانۂ ماسبق میں ہنری چہارم کو پارلیمنٹ نے جب تخت پیش کیا (1399ء) تو اس سے دستور کی پابندی کے وعدے لئے. اور اس پر ان تمام بدعنوانیوں سے دُور رہنے کی شرطیں عائد کیں جس کی بنا پر رچرڈ دوم کو تخت سے محروم کیا گیا تھا. ہنری چہارم کا موقف بہت کمزور تھا کیونکہ اولادِ اصغر کے سلسلہ میں ہونے کی وجہ سے اس کا حقِ وراثت اولادِ اکبر کی موجودگی میں (جیسا کہ اس وقت صورتِ حال تھی) عملاً مفقود تھا. یہی وجہ ہے کہ ہنری چہارم اور اس کے جانشین دیگر لنکاسٹری بادشاہوں کو ہمیشہ پارلیمنٹ سے دبے دبائے رہنا پڑا. کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تاج ان کے لئے پارلیمنٹ کا عطیہ ہے. اس کے علاوہ انھیں تاج پر کوئی جائز حق نہیں ہے. ایسے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ پورے لنکاسٹری دور میں پارلیمنٹ بادشاہوں پر چھائی ہوئی رہی. اور بادشاہ اس سے مرعوب اور اس کے مقابلے میں مجبور و محتاج رہے. لنکاسٹری دور میں نہایت تیز دستوری ارتقا کا اصلی راز یہی ہے. لیکن جب 1485ء میں ٹیوڈر حکمران ہوئے تو اگرچہ حقِ وراثت کی حد تک وہ بھی کمزور موقف کے حامل تھے لیکن اس کے باوجود پارلیمنٹ کو ان پر کوئی برتری حاصل نہ ہوئی. کیونکہ ٹیوڈروں کو تخت پارلیمنٹ کے عطیہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک فاتح کے مالِ غنیمت کی حیثیت سے حاصل ہوا. منجملہ اور اسباب کے اس عہد میں پارلیمنٹ کی کمزوری کا یہ بھی ایک سبب تھا.

طاقتور بادشاہت کی ضرورت

ٹیوڈر عہد جن خصوصیات کا حامل ہے ان کے سمجھنے کے لئے یورپ کے سیاسی پس منظر کا

مطالعہ ضروری ہے۔ اس زمانہ میں طاقتور قومی سلطنتیں وجود میں آرہی تھیں۔ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں کی شیرازہ بندی "قومیت" کی اساس پر ہو رہی تھی۔ اسپین، فرانس، انگلستان، آسٹریا اور دیگر ممالک میں قومیت کا ایک نیا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ اس لئے پندرھویں صدی کو "قومی سلطنتوں" (NATION STATES) کے وجود میں آنے کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ مغربی یورپ میں اسپین ایک طاقتور ملوکیت کی حیثیت سے اُبھر رہا تھا۔ متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو ایک عرصہ سے یہاں ایک دوسرے سے دست وگریباں تھیں، ان کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ اب صرف دو بڑی ریاستیں تھیں (۱) اراگان (۲) کاسٹیل۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا علی الترتیب ان دونوں ریاستوں کے حکمران تھے۔ ان دونوں کی شادی نے عملاً پورے اسپین کو ان دونوں کی مشترکہ بادشاہت میں متحد کر دیا اور ان ہی کی متحدہ کوششوں سے غرناطہ کو فتح کر لیا گیا جو اسپین میں عربوں کی قدیم عظمت کا واحد یادگار تھا۔ سنہ ۱۴۹۲ء میں عربوں (MOORS.) کا سرزمین اسپین سے رہا سہا اقتدار ختم ہو گیا۔ غرض اسپین میں ایک طاقتور شاہی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا جس نے اگلی صدی کی سیاسیات میں ایک نمایاں رول انجام دیا۔

فرانس میں بھی ایک طاقتور ملوکیت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ نظام جاگیری کے انتشار پسند عناصر کی سرکوبی کی جا چکی تھی۔ ادارہ شاہی کو مضبوط اور مستحکم کر دیا گیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی افراتفری کا خاتمہ ہو چکا تھا مرکز میں تمام اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں مرکوز تھا اور اب ملک میں کوئی فرد، جماعت یا ادارہ ایسا نہیں تھا جو سابق کی طرح بادشاہ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ آسٹریا میں بھی مرکزی اقتدار کی توسیع اور استحکام کا یہی رجحان شاہی مطلق العنانی کا موید اور معاون ہو رہا تھا۔ غرض یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ایک نئے دَور میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کے عزائم اور حوصلے اب اتنے بلند تھے کہ وہ وسیع پیمانے پر ملک گیری کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ کوئی ملک اپنی موجودہ سرحدوں پر قانع نہیں تھا۔ ملک کے باہر کمزور علاقوں پر وہ اپنا قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ ان طاقتور ممالک کے ان عزائم سے چھوٹی مملکتوں کو جو اُن کے ہمسایہ تھیں ایک خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ اسپین اور فرانس خصوصاً اس زمانے میں ایک دوسرے کے مدمقابل اور رقیب تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی مقبوضات کی توسیع کے لئے کوشاں تھا۔ یہ دونوں اپنے لئے نئے امپائر (EMPIRE.) کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سولہویں صدی کی تاریخ اسپین اور فرانس کی ایک مسلسل کشمکش کی تاریخ ہے جس میں عموماً اسپین کا پلّہ بھاری رہا۔ بڑی طاقتوں کی یہ سیاسی رقابتیں یورپ کو جنگ وجدال کی آماجگاہ بنا رہی تھیں خصوصاً فرانس اور اسپین اس زمانے میں مسلسل برسرپیکار رہے۔ انگلستان ہرچند اپنی جغرافی حیثیت کی وجہ سے ان رقابتوں اور ان محاربات سے بڑی حد

تک دُور تھا لیکن پھر بھی ان کے اثرات سے کُلّی طور پر محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ اسپین اور فرانس دونوں اپنے اپنے مفاد کے لئے انگلستان کو اس کشمکش میں گھسیٹنا چاہتے تھے۔ انگلستان ایک چھوٹا سا ملک تھا۔ فرانس اور اسپین کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اندیشہ یہ تھا کہ اگر انگلستان ان بڑی طاقتوں کی کشمکش میں اُلجھ جائے تو اس کو کہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ ملک گیری اور توسیع پسندی کا ولولہ یورپ کی صرف بڑی طاقتوں کو ہی بے چین کئے ہوئے نہیں تھا، انگلستان جیسے چھوٹے ممالک بھی اس دوڑ میں قسمت آزمائی کرنے تیار تھے۔ ایسے حالات میں اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ انگلستان کا اقتدار مضبوط اور فرلیں ہاتھوں میں ہو۔ یہ بھی ڈر لگا ہوا تھا کہ انگلستان جیسا چھوٹا اور کمزور ملک کہیں اپنے طاقتور ہمسایوں کی حرص و آز کا شکار نہ ہو جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسپین اور فرانس دونوں انگلستان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے اور ہو سکے تو اس کو اپنا حاشیہ بردار بنا لینا چاہتے تھے۔ انگلستان کی قومی آزادی کے لئے یہ ایک بہت خطرناک زمانہ تھا۔ ایسے نازک مرحلہ پر اس بات کی ضرورت تھی کہ ملک میں ادارۂ شاہی مقتدر اور طاقتور ہو، تاکہ بیرونی خطرات سے قوم کو محفوظ رکھا جا سکے یہی وجہ ہے کہ قوم نے اس عہد میں ایک با اختیار شاہی کے قیام کی بھرپور لیکن خاموش تائید کی۔ انگلستان کو صرف یہی خطرہ نہیں تھا کہ ہمسایہ مملکتوں کی کشمکش میں گھر کر کہیں وہ اپنی آزادی نہ کھو بیٹھے بلکہ یہ خوف بھی تھا کہ مذہبی مناقشے اس کی قومی یکجہتی کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس عہد کی سیاسیات میں یہ ایک نئی پیچیدگی تھی۔ اس زمانے میں پورا یورپ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ طاقتوں کی نبرد آزمائی کا دنگل بنا ہوا تھا۔ سیاسی اغراض کے لئے پہلے سے جو کشمکش جاری تھی اس کو اصلاحِ مذہب کی تحریک نے اور زیادہ خونین کر دیا تھا۔ پروٹسٹنٹ کلیسا کا قیام قدیم کیتھولک مذہب کے لئے ایک عظیم چیلنج تھا۔ اس سے یورپ کی تمام قومیں کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوئیں مذہبی رقابتیں، بین قومی سیاسی تعلقات میں منافرت، عدم رواداری اور انتہا پسندی کے جذبات کو ہوا دے رہی تھیں۔ انگلستان اس مذہبی جنون سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اور یہ اندیشہ بھی تھا کہ مذہب کے نام پر ملک میں کہیں خانہ جنگی کا کوئی دوسرا دَور نہ شروع ہو جائے جس سے ابھی ابھی تیس سال کے بعد نجات حاصل کی گئی تھی۔ ان اندرونی و بیرونی خطرات کا مقابلہ صرف ایک طاقتور شاہی کے ذریعہ سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ ایسے میں کوئی تعجب نہیں کہ قوم نے ٹیوڈروں کو ایک طاقتور شاہی کے قیام کی اجازت دے دی اور اس بحث کو بالائے طاق رکھ دیا کہ بادشاہ کو کن حدود میں رہ کر کام کرنا چاہئے؟ اور پارلیمنٹ سے اس کے تعلقات کس نوعیت کے ہوں؟

ٹیوڈر مطلق العنانی

ٹیوڈر عہد کو عام طور پر "مطلق العنان بادشاہت" کا عہد کہا جاتا ہے۔ بڑی حد تک یہ الزام صحیح بھی ہے۔ ٹیوڈر بادشاہ لنکاسٹریوں کی طرح پارلیمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں تھے، بلکہ یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ پارلیمنٹ بادشاہ کے اشاروں پر ناچتی تھی۔ قوم اس صورتِ حال سے نہ تو ناخوش تھی اور نہ ناراض۔ قوم خود اُوپر کے بیان کردہ اسباب کی بنا پر یہ چاہتی تھی کہ بادشاہ کو پارلیمنٹ پر تفوق اور برتری حاصل رہے تاکہ وہ کسی بھی مفاجاتی صورت حال کا مقابلہ کر سکے۔ قومی زندگی کے تحفظ کا تقاضا تھا کہ عارضی طور پر دستور کے تقاضوں کو نظر انداز کیا جائے۔ اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ٹیوڈروں کی مطلق العنانی قومی اُمنگوں کے خلاف نہیں بلکہ عین قومی امنگوں کے تقاضوں کی تکمیل تھی۔ خود اہلِ ملک نے اپنی کامل تائید سے اس "مطلق العنانی" کو ممکن بنایا تھا۔

ٹیوڈروں کی "مطلق العنانی" کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس عہد میں دستوری ارتقا ختم ہو چکا تھا اور دستور کو کلی طور پر معطل کر کے ایک جابرانہ حکومت قائم کر دی گئی تھی۔ ایسا تصور سراسر غلطی پر مبنی ہوگا۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس عہد میں دستور کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا تھا۔ اور اس کو یکسر نظر انداز کر کے ایک رجعت پسندانہ حکومت قائم کی گئی تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں بھی دستور ترقی پذیر حالت میں تھا۔ اگرچہ بعض اسکالرس اور مصنفین اس بات کے قائل نہیں ہیں۔ اور ٹیوڈر عہد کو وہ ہر قسم کی دستوری ترقی سے عاری سمجھتے ہیں۔ مگر یہ ایک سطحی خیال ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ٹیوڈروں نے ہمیشہ پارلیمنٹ سے کام لیا۔ پارلیمنٹ کو مٹانے کے وہ کبھی درپے نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی وہ ایسی جرأت کر سکتے تھے۔ دستور کا چوکھٹا اپنی جگہ برابر قائم رہا۔ حکومت کا انداز بظاہر خود سرانہ نظر آتا ہے لیکن اس کے قیام کے لئے کوئی نئے ادارے وجود میں نہیں لائے گئے۔ قدیم دستور کو اس طرح کام میں لایا گیا کہ شاہی مرضی اور منشا کی تکمیل ہوتی رہے۔ دستور کو رسمی طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ اس کی اصلی روح بے شک غائب تھی مگر یہ بات کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ رسماً ہی سہی مگر دستوری طریقۂ کار سے کبھی گریز نہ کیا جا سکا۔ ٹیوڈر بادشاہ یہ جانتے تھے کہ دستور سے انحراف کرنے کی بجائے دستور کو رسمی طور پر استعمال کرنے سے وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ پارلیمنٹ سے انھوں نے اسی طرح کام لیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے زمانے میں پارلیمنٹ کم بلائی جاتی تھی۔ خصوصاً ابتدائی زمانے میں تو اس کی طلبی کافی طویل وقفوں کے بعد عمل میں آتی تھی۔

اور جب بھی طلب کی جاتی تھی تو وہ محض بادشاہ کا آلۂ کار ہوتی تھی۔ بادشاہ جس طرح چاہتے اس سے کام لیتے اور وہ بلا چوں وچرا بادشاہ کے احکام کی فرماں برداری میں مشغول رہتی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ میں حسنِ اتفاق سے پارلیمنٹ بھی وہی چاہتی تھی جو بادشاہ چاہتا تھا۔ دونوں کے نقاطِ نظر میں تضاد نہیں تھا۔ ٹیوڈروں کی نام نہاد "خود سری" کو سمجھنے کے لئے یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ ٹیوڈر حکمران قوم کے اچھے نباض تھے۔ انھوں نے اپنی طاقت کا استعمال ضرور کیا مگر قوم کے مزاج اور اس کی ضرورت کو برابر سمجھتے رہے۔ کبھی کبھی انھوں نے شاید ایسے کام بھی کئے جو قوم کے لئے ناپسندیدہ تھے مگر اس روش کو عام وطیرہ نہیں بنایا۔ اور جب کبھی ایسی صورتیں اختیار کی گئیں پارلیمنٹ کو مختلف طریقوں سے اپنا ہمنوا کر لیا تاکہ وہ اپنی خود سری اور مطلق العنانی پر دستوریت کا پردہ ڈال سکیں۔ جب کبھی انھیں کوئی اہم اور مشکل مسائل درپیش ہوتے یا کسی خاص معاملے میں وہ اپنی مرضی چلانا چاہتے تو اس کام کی انجام دہی کا اہتمام پارلیمنٹ کے ذریعہ سے کرتے اور اپنا مقصد حاصل کر لیتے تھے اگر اس کے برخلاف پارلیمنٹ کبھی کسی معاملہ پر مُصر ہو جاتی تو ٹیوڈر اس کی مخالفت نہ کرتے بلکہ اس کی ضد کے آگے اپنا سر جھکا دیتے اور اس بات کو اپنے وقار کے خلاف نہ سمجھتے۔ غرض یہاں یہ نکتہ سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس تمام دَور میں مختلف اور متعدد صورتیں پیدا ہوتی رہیں، مگر کوئی صورت اس صورت سے خالی نہ تھی کہ پارلیمنٹ سے برابر کام لیا جاتا رہا۔ ہر اقدام اور ہر فیصلہ پر اس کی مہر کا ثبت ہونا از بس ضروری تھا۔ ٹیوڈر بادشاہ ہمیشہ اور بار بار پارلیمنٹ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا یہ عمل محض تکمیلِ ضابطہ کے طور پر تھا۔ مگر رسمی طور پر ہی سہی ان کا پارلیمنٹ کی طرف بار بار رجوع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ دستور کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ قوم نے نہ کوئی چیز بھلائی تھی اور نہ دستور کے اہم خدوخال مٹ چکے تھے۔ وقت آنے پر دستور اپنی تمام تحدیدات کے ساتھ دوبارہ حقیقی معنی میں متحرک کیا جاسکتا تھا۔ اب صرف اس کے "جسم" سے کام لیا جا رہا تھا۔ حالات کے بدلتے ہی اس کی روح پھر سے جاگ اٹھ سکتی تھی۔

ٹیوڈر دَور میں دستور کی ترقی

یہ بات کہ سولہویں صدی میں دستور بالکل مردہ اور بے جان نہیں تھا اس عہد کی کلیسائی تبدیلیوں سے اچھی طرح ثابت ہوتی ہے۔ انگلستان میں اصلاحِ مذہب کے ابتدائی اقدامات مذہبی اغراض کے لئے نہیں بلکہ بادشاہ کی ایک مخصوص غرض کی تکمیل کے لئے کئے گئے۔ لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے تمام تر پارلیمنٹ کی مشینری کو حرکت میں لانا پڑا۔ اور اس اقدام کے دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔

کلیسا ازمنۂ وسطیٰ میں ایک آزاد ادارہ تھا۔ اور پارلیمنٹ کے حیطۂ اقتدار سے عملاً باہر تھا۔ اس کے اپنے علٰحدہ قوانین تھے۔ اور علٰحدہ نظم ونسق۔ قومی حکومت کو ان امور پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ کلیسا نہ صرف مذہبی امور کی انجام دہی کا انتظام کرتا تھا بلکہ قومی زندگی کے بعض سماجی اور معاشی امور کی نگرانی بھی اسی کے تفویض تھی۔ مناکحت وطلاق توریث و وصیت سے متعلق قانون کا جس حد تک بھی وسیع دائرہ تھا وہ سب کا سب کلیۃً کلیسا کے زیرنگیں تھا۔ اس کے علاوہ غربا کی دیکھ بھال کا قانونی انتظام بھی اسی کے سپرد تھا۔ ان وسیع اختیارات کی وجہ سے کلیسا ازمنۂ وسطیٰ میں ایک طاقتور ادارہ تھا اور قومی زندگی کے متذکرہ بالا شعبے براہ راست اس کے زیر انتظام تھے حالانکہ ان شعبوں کا تعلق مذہبی معاملات سے نہ تھا اور خود کلیسا نہ صرف قومی حکومت کے اثر و اقتدار سے باہر تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک بین قومی ادارہ کی تھی۔ وہ صرف پاپائیت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا تھا۔ اور اس سے براہ راست منسلک تھا۔ پاپاؤں کا پایہ تخت روم کلیسا کا صدر مقام تھا جہاں سے احکام' فرامین اور فیصلے اجراء ہوتے رہتے تھے اور دوسری طرف یہاں سے کلیسائی محاصل' مقدمے اور مرافعے روم روانہ کئے جاتے تھے۔ کلیسائی نظم ونسق کے اس انتظام نے کلیسا کو قومی حکومت سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ اور وہ بیرونی اقتدار کا محکوم اور مطیع تھا۔ عوام کی نگاہوں میں اس اقتدار کو بڑی وقعت حاصل تھی۔ کیونکہ پاپائی اقتدار کی بنیاد عام قانون پر نہیں بلکہ قانونِ الٰہیہ پر تھی۔ تعجب نہیں کہ ان حالات میں کلیسا اور پاپائیت دونوں مسجودِ خلائق تھے۔

ٹیوڈر حکمرانوں کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے کلیسا کے ان بندھنوں کو توڑا۔ اور بیرونی اقتدار کی محکومیت سے اسے آزاد کیا۔ یہاں یہ بحث بے محل ہے کہ اس اقدام کی غرض وغایت کیا تھی؟ یہ سچ ہے کہ بادشاہ کی شخصی ضرورت اور خواہش اس انقلاب کی فوری محرک تھی۔ لیکن اس کے نتیجہ میں کلیسا پر قومی حکومت کی مکمل بالادستی قائم ہوگئی جو پہلے کبھی حاصل نہ ہوسکی تھی۔ کلیسا اب کلیۃً حکومت کے زیرنگیں ہوگیا۔ اس پر پارلیمنٹ کو ایسا ہی اقتدار حاصل ہوگیا جیسا کہ قومی زندگی کے دوسرے شعبوں پر اسے حاصل تھا۔ یہ ایک عظیم انقلاب تھا جس کا ازمنۂ وسطیٰ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فوری طور پر مذہب میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔ اس کام کو بعد کے زمانے میں انجام پانا تھا۔ اس وقت پاپائیت سے انقطاع کے سوا کوئی اور قدم نہیں اٹھایا گیا۔ صرف کلیسا پر پوپ کی حکومت کی زنجیریں توڑ دی گئیں یہ سب کام پارلیمنٹ کے تعاون سے عمل میں لایا گیا۔ یہ بات بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تصور کہ اس عظیم انقلاب کی صورت پذیری صرف پارلیمنٹ کر سکتی ہے، پارلیمنٹ کے موقف کو اچھی طرح ظاہر

کرتا ہے۔ بادشاہ نے اس کام کی انجام دہی کے لئے پارلیمنٹ کو طلب کیا۔ جس کے اجلاس 1529ء سے 1536ء تک جاری رہے۔ اس عرصہ میں یکے بعد دیگرے مختلف قوانین پاس کئے گئے تاکہ ان متعدد رشتوں کو منقطع کیا جائے جن سے انگلستان کا کلیسا 'پاپائیت سے وابستہ تھا۔ ان انتظامات کے نتیجہ میں کلیسا کی حکومت اب پوپ کی بجائے بادشاہ کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ پارلیمنٹ کو ایسا ہمہ گیر اقتدار کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ ملک میں جس نوع کی چاہے تبدیلی لا سکتی ہے۔ پارلیمنٹ کے اختیارات کے استعمال کی یہ بہت واضح نظیر ہے جو اس عہد کے دستوری ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہے۔ اور یہ اختیارات پارلیمنٹ نے اپنے مستحکم کرنے کہ ان کی بنیاد پر آئندہ کلیسا میں عظیم تر مذہبی اور انتظامی تبدیلیاں لائی جا سکیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں سولھویں صدی کو دستوری ترقی سے یکسر عاری دور تصور کرنا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہنری ہشتم اپنی بیوی کیتھرین سے طلاق حاصل کرنے کے لئے کلیسا کو پاپائیت سے آزاد کرکے قومی حکومت کے تحت لانا چاہتا تھا لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اس کو ہر ہر قدم پر پارلیمنٹ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ٹیوڈر اپنی مطلق العنانی کے باوجود پارلیمنٹ کو سرچشمۂ اقتدار ماننے پر مجبور تھے۔ اگرچہ اس وقت پارلیمنٹ سولھویں صدی کے مخصوص حالات کے تحت ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھی۔ مگر ان عظیم قانونی اور دستوری تبدیلیوں کے لئے اس کا استعمال کیا جانا پارلیمنٹ کے دستوری موقف کو نظری طور پر اور زیادہ مستحکم کرنے کا باعث ہوا۔ زمانۂ مستقبل میں اس مستحکم اقتدار کے ذریعہ سے وہ بادشاہوں کی مطلق العنانی کے رجحان پر کاری ضرب لگا سکی اور "محدود شاہی" کے نصب العین کی طرف آگے بڑھ سکی۔

طاقتور بادشاہت کا قیام

تخت نشینی کے وقت ہنری ہفتم کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ملک میں امن و امان کے قیام کا تھا۔ ملک میں گزشتہ تیس سال سے لاقانونیت کا راج تھا۔ اس لاقانونیت اور تاراج کو دور کرنے کے لئے ہنری کو سخت اقدامات کرنے ضروری تھے۔ پچھلے تیس برس کی خانہ جنگی بعض اُمراء اور جاگیرداروں کی پیدا کردہ تھی۔ اس دور میں امراء بے حد طاقتور ہو گئے تھے۔ ان کی خود غرضیاں اور دراز دستیاں ہی ملک کے امن و امان میں رخنے پیدا کر رہی تھیں۔ ان پر بادشاہ کا عملاً کوئی کنٹرول باقی نہ رہا تھا۔ کیونکہ لنکاسٹری دور میں پارلیمنٹ کی غیر معمولی ترقی نے بادشاہ کو نظام حکومت میں ایک بے اثر

عنصر بنا دیا تھا۔ شاہی اقتدار کا مسلوب و مفلوج ہو جانا دراصل لنکاسٹری عہد کی خانہ جنگی کا سبب تھا۔ اگر بادشاہ اتنا کمزور نہ ہوتا تو امرا کی قرار واقعی سرکوبی کر سکتا۔ لیکن دستوری ترقی کا نہج ایسا رہا تھا کہ عاملہ (EXECUTIVE) کی اہمیت اور طاقت انتظام مملکت میں بہت گھٹ چکی تھی۔ لنکاسٹری عہد میں دستوری ارتقا کا یہ ایک کمزور پہلو ہے۔ یہ ارتقا اس قدر سرعت سے ہوا اور اتنا قبل از وقت ثابت ہوا کہ قوم اس سے فائدہ نہ اٹھا سکی بلکہ قوم کو اس کی بھاری قیمت خانہ جنگی کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ پارلیمانی اقتدار کی ترقی کچھ ان حالات میں ہوئی تھی کہ حقیقی معنوں میں انگلستان میں "قوم" وجود پذیر نہیں ہوئی تھی اور قومیت کا تصور بھی نامکمل اور کمزور تھا۔

یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور پارلیمنٹ ان عناصر کو قابو میں نہ رکھ سکی جو مملکت میں بدامنی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لنکاسٹری عہد کی دستوری ترقی نہ صرف قبل از وقت (PREMATURE) تھی بلکہ شاہی ادارہ کو کمزور کر کے اس نے ملک میں بدامنی کے دروازے کھول دیئے۔ اس بدامنی کی ایک خصوصیت یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے عوام کو دلچسپی تھی اور نہ انھوں نے اس میں کوئی حصہ لیا۔ یہ تمام خانہ جنگی امرا اور جاگیرداروں کا ایک خون آشام مشغلہ تھا جنھوں نے اپنی خانگی فوجوں کے بل بوتے پر تیس سال تک ملک میں خون کی ہولی کھیل۔

ہنری ہفتم اس صورت حال کا اعادہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ یہ خوب جانتا تھا کہ باسورتھ کی فتح اور پارلیمنٹ کی توثیق کے باوجود اس کا تاج و تخت خطرہ میں ہے۔ اس کے تحفظ کے لئے پہلی شرط ملک میں قانون کی حکمرانی کا قیام تھا اور شر انگیز امرا کا خاتمہ تھا۔ اسی لئے روز اول سے اس نے ادارۂ شاہی کو طاقتور بنانے کا کام شروع کر دیا تاکہ رہے سہے امرا کی سرکوبی کر کے ملک کو اس ناسور سے نجات دلا سکے۔ لنکاسٹری تجربہ ناکام ثابت ہو چکا تھا، اس لئے ہوا کا رخ اب دوسری طرف تھا۔ یہ قدرتی امر تھا کہ پارلیمانی ترقی کے تجربہ کی ناکامی کے بعد اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہو۔ اس ردِ عمل نے نئے انتظامات میں پارلیمنٹ کو پس پشت ڈال دیا اور ادارہ شاہی نے قوم کے تمام عناصر کی تائید کے ساتھ طاقت کے تمام ذرائع اپنے ہاتھ میں سمیٹ لئے۔ واقعہ یہ ہے کہ کمزور بادشاہت سے طاقتور شاہی کی طرف نقطۂ گریز ٹیوڈروں سے پہلے یارک حکمران ایڈورڈ چہارم کے عہد سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ایڈورڈ چہارم اگر بے وقت نہ مر جاتا تو بہت ممکن ہے کہ شاہی مطلق العنانی کے قیام کا کام اسی کے عہد میں مکمل ہو جاتا۔ مگر قدرت کو ایسا منظور نہ تھا۔ یہ نوجوان اور باعزم بادشاہ بہت جلد لقمۂ اجل ہو گیا۔ اس لئے مطلق العنان شاہی کی طرف مزید اقدامات ٹیوڈر عہد سے ہی شروع ہو سکے گو کہ اس راستے کی نشاندہی ایڈورڈ چہارم نے کر دی تھی۔

عدالتِ اسٹار چیمبر (COURT OF STAR CHAMBER)

حکومت کو قیامِ امن کے لئے سب سے پہلے ان عناصر سے نمٹنا تھا جو کم و بیش ایک صدی سے قانون شکنی کے عادی تھے۔ ان کی بڑی بڑی جماعتیں اور مسلح جتھے تھے۔ مختلف امراء اور جاگیر دار ان کے سرپرست تھے۔ ہر امیر اپنی خانگی فوج رکھتا تھا۔ فوجی وردیوں میں ملبوس اپنے اپنے سرپرست امیر کا نشان (BADGE) لگائے یہ جتھے ملک میں اودھم مچاتے پھرتے تھے۔ ایک امیر کا جتھا دوسرے امیر کے جتھے سے لڑ پڑتا اور خوب خوں ریزی ہوتی۔ یہ آئے دن کا مشغلہ تھا۔ ملک میں ان کی وجہ سے لوٹ و غارت اور قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ حکومت اتنی کمزور تھی کہ ان پر ہاتھ ڈال نہ سکتی تھی۔ قانون شکنی اور نقضِ امن پر یہ ایسے دلیر ہو چکے تھے کہ ان کی سرکوبی کے لئے سخت اقدامات کی ضرورت تھی۔ عدالتیں ان کے مقابلہ میں عاجز تھیں۔ کوئی عدالت ہو نتائج کے خوف سے امراء کے ان متوسلین کو سزا نہیں دے سکتی تھی۔ عام قانون اور عام نظامِ عدلیہ ان کے مقابلہ میں عملاً مفلوج اور معطل تھا۔ حکامِ عدالت کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کے خلاف کوئی قانون نافذ کر سکیں۔ کیونکہ وہ تخویف اور دہشت کے شکار تھے۔ ہنری ہفتم نے اسی لئے ایک نئی عدالت قائم کی تاکہ ان طاقتور خاطیوں کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس غرض کے لئے پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جو "قانون وردی متوسلین" ACT OF LIVERY & MAINTENANCE کے نام سے موسوم ہے۔ ہنری نے یہ اقدام اپنی تخت نشینی کے دو سال کے اندر ہی کیا۔ (سنہ 1487ء)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کی نظر میں اس مسئلہ کی اہمیت کتنی زیادہ تھی۔ اس قانون کے ذریعہ سے خانگی فوجوں اور مسلح جتھوں کا رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ اب کوئی امیر اپنی مخصوص وردی و نشان کو استعمال کر کے کوئی خانگی فوج نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے سخت سزائیں رکھی گئیں۔ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں ایک نئی عدالت "کورٹ آف اسٹار چیمبر" کو ان مقدمات کی سماعت کا مجاز گردانا گیا۔ قانون شکنی اور نقضِ امن کے مقدمات اب عام عدالتوں کی بجائے اس عدالت میں پیش کئے جاتے تاکہ وہ بلا خوف و ہراس طاقتور سے طاقتور ملزم کو سزا دے سکے۔

اسٹار چیمبر کوئی معمولی عدالت نہیں تھی۔ اس عدالت کے اراکین بادشاہ کے خاص مقربین ہوا کرتے تھے۔ یہ پریوی کونسل کے بھی رکن ہوتے تھے۔ اصل میں عدالت اسٹار چیمبر پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تھی جس کو حالیہ قانون کے ذریعہ سے انسدادِ جرائم کے لئے فوجداری مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا گیا تھا تاکہ ملک میں جو ہنگامی حالات تھے ان پر قابو پایا جا سکے۔ ان اختیارات کی سپردگی کوئی نئی بات

مختصر بنا دیا تھا۔ شاہی اقتدار کا مسلوب و مفلوج ہو جانا دراصل لنکاسٹری عہد کی خانہ جنگی کا سبب تھا۔ اگر بادشاہ اتنا کمزور نہ ہوتا تو امراء کی قرار واقعی سرکوبی کر سکتا۔ لیکن دستوری ترقی کا نہج ایسا رہا تھا کہ عاملہ (EXECUTIVE) کی اہمیت اور طاقت انتظام مملکت میں بہت گھٹ چکی تھی۔ لنکاسٹری عہد کے دستوری ارتقاء کا یہ ایک کمزور پہلو ہے۔ یہ ارتقاء اس قدر سرعت سے ہوا اور اتنا قبل از وقت ثابت ہوا کہ قوم اس سے فائدہ نہ اٹھا سکی بلکہ قوم کو اس کی بھاری قیمت خانہ جنگی کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ پارلیمانی اقتدار کی ترقی کچھ ان حالات میں ہوئی تھی کہ حقیقی معنوں میں انگلستان میں "قوم" وجود پذیر نہیں ہوئی تھی اور قومیت کا تصور بھی نامکمل اور کمزور تھا۔

یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور پارلیمنٹ ان عناصر کو قابو میں نہ رکھ سکی جو ملک میں بدامنی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لنکاسٹری عہد کی دستوری ترقی نہ صرف قبل از وقت (PREMATURE) تھی بلکہ شاہی ادارہ کو کمزور کر کے اس نے ملک میں بدامنی کے دروازے کھول دیئے۔ اس بدامنی کی ایک خصوصیت یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے عوام کو دلچسپی تھی اور نہ انھوں نے اس میں کوئی حصہ لیا۔ یہ تمام خانہ جنگی امراء اور جاگیرداروں کا ایک خون آشام مشغلہ تھا جنھوں نے اپنی خانگی فوجوں کے بل بوتے پر تیس سال تک ملک میں خون کی ہولی کھیلی۔

ہنری ہفتم اس صورت حال کا اعادہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ یہ خوب جانتا تھا کہ باسورتھ کی فتح اور پارلیمنٹ کی توثیق کے باوجود اس کا تاج و تخت خطرہ میں ہے۔ اس کے تحفظ کے لئے پہلی شرط ملک میں قانون کی حکمرانی کا قیام تھا اور خراج کا خاتمہ۔ اسی لئے روز اول سے اس نے ادارۂ شاہی کو طاقتور بنانے کا کام شروع کر دیا تاکہ رہے سہے امراء کی سرکوبی کر کے ملک کو اس ناسور سے نجات دلا سکے۔ لنکاسٹری تجربہ ناکام ثابت ہو چکا تھا، اس لئے ہوا کا رخ اب دوسری طرف تھا۔ یہ قدرتی امر تھا کہ پارلیمانی ترقی کے تجربہ کی ناکامی کے بعد اس کے خلاف ردعمل پیدا ہو۔ اس ردعمل نے نئے انتظامات میں پارلیمنٹ کو پس پشت ڈال دیا اور ادارہ شاہی نے قوم کے تمام عناصر کی تائید کے ساتھ طاقت کے تمام ذرائع اپنے ہاتھ میں سمیٹ لئے۔ واقعہ یہ ہے کہ کمزور بادشاہت سے طاقتور شاہی کی طرف نقطہ گریز، ٹیوڈروں سے پہلے یارک حکمران ایڈورڈ چہارم کے عہد سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ایڈورڈ چہارم اگر بے وقت نہ مر جاتا تو بہت ممکن ہے کہ شاہی مطلق العنانی کے قیام کا کام اسی کے عہد میں مکمل ہو جاتا۔ مگر قدرت کو ایسا منظور نہ تھا۔ یہ نوجوان اور باعزم بادشاہ بہت جلد لقمۂ اجل ہو گیا۔ اس لئے مطلق العنان شاہی کی طرف مزید اقدامات ٹیوڈر عہد سے ہی شروع ہو سکے گو کہ اس راستے کی نشاندہی ایڈورڈ چہارم نے کر دی تھی۔

عدالت اسٹار چیمبر (COURT OF STAR CHAMBER)

حکومت کو قیامِ امن کے لئے سب سے پہلے ان عناصر سے نمٹنا تھا جو کم و بیش ایک صدی سے قانون شکنی کے عادی تھے۔ ان کی بڑی بڑی جماعتیں اور مسلح جتھے تھے۔ مختلف امراء اور جاگیر دار ان کے سرپرست تھے۔ ہر امیر اپنی خانگی فوج رکھتا تھا۔ فوجی وردیوں میں ملبوس اپنے اپنے سرپرست امیر کا نشان (BADGE) لگائے یہ جتھے ملک میں اودھم مچاتے پھرتے تھے۔ ایک امیر کا جتھا دوسرے امیر کے جتھے سے لڑ پڑتا اور خوب خوں ریزی ہوتی۔ یہ آئے دن کا مشغلہ تھا۔ ملک میں ان کی وجہ سے لوٹ غارت اور قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ حکومت اتنی کمزور تھی کہ ان پر ہاتھ ڈال نہ سکتی تھی۔ قانون شکنی اور نقضِ امن پر یہ ایسے دلیر ہو چکے تھے کہ ان کی سرکوبی کے لئے سخت اقدامات کی ضرورت تھی۔ عدالتیں ان کے مقابلہ میں عاجز تھیں۔ کوئی عدالت ہو نتائج کے خوف سے امراء کے ان متوسلین کو سزا نہیں دے سکتی تھی۔ عام قانون اور عام نظام عدلیہ ان کے مقابلہ میں عملاً مفلوج اور معطل تھا۔ حکام عدالت کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کے خلاف کوئی قانون نافذ کر سکیں۔ کیونکہ وہ تخویف اور دہشت کے شکار تھے۔ ہنری ہفتم نے اسی لئے ایک نئی عدالت قائم کی تاکہ ان طاقتور خاطیوں کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس غرض کے لئے پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جو "قانون وردی متوسلین" (ACT OF LIVERY & MAINTENANCE) کے نام سے موسوم ہے۔ ہنری نے یہ اقدام اپنی تخت نشینی کے دو سال کے اندر ہی کیا۔ (سنہ 1487ء)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کی نظر میں اس مسئلہ کی اہمیت کتنی زیادہ تھی۔ اس قانون کے ذریعہ سے خانگی فوجوں اور مسلح جتھوں کا رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ اب کوئی امیر اپنی مخصوص وردی و نشان کو استعمال میں لا کر کے کوئی خانگی فوج نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے سخت سزائیں رکھی گئیں۔ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں ایک نئی عدالت "کورٹ آف اسٹار چیمبر" کو ان مقدمات کی سماعت کا مجاز گردانا گیا۔ قانون شکنی اور نقضِ امن کے مقدمات اب عام عدالتوں کی بجائے اس عدالت میں پیش کئے جاتے تاکہ وہ بلا خوف و ہراس طاقتور ملزم کو سزا دے سکے۔

اسٹار چیمبر کوئی معمولی عدالت نہیں تھی۔ اس عدالت کے اراکین بادشاہ کے خاص مقربین ہوا کرتے تھے۔ یہ پریوی کونسل کے بھی رکن ہوتے تھے۔ اصل میں "عدالت اسٹار چیمبر" پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تھی جس کو حالیہ قانون کے ذریعہ سے انسدادِ جرائم کے لئے فوجداری مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا گیا تھا تاکہ ملک میں جو ہنگامی حالات تھے ان پر قابو پایا جا سکے۔ ان اختیارات کی سپردگی کوئی نئی بات

نہ تھی اور نہ اس سے پریوی کونسل کے اختیارات میں کوئی نیا اضافہ ہوا۔ ہمیشہ سے پریوی کونسل کو عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے۔ انہی عدالتی اختیارات کو اب فوجداری مقدمات کے فیصل کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اسٹار چیمبر کے قیام سے پریوی کونسل کی ممبر شپ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اراکین کونسل میں سے چند حکامِ عدالت کی حیثیت سے نشست کرتے۔ البتہ اس میں ملک کے دونوں چیف جسٹس کی شمولیت عمل میں آئی۔

یہ عدالت بدامنی کے دُور کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے تیوڈر عہد میں عوام اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس عدالت کو ایک انتظامی عدالت سمجھنا چاہیئے جو بادشاہ کے مخصوص عدالتی اختیارات (PRETOGATINE JUSTICE) کو استعمال کرتی تھی۔ اس لحاظ سے اسٹار چیمبر کا طریقۂ کار عام عدالتوں (COMMON LAW COURTS) میں اسے مل سکتے تھے جن کا مقصد ملزم کو ناانصافی سے بچانا تھا۔ اس میں جیوری استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ ملزم کو اپنے خلاف بیان دینے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ تحقیقات میں ملزم کو اذیتیں دی جا سکتی تھیں۔ اسٹار چیمبر کی یہ خصوصیات اس کو کامن لاء کی عدالتوں سے ممیز کرتی ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے بغیر بدنظمی کی جو وبا اس وقت ملک میں پھیلی ہوئی تھی اس کا انسداد اس سے بھی ممکن نہ ہوتا۔ مرض چونکہ شدید تھا اس لئے علاج میں شدید تر ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس عہد میں اس عدالت نے ایک عظیم قومی ضرورت پوری کی لیکن یہ ظاہر ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں وہ بادشاہ کے ہاتھ میں آسانی سے ظلم وستم کا آلہ بن سکتی تھی۔ بادشاہ اپنے مخالفین کو کچلنے کے لئے اس کو استعمال کر سکتا تھا۔ آئندہ صدی میں اسی وجہ سے وہ ایک متنازعہ فیہ اور ناپسندیدہ ادارہ بن گئی۔

نظامِ حکومت میں پریوی کونسل کا مقام

پریوی کونسل مملکتی نظم ونسق کا اعلیٰ ترین ادارہ تھی۔ اس کی حیثیت مجلس وزراء کی سی تھی۔ وہ بادشاہ کی بندۂ بے دام تھی۔ اس کی مجال نہیں تھی کہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکے۔ اس کی تشکیل اور اس کے اختیارات کا انحصار بادشاہ کی ذات پر تھا۔ لنکاسٹریوں کے عہد میں پریوی کونسل کو بادشاہ کے مقابلہ میں کافی قوت حاصل تھی۔ وہ بادشاہ کو اس کی بے راہ روی سے روک سکتی تھی اور اسے دستوری حدود کی پابندی پر مجبور کر سکتی تھی۔ ٹیوڈر عہد میں حالات بالکل بدل چکے تھے۔ اب صرف بادشاہ کی مرضی چل سکتی تھی۔ اور پریوی کونسل کا صرف یہ کام تھا کہ وہ اس کی مرضی کو مملکت میں بروئے عمل لے آئے۔ نظم ونسق کی مشینری از جزو تا کل اُس

کے حیطۂ اقتدار میں تھی۔ انتظام مملکت کا تمام کام سیاسی اور انتظامی اسی کے سپرد تھا۔ بہ لحاظ اراکین یہ ایک چھوٹی سی مجلس تھی۔ یہ جب انتظام مملکت کا کام انجام دیتی تو پریوی کونسل کہلاتی اور جب عدالت کی حیثیت سے نشست کرتی تو کورٹ آف اسٹار چیمبر کہلاتی۔ دونوں میں دراصل کوئی فرق نہیں تھا۔ صرف نوعیت کار کے لحاظ سے ان میں فرق کیا جاسکتا تھا۔

یہ کونسل ہمیشہ چھوٹی چھوٹی کمیٹیوں میں منقسم ہوکر کام کرتی تھی۔ یہ طریقہ بہت پرانا تھا۔ ٹیوڈروں کے عہد میں بھی یہی طریقۂ کار جاری رہا۔ کورٹ آف اسٹار چیمبر اس کی ایک عدالتی کمیٹی تھی۔ اس کے علاوہ چند اور کمیٹیاں تھیں جو اپنے اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتی تھیں۔ کورٹ آف ریکویسٹ (مجلس عرائض) غریبوں کی درخواستوں پر مناسب کارروائی کے لئے مختص تھا۔ کلیسا کی روم سے علٰحدگی کے بعد کچھ اور کمیٹیاں بنائی گئیں جن کا کام کلیسا کے "محاصل عشر" اور "ثمر اولین" کا انتظام کرنا تھا۔ کونسل آف دی نارتھ اور کونسل آف ویلز اسکاٹ لینڈ اور ویلز کی سرحدوں پر امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ دار تھیں۔ کورٹ آف وارڈز بادشاہ کی جانب سے ان تمام جاگیرات کا انتظام کرتا جس کے والی کمسن تھے۔ یا ان جاگیرات کا جو کسی نہ کسی وجہ سے عارضی طور پر بادشاہ کے زیرِ انتظام آگئی تھیں۔

پریوی کونسل میں، لارڈ چانسلر، لارڈ کیپر آف دی گریٹ سیل، لارڈ ہائی ٹریژرر، لارڈ پریسیڈنٹ آف دی پریوی کونسل، لارڈ پریوی سیل بحیثیتِ اراکین نشست کرتے تھے۔ لارڈ چانسلر کا عہدہ اب اتنا اہم نہ رہا تھا جتنا کہ دورِ وسطیٰ میں تھا۔ اب اس کی حیثیت عدلیہ کے اعلیٰ ترین سربراہ کی تھی۔ سیاسی معاملات سے اس کا تعلق عملاً ختم ہوچکا تھا۔ لارڈ پریوی سیل کا عہدہ نسبتاً نیا تھا۔ ٹیوڈروں کے زمانے میں "پریوی سیل" کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہوگئی تھی جتنی کہ "گریٹ سیل" کو پہلے سے حاصل تھی۔ لارڈ پریسیڈنٹ کا عہدہ الزبتھ کے زمانے میں وجود میں لایا گیا۔ اور پارلیمانی قانون کے ذریعہ سے اس کو اپنے دائرہ میں وسیع اختیارات دیے گئے۔ ان روایتی عہدوں کے علاوہ ایک نیا عہدہ اس عہد میں نمایاں حیثیت حاصل کر رہا تھا وہ سکرٹری کا عہدہ تھا جسے سکرٹری آف اسٹیٹ کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ تیرھویں صدی میں بادشاہ کی پیشی کا جو کلرک (منشی) ہوا کرتا تھا سکرٹری کا عہدہ اسی کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ ٹیوڈر عہد کا سکرٹری، نہایت طاقتور عہدہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس کو بادشاہ کا قرب حاصل رہتا اور مملکت کے تمام اہم امور اندرونی و بیرونی اسی کے توسّط سے انجام پاتے۔ بیرون ملک جتنے شاہی مراسلے جاتے اور اندرون ملک جو بھی فرامین اور احکام نافذ ہوتے سب کا اس کے ہاتھوں سے ہوکر گزرنا ضروری تھا۔ ٹیوڈر اپنے سکرٹری پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ نظم و نسق کے مختلف شعبے اسی کی نگرانی میں ہوتے۔ اس پر کام کا اتنا بار ہوتا تھا کہ ایک آدمی اس بوجھ کو نہ سنبھال سکتا

تھا۔ اس لئے بعض اوقات دو دو "معتمدین" مقرر کئے جاتے تھے۔ عموماً سکرٹری بہت قابل دانا اور مدبر شخص ہوا کرتا تھا۔ ٹامس کرامول اور لارڈ برلے ٹیوڈر عہد کے بہت مشہور معتمدین گزرے ہیں۔ شاہی مفادات کے تحفظ کے خیال سے اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ سکرٹری پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک کا لازمی طور پر رکن رہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ سکرٹری کے عہدہ کے اختیارات اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور ایسی مختلف النوع ذمہ داریاں پیدا ہوتی گئیں کہ آئندہ زمانے میں اس خدمت کو متعدد شعبوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لئے ایک سکرٹری آف اسٹیٹ کا تقرر کیا جانے لگا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل تک کابینہ میں سکرٹریز آف اسٹیٹ کی تعداد پانچ یا چھ تک پہنچ گئی۔

پریوی کونسل اگرچہ مجلسِ وزراء کی سی حیثیت رکھتی تھی لیکن اس کو زمانہ حال کی کیبنٹ سے خلط ملط نہ کرنا چاہئے۔ بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا۔ اس پر کونسل کوئی پابندی عاید نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا کام صرف بادشاہ کو مشورہ دینا تھا جس کا قبول کرنا یا نہ کرنا بالکلیہ بادشاہ کی صوابدید پر مبنی تھا۔ دوسری طرف کونسل پارلیمنٹ کے زیرِ اثر نہیں تھی۔ پارلیمنٹ کا اس پر کوئی زور نہ چلتا تھا۔ وہ صرف بادشاہ کی خادم سمجھی جاتی تھی۔ اس کی رکنیت یا اس کی پالیسیوں کی تشکیل و ترتیب میں پارلیمنٹ کوئی آواز نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ پریوی کونسل کے ارکین دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک کے رکن ضرور ہوتے۔ اس سے بادشاہ کی مرتب کردہ پالیسیوں کی پارلیمنٹ سے توثیق حاصل کرنے میں مدد ملتی تھی۔ پارلیمنٹ میں ارکین کونسل بادشاہ کے آلۂ کار ہوتے تھے اور بادشاہ کی ناپسندیدہ پالیسیوں کو بہ ہزار لطائف الحیل پارلیمنٹ پر مسلط کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیتے تھے۔

کونسل کو دورِ وسطیٰ میں قانون سازی کا بھی اختیار حاصل تھا۔ اس عہد میں اس اختیار سے باربار کام لیا گیا۔ شاہی فرامین (ORDINANCES) کونسل ہی نافذ کرتی تھی۔ تاج کی قوت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ اس اختیار شاہی کو مسدود کرنے کی درپے نہیں ہوتی بلکہ اس عمل کو عموماً پارلیمنٹ کی تائید حاصل رہی۔

تاج اور پارلیمنٹ

دارالامراء کی ہیئتِ ترکیبی

ٹیوڈر حکمران دستوری پابندیوں سے بچنے کے لئے پارلیمنٹ بہت کم بلاتے تھے۔ ہنری ہفتم نے اپنے چوبیس سالہ دورِ حکومت میں صرف سات پارلیمنٹیں طلب کیں۔ الزبتھ نے ۴۵ سال حکومت کی اس عرصہ میں صرف دس پارلیمنٹیں طلب کی گئیں۔ یہ احتیاط اس لئے نہیں تھی کہ ٹیوڈر بادشاہ

پارلیمنٹ سے خوف زدہ تھے بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اصل میں وہ پارلیمنٹ کو ایک ایسا بکھیڑا سمجھتے تھے جس سے دور رہنے ہی میں ان کو عافیت نظر آتی تھی لیکن جب اہم مسائل ان کے درپیش ہوتے تو وہ پارلیمنٹ کو ضرور بُلاتے۔ ایسے مواقع پر نہ صرف پارلیمنٹ طلب کی جاتی بلکہ اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ ایسی پارلیمنٹ منتخب کرائی جائے جو تاج کی ہمنوائی میں اس سے ایک دو قدم آگے ہی ہو۔

اس عہد کی دستوری ہم آہنگی کو سمجھنے کے لئے ان عناصر کا جائزہ لینا ہوگا جن سے پارلیمنٹیں تشکیل و ترتیب پاتی تھیں۔ پارلیمنٹ کا ٹیوڈروں کے ہاتھ میں موم ہونا خالی از علت نہیں تھا۔ ایوانِ بالا اس عہد میں بہت کمزور تھا۔ اس میں نہ اب پہلی سی قیادت تھی اور نہ تاج کے مقابلے میں تابِ مقاومت۔ اصلاحِ مذہب کی پارلیمنٹ (۱529ء) سے پہلے تک کلیسائی امرا ایوان میں اکثریت رکھتے تھے۔ یہ سب کے سب بادشاہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔ کیونکہ اس کا لطف و کرم ہی ان کی آئندہ ترقیوں کا ضامن ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ہنری ہشتم نے روم سے جب انقطاع کا فیصلہ کیا تو ان خانقاہی اور کلیسائی امرا کی اکثریت نے اس کا ساتھ دیا۔ غیر کلیسائی امرا (LAY PEERS) خانہ جنگی کے ہاتھوں تباہ ہوچکے تھے۔ ان کی تعداد بھی گھٹ گئی تھی۔ پہلے کی طرح تاج کو اپنے قابو میں رکھنے کا ان میں دلولہ تھا نہ صلاحیت۔ ان کی زور آوری کے دن ختم ہوچکے تھے۔ گلابوں والی جنگ نے انھیں کچھ ایسا نیم جان کر دیا تھا کہ وہ اب بادشاہ کی نظرِ کرم کے محتاج تھے۔ اس پر لطف یہ کہ ٹیوڈروں نے ان قدیم امرا کو یکسر نظر انداز کیا اور نئے امرا بناتے رہے۔ بہت سے خاندانوں کو جن کا تعلق متوسط طبقہ سے تھا درجۂ امارت نصیب ہوا۔ ظاہر ہے کہ نئے امیروں کا یہ گروہ دارالامرا میں بادشاہ کا زیادہ وفادار اور اس کے چشم ابرو کے اشاروں کا منتظر رہتا تھا۔ جو دارالامرا اس طرح ترتیب پایا ہوا ہو وہ تاج کا حکم بردار ہونے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ ان حالات میں تاج کے ساتھ تصادم یا چپقلش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

دارالعوام کی ہیئتِ ترکیبی

دارالعوام بھی تاج کا مطیع و فرماں بردار تھا۔ اس کے اراکین شہر (BOROUGHS) اور اضلاع (COUNTIES) سے منتخب ہو کر آتے تھے۔ مگر دونوں جگھوں سے کم و بیش ایک ہی طبقہ یا ایک ہی سماجی مرتبہ کے اشخاص منتخب ہوا کرتے تھے۔ حقِ رائے دہی کے قوانین ایسے تھے کہ صرف خوشحال متوسط طبقہ اس میں حصہ لے سکتا تھا۔ یہ طبقہ سماجی اعتبار سے دو زمروں میں منقسم تھا۔ (۱) اضلاع میں یہ لوگ نائٹ کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ دراصل قدیم زمانے کے چھوٹے درجے کے امرا تھے۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ

ان کی حیثیت ایک اعلیٰ متوسط طبقہ کی سی ہوگئی تھی۔ سیاسیات ان کا موروثی مشغلہ تھا۔ یہ نہ صرف اضلاع میں اپنی سرکردہ حیثیت رکھتے تھے بلکہ باروز (یا شہروں) میں بھی دولت مند تاجر ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ (۲) تاجروں کا متموّل طبقہ قصبات اور شہروں سے اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتا۔ کبھی تو وہ اپنے جیسے تاجروں (BURGESSES) کو منتخب کرتے اور کبھی وہ اضلاع کے نائٹس کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتے۔ غرض منتخب ہونے والے چاہے نائٹ ہوں یا تاجر عملاً ایک ہی گروہ اور ایک ہی سماجی درجہ کے لوگ ہوتے کیونکہ ان دونوں زمروں کے معاشی مفادات یکساں اور باہم متحد تھے۔

سولھویں صدی میں متوسط طبقے کے لئے غیر معمولی معاشی ترقی کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اُون کی تجارت انتہائی منفعت بخش ثابت ہو رہی تھی۔ اضلاع میں زمینداروں نے بھیڑوں کے گلّے پالنے شروع کئے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ زمیندار (یا چھوٹے جاگیردار) وہی لوگ ہیں جنھیں اس وقت کی اصطلاح میں نائٹ کہا جاتا تھا۔ اُون کی تجارت سے دولت بٹورنے کا یہ نادر موقعہ ان کے ہاتھ آیا تھا۔ دوسری طرف تاجر طبقہ تجارت کی گہما گہمی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے مختلف نوع اور مختلف مقاصد کی کمپنیاں قائم کر رہا تھا اور شاہی مناشیر حاصل کر کے دنیا کے دور دراز گوشوں میں پہنچ کر اپنے کاروبار کا جال بچھانا چاہتا تھا۔ ان کو نئی منڈیوں کی تلاش تھی۔ وہ صرف تجارت ہی نہیں بلکہ نوآبادیات کے ذریعہ سے "امپائر" کی تعمیر کے خواب دیکھ رہے تھے۔ غرض نائٹ ہوں یا تاجر دونوں ایک ہی دیوی کے پجاری تھے۔ دونوں سمندر پار تجارت کی توسیع چاہتے تھے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ملک میں ایک طاقتور اور مضبوط حکومت ہو جو اندرون ملک برقراری امن کی ضامن ہو اور بیرون ملک جہاں جہاں ان کے قافلے جائیں ان کی حفاظت کرے۔ سمندر پار تجارتی مفادات کی ترقی میں بین الاقوامی اُلجھنوں اور تصادم کا امکان رہتا ہے۔ ان سے نمٹنے کے لئے ملک میں ایسی حکومت کارفرما ہونا چاہئے جو ہر قسم کے مفاجاتی حالات کا مقابلہ کر سکے۔ اندرون ملک بدامنی کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔ کیونکہ بدامنی اور معاشی ترقی دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ وہ بنیادی محرکات ہیں جن سے متوسط طبقہ اس زمانے میں سرشار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے نصب العین کی صورت پذیری کے لئے اسے ہر ایسے اقدام کی تائید کرنا چاہئے جس سے قومی حکومت دونوں محاذوں پر طاقتور ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ایوانِ زیریں اسی طبقہ کے نمائندوں سے تشکیل پاتا تھا۔ اس لحاظ سے قومی پالیسی کی تشکیل میں قدرتی طور پر اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ پچھلی خانہ جنگی سے جو نقصانات ہوئے تھے قوم نے ان کو بھلایا نہ تھا۔ اس لئے دارالعوام پوری شدت کے ساتھ اقتدار شاہی کے استحکام کی تائید کرتا اور اس مسئلہ کو فی الوقت قابلِ اعتنا نہ سمجھتا تھا کہ تاج کے اختیارات پر دستوری تحدیدات

کی گرفت کہیں کمزور نہ ہو جائے ۔ سولھویں صدی میں تاج اور پارلیمنٹ دونوں کا ایک ہی مطمح نظر تھا۔ اور پارلیمنٹ قوم کے نقطۂ نظر کی عکاس تھی ۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوان حسنِ اتفاق سے اپنی اپنی ہیئتِ ترکیبی کی وجہ سے اور اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کے لئے تاج کا بھرپور ساتھ دینے کے لئے تیار تھے۔ اس لحاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ٹیوڈروں کے عہد میں تاج اور پارلیمنٹ کی ہم آہنگی وسیع تر بنیادوں پر قوم اور تاج کی ہم آہنگی کا نتیجہ تھی ۔ اور وہ شئے جسے عام طور پر ٹیوڈروں کی مطلق العنانی کا نام دیا جاتا ہے وہ دراصل قومی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے قوم کی کامل تائید و رضامندی سے وجود میں لائی گئی تھی ۔ لیکن پارلیمنٹ اپنے اس عام تعاون کے رجحان کے باوجود کبھی کبھی تاج کی پالیسیوں کے خلاف مزاحمت پر بھی کمربستہ ہو جاتی تھی ۔ اور بادشاہ کی ایک چلنے نہ دیتی ؛ بارہا ٹیوڈروں کو اپنی غیر ہردلعزیز پالیسیوں سے دست بردار ہونا پڑا یا ان میں ایسی تبدیلیاں لانی پڑیں جو پارلیمنٹ کو خوش کرنے کے لئے ضروری تھیں.

پارلیمنٹ کی امکانی مخالفت یا مزاحمت کے احتمال کے مدنظر ٹیوڈر حکمران انتخابات کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ یہ کام شیرف (SHERIFF) سے لیا جاتا تھا۔ کوشش یہ کی جاتی تھی کہ صرف ایسے لوگ منتخب ہو کر آئیں جن کی وفاداری اور شاہ پرستی میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو ۔ رائے دہندوں پر اثرات ڈالے جاتے ۔ تخویف یا ترغیب سے کام لیا جاتا ۔ ان عارضی کوششوں سے ہٹ کر ٹیوڈروں نے اس سلسلے میں بعض ایسے اقدامات بھی کئے جن سے دستور کا ڈھانچہ متاثر ہو سکتا تھا ۔ انھوں نے بہت سے نئے شہروں (BOROUGHS) کو حقِ رائے دہی دینا شروع کیا اور اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ صرف ایسے مقامات کو یہ امتیاز بخشا جائے جہاں انتخابات کی مشینری حکومت کے زیر اثر رہ سکتی تھی ۔ چنانچہ اس عہد میں کارنوال کے ضلع میں متعدد نئے باروز (BOROUGHS) بنائے گئے جہاں سے اب دارالعوام کے لئے اراکین منتخب ہو کر آ سکتے تھے ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کارنوال کا ضلع شاہی جاگیر تھا ۔ جہاں انتخابات کے وقت شاہی اثر و رسوخ سے بہت کام لیا جا سکتا تھا ۔ دارالعوام کی رکنیت میں اضافہ کا یہ کام عوام کی وسیع تر نمائندگی کی غرض سے نہیں بلکہ تاج کے اغراض کی تکمیل کے لئے کیا گیا ۔ ٹیوڈر ان مختلف ذرائع سے اس بات کا یقین حاصل کرنا چاہتے تھے کہ ایک محکوم اور فرماں بردار دارالعوام ان کے قبضہ میں رہے ۔ اور ان کی اپنی پالیسیوں کے روبہ عمل لانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے ۔

ٹیوڈروں کی مالیاتی حکمتِ عملی

ٹیوڈروں نے اپنے آپ کو پارلیمنٹ سے آزاد رکھنے کے لئے روپیہ وصول کرنے کے ایسے ذرائع پیدا کئے

جن کا دستوری جواز مشتبہ تھا۔ اپنی ضروریات کے لئے وہ پارلیمنٹ کے آگے بار بار ہاتھ پھیلانا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ تاج کی یہ دست نگری پارلیمنٹ کے مقابلہ میں اس کی کمزوری کا باعث بنتی ہے۔ انھوں نے نذرانے (BENVOLENCES) وصول کرنے کا طریقہ جاری رکھا جس کی ابتدا ایڈورڈ چہارم کے زمانے سے ہوئی تھی۔ نذرانے کہنے کو تو روپیہ وصول کرنے کا ایک معصوم ذریعہ نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں جبر کا پہلو ہوتا تھا۔ جن لوگوں سے نذرانے وصول کئے جاتے تھے وہ اپنی آزاد مرضی یا خوشی سے اس کو ادا نہیں کرتے تھے بلکہ حکومت کے دباؤ کے تحت اس کی ادائی پر مجبور تھے۔ رچرڈ سوم کے عہد میں پارلیمنٹ نے نذرانے کی وصولی کو ناجائز قرار دیا۔ ٹیوڈر اس قانون کو نظر انداز کرتے رہے اور اس کو پابندی سے وصول کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے علاوہ جبری قرضے بھی وصول کئے جانے لگے۔ قرض کی واپسی کی طمانیت کے طور پر حکومت قرض دہندہ کو ایک تحریری دستاویز "پریوی سیل" (PRIVY SEAL) کے نام سے دیتی تھی۔ مگر فی الحقیقت یہ پریوی سیلس ایک کاغذ کے پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں کیونکہ کسی کی مجال نہ تھی کہ قرض کی بازیافت کے لئے بادشاہ سے مطالبہ کرے۔ رفتہ رفتہ ٹیوڈروں نے اس طریقۂ کار کو اپنا معمول بنا لیا اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ نذرانے اور جبری قرضے (پریوی سیلس) ٹیکس کی مستقل صورت اختیار کر لیں گے۔ سنہ 1525ء میں ہنری ہشتم نے کلیسائی اور غیر کلیسائی جائیداد پر ایک مقررہ شرح سے پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر رقمی امداد کا مطالبہ کیا تو ملک میں اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ اس مخالفت کی شدت کے پیش نظر ہنری نے اس سے دست برداری اختیار کر لی۔ ٹیوڈر حکمران نظری طور پر اس کو تسلیم کرتے تھے کہ ٹیکس کے عاید کرنے کا اختیار صرف پارلیمنٹ کو ہے۔ محصول اندازی کا یہ دوسرا غیر دستوری طریقہ محض پارلیمنٹ کی گرفت سے بچنے کے لئے اختیار کیا جانے لگا تھا۔ اس کو نذرانوں اور قرضوں کا نام دے کر اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی تھی؛ تاکہ یہ محسوس نہ ہو کہ ٹیوڈر بادشاہ دستور کی کھلے طور پر خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

پارلیمنٹ کے اختیارات کی توسیع اور استحکام

اصلاحِ کلیسا کا اثر دستور پر

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس سے بہ ظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تاج کے مقابلہ میں پارلیمنٹ بے بس ہوتی جا رہی تھی اور دستوری ارتقا کی تمام راہیں بند ہو گئی تھیں۔ لیکن حالات کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پارلیمنٹ نہ صرف اپنے محصلہ اختیارات کو مستحکم کرتی جا رہی تھی بلکہ قومی زندگی

کے بعض ایسے شعبے جو سابق میں اس کی دسترس سے باہر تھے اب کلیتہً اس کے قبضے میں آگئے تھے۔ پارلیمانی اقتدار کی یہ خاموش توسیع پذیری اور استحکام ہنری ہشتم کے عہد کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس عہد میں دو اہم مسائل پیدا ہوئے۔ ان دونوں کا جس طرح انصرام کیا گیا اس سے پارلیمنٹ کی پوزیشن پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک مسئلہ جانشینی کا تھا اور دوسرا روم سے کلیسا کے انقطاع کا۔

جانشینی کا مسئلہ تو محض ہنری کا پیدا کردہ تھا۔ اس کی متعدد شادیوں نے یہ پیچیدگی پیدا کی۔ کیتھرین سے جب اس نے علٰحدگی حاصل کی تو اس کی لڑکی میری کو ناجائز اولاد قرار دے کر وراثت سے محروم کیا گیا۔ اور الزبتھ کو جانشین تسلیم کیا گیا جو این بولن کے بطن سے تھی۔ بعد میں اسے بھی وراثت سے محروم کیا گیا اور ایڈورڈ کو وارث تسلیم کیا گیا جو جین سیمور کے بطن سے تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اگر ایڈورڈ کا سلسلہ منقطع ہو جائے یا خود ایڈورڈ کمسنی میں فوت ہو جائے تو تاج و تخت کا مالک کون ہوگا۔ اور سلسلۂ وراثت کی کیا ترتیب ہوگی۔ ہنری کے بعد اس پیچیدگی سے خطرناک نتائج برآمد ہوسکتے تھے۔ قوم کو اس کا تجربہ تھا کہ متنازعہ فیہ وراثت سے ملک کے امن و امان میں خلل پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہنری اور پارلیمنٹ دونوں اس بارے میں متشوش تھے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے جس قانون کے ذریعہ سے ایڈورڈ کو وارثِ تخت و تاج تسلیم کیا تھا، اسی میں ہنری کو یہ اختیار بھی دیا کہ وہ وصیت کے ذریعہ سے سلسلۂ وراثت کا تعین کرے۔ لڑکیوں کی حد تک یہ مسئلہ ایسا نازک تھا کہ بیک وقت میری اور الزبتھ دونوں جائز اولاد قرار نہیں پاسکتی تھیں اور ناجائز اولاد خود بخود وراثت سے محروم ہو جاتی ہے سوائے اس صورت کے کہ پارلیمنٹ اپنے اختیار سے اس کے حق وراثت کو بحال کرے یا اسے وارث و جانشین تسلیم کرے۔ پارلیمنٹ کا یہ اختیار مسلمہ تھا۔ چنانچہ اب اسی سے کام لیا گیا۔ اور پارلیمنٹ کے عطا کردہ اختیار کی بنا پر ہنری نے ایڈورڈ اور اس کی اولاد کے بعد میری اور الزبتھ کو اسی ترتیب سے وارثِ تاج و تخت نامزد کیا۔ یہ امر کہ ہنری جیسے مطلق العنان بادشاہ کو مسئلہ وراثت کے طے کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے اختیارات حاصل کرنے پڑتے اور جو کچھ بھی اس نے انتظام کیا وہ محض ان ہی محصلہ اختیارات کی بنا پر تھا، اس بات کا کھلا اعلان تھا کہ دستوری طور پر وہ پارلیمنٹ کا محتاج اور دست نگر ہے۔ پارلیمنٹ کے اقتدار کا یہ ایسا واضح اعتراف ہے کہ جس سے اس کے غیر متزلزل دستوری موقف کی نشان دہی ہوتی ہے۔ (ADAMS - P. 257.

روم سے کلیسا کا انقطاع ایک معرکہ کا مسئلہ تھا۔ اس کے بہت دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔ اس سے انگلستان کے دستور میں ایک نئی وسعت پیدا ہوئی۔ قومی زندگی کے ایک اہم اور وسیع گوشے پر پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کی سیادت قائم ہوسکی۔ ہنری ہشتم اپنی بیوی کیتھرین سے طلاق حاصل کرنا چاہتا تھا،

تاکہ اپنی تازہ محبوب نظر این بولین سے شادی کر سکے۔ لیکن رومن کیتھولک کلیسا میں طلاق ناممکن ہے۔ اب صرف ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ پاپائے روم اپنے اختیار خصوصی کے ذریعہ سے اس شادی کو ہی سرے سے ناجائز قرار دے دے۔ اس طرح ہنری کو کیتھرین سے گلوخلاصی کا موقعہ مل جائے۔ چنانچہ پوپ سے اس معاملے کو رجوع کیا گیا۔ کافی طویل عرصہ کے بعد جب یہ بات ہنری پر منکشف ہوئی کہ پوپ اس رشتے کی گرہ کشائی سے قاصر ہے تو ہنری نے سنجیدگی سے دوسرے ممکنہ اقدامات پر غور کرنا شروع کیا۔

پوپ اصل میں مجبور تھا۔ کیتھرین شہنشاہ چارلس پنجم والیِ اسپین کی قریبی رشتہ دار یعنی خالہ تھی۔ اور اس زمانے میں اسپین یورپ میں سب سے طاقتور ملک تھا۔ شہنشاہ چارلس کو ناراض کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ کم از کم پوپ کی تو یہ مجال نہ تھی۔ اس لئے ہنری کو وہ لطائف الحیل سے ٹالتا رہا۔ ان حالات میں ہنری کے لئے واحد حل یہی تھا کہ انگلستان کے کلیسا کو روم کی ماتحتی سے آزاد کر کے اسے مقتدر قومی کلیسا بنادے یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ صدیوں کے رشتے اور بندھن تھے جنھیں آناً فاناً توڑنے کی ضرورت تھی۔ یہ اقدام اپنے اندر ایک عظیم انقلاب کی پنہائیاں رکھتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس انقلاب کو وقوع پذیر کرنے کے لئے جو جو قدم بھی اٹھائے جائیں انھیں قانونی اور دستوری جامہ پہنایا جائے تاکہ یہ تمام کارروائی ملک کے قانون کے لحاظ سے ہر سقم سے پاک ہو۔ چنانچہ 1529ء میں ایک پارلیمنٹ طلب کی گئی۔ یہ سات سال تک برقرار رکھی گئی۔ اس کو "پارلیمنٹ اصلاحِ مذہب" (REFORMATION PARLIAMENT) کہتے ہیں۔ اس نے متعدد قوانین پاس کئے۔ سب سے پہلے اس نے قانون مرافعہ (ACT OF APPEALS) پاس کیا جس کے ذریعہ سے پوپ کی عدالت میں مرافعہ کو قابلِ سزا جرم قرار دیا۔ اس طرح روم کی پاپائی عدالت کلیسائے انگلستان کے لئے اعلیٰ ترین عدالتِ مرافعہ باقی نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی بعض اور قوانین بھی پاس کئے گئے جن کے ذریعہ سے پوپ کو جو محاصل اور رقومات یہاں سے روانہ کی جاتی تھیں انھیں یکقلم مسدود کیا گیا۔ اور سب سے آخر میں قانونِ سیادت (ACT OF SUPREMACY) منظور کیا گیا جس نے کلیسا پر پاپائیت کی مسلّمہ برتری اور سیادت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس قانون کے ذریعہ یہ لازم قرار دیا گیا کہ رعایا کا ہر فرد حلفاً اس بات کا اقرار کرے کہ وہ کلیسا پر پوپ کی سیادت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس کی جگہ بادشاہ کو کلیسا کا حاکمِ اعلیٰ تصور کرتا ہے۔ قانونِ سیادت سے انکار کی صورت میں سخت سزائیں رکھی گئی تھیں۔ ان قوانین نے انگلستان کے دستور کو ایک ایسی جامع حیثیت عطا کی جو پہلے اسے حاصل نہیں تھی۔ قانون سازی کا ایک وسیع گوشہ جو سابق میں پارلیمنٹ کی دسترس سے باہر تھا اب کلیتہً اس کے قبضہ میں آگیا۔ ان تبدیلیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کو کس حد تک منبعِ اقتدار مانا جاتا تھا۔ وہ کسی نوع کے بھی دستوری اور آئینی انقلاب کو محض ایک جنبشِ قلم سے وجود میں

لا سکتی تھی۔ اصلاحِ مذہب کی طرف انگلستان کا پہلا قدم پارلیمنٹ کے ہمہ گیر اقتدار کا مظہر ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ٹیوڈر عہد میں پارلیمنٹ کا نہ صرف روایاتی دستوری موقف برقرار تھا بلکہ اس میں نئی وسعتیں پیدا ہو رہی تھیں۔

اصلاحِ کلیسا ایڈورڈ ششم میری اور ایلزبتھ کے زمانے میں

ہنری نے کلیسائے انگلستان کے موقف میں جو تبدیلیاں پیدا کیں وہ محض سیاسی نوعیت کی تھیں۔ اس نے اس عظیم ادارے کو قومی ادارہ بنا دیا جو ہر قسم کی بیرونی محکومیت سے آزاد تھا لیکن مذہب میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ کلیسا کا سرکاری مذہب اب بھی رومن کیتھولزم تھا بلکہ ہنری نے "شش دفعات ایمانی" (SIX ARTICLES OF FAITH) کے قانون کے ذریعہ سے اس کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کلیسا کے نظام کا تاریخی تسلسل ٹوٹ نہ سکا۔ اور نہ اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ہنری کے عہد کی "اصلاح" زیادہ عرصہ تک محض سیاسی نوعیت کی نہ رہ سکی۔ اس کے جانشینوں کے زمانے میں کلیسا کو رفتہ رفتہ پروٹسٹنٹ رنگ دیا گیا۔ پروٹسٹنٹ تحریک کے زیرِ اثر پہلے ایڈورڈ ششم اور بعد میں الزبتھ کے عہد میں پارلیمنٹ نے ایسے قوانین نافذ کئے جن سے کلیسا کا سرکاری مذہب رومن کیتھولزم کی بجائے پروٹسٹنزم قرار پایا۔ ایڈورڈ ششم اور الزبتھ کے درمیان میری جب تخت نشین ہوئی تو کیتھرین کی بیٹی ہونے کے ناطے اور اس بنا پر کہ وہ خود کٹر رومن کیتھولک تھی اپنے باپ ہنری اور بھائی ایڈورڈ (ششم) کے زمانوں میں اصلاح کا جو کچھ بھی کام ہوا تھا اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ پاپا کی سیادت دوبارہ انگلستان پر قائم کر دی اسی لئے الزبتھ کو از سرِ نو اصلاحِ کلیسا کا کام انجام دینا پڑا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا۔ پارلیمنٹ نے دوبارہ "قانونِ سیادت" (ACT OF SUPREMACY) اور قانونِ یکسانیت (ACT OF UNIFORMITY) پاس کیا۔ ان قوانین کے ذریعہ سے پروٹسٹنٹ مذہب رائج کیا گیا۔ پاپائیت اور رومن کیتھولزم (ROMAN CATHOLICISM) کا دیس نکالا ہوا۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان تمام انتظامات کے بروئے عمل لانے میں ہر ہر قدم پر پارلیمنٹ سے کام لیا گیا۔ اس سے مفر ہی نہیں تھا۔ اس کے بغیر کوئی انتظام قانونی جواز کا جامہ نہیں پہن سکتا تھا۔ پارلیمنٹ کی طاقت کی اس سے بہتر اور صریح مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ الزبتھ کے مذہبی انتظام کے بعد قوم عملاً دو حصوں میں منقسم نظر آتی تھی (۱) رومن کیتھولک اور (۲) پروٹسٹنٹ۔ ملک کی کافی بڑی اکثریت پروٹسٹنٹ مذہب قبول کر چکی تھی لیکن ان میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو الزبتھ کے معتدل مذہبی انتظام سے ناخوش تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ زیادہ انتہا پسندانہ پرٹسٹنٹ مذہب رائج کیا جائے۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ حکومت کے مخالف ہوتے گئے۔ پیورٹن فرقہ کی یہیں سے ابتدا ہوتی ہے۔ ان کی اور کیتھولکوں کی مخالفتوں کے مدنظر مذہبی اور قومی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے جبر و تخویف سے کام لینے کے سوائے کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔ اصلاح کے جدید انتظام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزاؤں سے ہی قابو میں رکھا جا سکتا تھا۔ اس غرض کے لئے "کورٹ آف ہائی کمیشن" (COURT OF HIGH COMMISSION) قائم کیا گیا۔ یہ عدالت اختیارات اور طریقۂ کار کے اعتبار سے کورٹ آف اسٹار چیمبر جیسی تھی۔ اس کو بھی پریوی کونسل کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے۔ پریوی کونسل کے کچھ ممبروں کے ساتھ اس میں کلیسا کے نمائندے بھی شامل ہوتے تھے۔ یہ شاہی اختیارات کی خصوصی عدالت (PREROGATIVE COURT) تھی۔ اس میں "قانون غیر موضوعہ" (COMMON LAW) کے طریقۂ کار کی پیروی نہیں کی جاتی تھی۔ اور نہ ملزم کو وہ قانونی تحفظ ملتا تھا جو ملک کی عام عدالتوں میں اسے حاصل ہو سکتا تھا۔ البتہ تحقیقات میں اذیت اور عذاب دینے سے پرہیز کیا جاتا تھا اور یہ سزائے موت بھی صادر نہیں کر سکتی تھی۔ تاج کی حیثیت اب کلیسا کے (حاکم اعلیٰ) گورنر کی تھی۔ یہ عدالت اسی اقتدار کے نافذ کرنے کا ذریعہ تھی۔ اس عہد میں اس کا وجود بہت مفید ثابت ہوا لیکن اگلی صدی میں اپنے لامحدود اختیارات کی وجہ سے اس بات کا احتمال تھا کہ کہیں یہ شاہی جبر و استبداد کا آلۂ کار نہ بن جائے۔

مقامی حکومت

مقامی مجالس اور شرف

ٹیوڈروں کے زمانے میں مقامی حکومت کے اداروں کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔ قرونِ وسطیٰ میں مقامی حکومت کا تمام کام ضلع (COUNTY.) اور تعلقہ (HUNDRED) کی مجالس میں انجام پاتا تھا۔

یہ مجالس انتظامی اور عدالتی دونوں فرائض انجام دیتی تھیں لیکن ایک عرصہ سے یہ ادارے تنزل پذیر ہو گئے تھے۔ ان کے عدالتی فرائض رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور شاہی عدالتیں ان کی جگہ لینے لگیں۔ شاہی عدالتوں کی توسیع اور ترقی پذیری نے ان قدیم مجالس کو بے اثر اور مفلوج کر دیا تھا۔ سابق میں ضلع کا سب سے اہم عہدہ دار شرف ہوا کرتا تھا۔ لیکن تیرھویں اور چودھویں صدی کے دوران میں اس کے اختیارات میں مسلسل کمی ہوتی رہی۔ انتظامی اختیارات کے رفتہ رفتہ سلب ہونے کی وجہ سے اس کی

حیثیت محض ایک عدلیہ کے عہدہ دار کی سی رہ گئی۔ دورہ کناں شاہی ججس کی آمد کے موقعہ پر ضلع میں ان کا استقبال کرنا، مجرموں کے قصاص کا انتظام کرنا اور پارلیمانی انتخابات سے متعلق تمام کارروائی کی انجام دہی، اب صرف یہ فرائض اس کے تفویض تھے۔ اس کے فوجی اختیارات بھی اس سے چھین لئے گئے تھے۔ وہ سابق کی طرح ضلع میں ملیشا (قومی فوج) کا افسرِ اعلیٰ باقی نہیں رہا۔ یہ خدمت ایک نئے عہدہ دار کے سپرد کی گئی جو لارڈ لفٹننٹ کہلانے لگا۔ یہ تبدیلی میری کے عہد میں روبہ عمل لائی گئی۔

جسٹس آف دی پیس

ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ضلع میں ایک نیا عہدہ وجود میں آرہا تھا۔ ایک عرصہ سے ایک ایسے افسر کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو ضلع میں امن و امان برقرار رہ سکے۔ اور مجرموں کو سزا دلانے کے لئے مقدمات کی جانچ پڑتال کے بعد انھیں عدالت میں پیش کر سکے۔ اس سلسلے میں متعدد تجربے کئے گئے۔ ان تجربات کے نتیجہ کے طور پر جسٹس آف دی پیس کا عہدہ وجود میں آیا۔ یہ بات ٹیوڈر عہد سے پہلے کی ہے۔ تیرھویں صدی سے ایسے عہدہ دار مقرر کئے جانے لگے تھے جو "محافظِ امن" (CONSERVATOR OF PEACE) کہلاتے تھے۔ 1360ء میں ان کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔ وہ حسبِ ضرورت سزائے قید نافذ کرنے کے مجاز گردانے گئے۔ کم و بیش اسی زمانے سے یہ عہدہ دار جسٹس آف دی پیس کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ مقامی حکومت کی روحِ رواں بن گئے۔ ٹیوڈروں نے اپنے عہد میں ان سے بہت کام لیا۔ ان کے فرائض میں پیہم توسیع عمل میں آتی رہی۔ وہ بیک وقت عدالتی اور انتظامی عہدہ دار تھے۔ اوزان اور ناپ تول کی نگرانی، اُجرتوں کا تعین، تجارت اور صنعت و حرفت کا انتظام، شاہراہوں، کار آموزوں اور گداگروں کی دیکھ بھال ان کے فرائض میں داخل تھی۔ ان کو پولیس کے وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ فسادات سے بروقت اور برسرِ موقع نمٹنا ان کا اہم ترین فرض تھا۔ جسٹس آف دی پیس ضلع میں تاج کے نمائندے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ وہی پوزیشن ہے جو کسی زمانے میں شرف کو حاصل تھی۔ مجالس ضلع و تعلقہ کے بیشتر وظائف اب اسی کے تفویض ہو گئے تھے۔ ٹیوڈر بادشاہوں نے ان عہدہ داروں پر اتنی ذمہ داریاں ڈال دی تھیں کہ مقامی نظم و نسق کلیتہً ان کے سہارے چلتا تھا۔ حالانکہ یہ تنخواہ یاب عہدہ دار نہ تھے۔ مقامی ذی اثر اور سرکردہ اشخاص اس کام کے لئے نامزد کر دیئے جاتے تھے۔ پیرش (PARISH.) کے نظم و نسق کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ 1888ء کے لوکل سلف گورنمنٹ ایکٹ (قانون حکومتِ مقامی) کے پاس ہونے تک جسٹس آف دی پیس مقامی حکومت کا اہم ترین عہدہ دار ہوا کرتا تھا۔

پیرش (PARISH)

پیرش مقامی حکومت کی سب سے چھوٹی وحدت تھی۔ قدیم سیکسن زمانے میں قصبہ (TOWNSHIP) کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کی اپنی ایک مجلس ہوتی تھی جو تمام مقامی مسائل سے خود نمٹ لیتی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں جاگیری نظام کی ترویج کی وجہ سے اس اسمبلی کی اہمیت بہت کم ہوگئی تھی۔ لیکن پچھلی دو تین صدیوں میں نظامِ جاگیری کے زوال کے ساتھ اس قسم کی مجلس کا دوبارہ احیا ہونے لگا تھا۔ مگر اس عرصہ میں ٹاؤن شِپ (قصبہ) بحیثیت ایک انتظامی یونٹ کے غائب ہو چکا تھا۔ اب ٹاؤن شِپ کی جگہ پیرش نے لے لی تھی۔ پیرش کی زندگی کا محور مقامی کلیسا تھا۔ کلیسا کا پادری پیرش کا ذی اثر لیڈر ہوتا تھا۔ وہ پیرش والوں کے لئے معلم، رہبر اور رہنما سب کچھ تھا۔ اس کی قیادت میں ایک چھوٹی سی مجلس ترتیب پانے لگی تھی۔ یہ مجلس رفتہ رفتہ مقامی حکومت کا ایک اہم ادارہ بن گئی۔ مذہبی اغراض کے لئے وہ مقامی باشندوں سے چندہ وصول کرتی جو کلیسا کی زینت و آرائش اور مذہبی تہواروں پر صرف ہوتا تھا۔ ٹیوڈروں نے اس کے اختیارات میں مزید اضافہ کیا۔ الزبتھ کے عہد میں غریب اور نادار طبقہ کی امداد کے لئے جب پارلیمنٹ نے قانون بنایا تو اس کا انتظام پیرش کے سپرد کیا گیا۔ مقامی نظم و نسق میں اس طرح اس کی حیثیت مسلّمہ ہوگئی۔ غریب طبقہ کی امداد اور دیکھ بھال کے علاوہ اور بہت سے کام پیرش کی مجلس کے سپرد کئے گئے۔ اس کو مقامی ٹیکس وصول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس رقم سے سڑکوں کو ٹھیک حالت میں رکھنا منجملہ اور فرائض کے ایک اہم فرض تھا۔ ٹیوڈروں نے نظم و نسق میں پیرش کو مضبوط موقف عطا کر دیا تھا۔ اور مقامی حکومت کی ایسی شکل عطا کر دی تھی جو بہت دیرپا اور مستحکم ثابت ہوئی۔

تیسرا باب

شاہانِ اسٹورٹ

جیمز اول اور پارلیمنٹ

جیمز کی تخت نشینی * 1603ء

الزبتھ کے انتقال کے بعد شاہانِ ٹیوڈر کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ جیمز اول کو اس کا جانشین بنایا گیا جو اس وقت اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ تھا۔ اور جیمز ششم کے لقب سے موسوم تھا۔ اس کی عمر کم و بیش چونتیس (36) سال تھی۔ انگلستان میں اسٹورٹ خاندان کا یہ پہلا بادشاہ ہے۔ ہنری ہشتم کی اولاد میں اب کوئی باقی نہیں تھا۔ جیمز، ہنری ہفتم کی بیٹی مارگریٹ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے تخت کا قریب ترین حقدار تھا۔ مارگریٹ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمز چہارم سے بیاہی گئی تھی۔ ہنری ہشتم نے اپنی وصیت کی رُو سے وراثت کا جو انتظام کیا تھا۔ اس میں مارگریٹ کی اولاد کے مرجح حقوق کو نظرانداز کرکے ہنری ہفتم کی چھوٹی لڑکی میری کی اولاد کو جانشینی کے لئے اوّلیت عطا کی تھی۔ یہ یہ اس وجہ سے تھا کہ اسکاٹ لینڈ سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ مگر الزبتھ کے انتقال کے بعد اس انتظام کی عمل آوری مناسب نہیں سمجھی گئی۔ حالانکہ ہنری ہشتم کی وصیت کو پارلیمنٹ کی توثیق و تائید حاصل تھی۔ لیکن اس موقعہ پر خود پارلیمنٹ نے اس کو مناسب سمجھا کہ جیمز کو تاج و تخت پیش کیا جائے۔ پارلیمنٹ کا اس سابقہ انتظام سے انحراف رائے عامّہ کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ جیمز کی تخت نشینی ملک کے لئے زیادہ سازگار ثابت ہوگی۔ اس کی موزونیت شاید اس لحاظ سے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ وہ ایک ایسے ملک سے آرہا تھا جہاں پروٹسٹنٹ مذہب رائج تھا۔ اس عہد میں اہلِ انگلستان مذہب کے نشہ میں ایسے چُور تھے کہ وہ تمام سیاسی مسائل کو بس اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ سترھویں صدی کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مذہب اس دَور میں

ایک کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ اس عہد کے سیاسی اور دستوری مسائل، مذہبی مناقشات، تعصبات اور فرقہ بندیوں سے اور زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے۔ اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے آئندہ آئے گا۔

جیمز کے سر پر اسکاٹ لینڈ کا جب تاج رکھا گیا تو اس کی عمر چند مہینوں سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو بادشاہ پایا۔ اس کی تعلیم و تربیت بہت اچھی ہوئی تھی۔ مذہبی علوم پر اسے خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ اس پر اس کو ناز بھی تھا۔ لیکن اسٹورٹ خاندان کا یہ پہلا بادشاہ دانشمند اور مدبر ثابت نہیں ہوا۔ معاملہ فہمی اس میں مطلق نہ تھی۔ ٹیوڈر سلاطین کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ قوم کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مگر خاندان اسٹورٹ کی یہ بدنصیبی تھی کہ وہ قوم کے اچھے نباض ثابت نہیں ہوئے۔ اسی وجہ سے ان کا دَور ہنگامہ آرائیوں سے معمور نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوم کی کشتی ایک طوفان خیز اور متلاطم سمندر میں تھپیڑے کھا رہی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

قوم کی خود اعتمادی

اسٹورٹوں کی بدقسمتی تھی کہ وہ سترھویں صدی میں وارثِ تخت و تاج ہوئے جبکہ انگلستان ایک نئے دَور میں داخل ہو رہا تھا۔ زندگی کے سانچے بدل رہے تھے۔ قوم میں خود اعتمادی پائی جاتی تھی۔ اب حالات سولہویں صدی کے مقابلہ میں بالکل مختلف تھے۔ آرمیڈہ کی شکست کے بعد سے بیرونی حملہ کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا اور نہ یہ اندیشہ تھا کہ انگلستان کی آزادی بین الاقوامی سیاست کی سازشوں کا شکار ہو جائے گی۔ جس قسم کی خانہ جنگی کا اندیشہ ابتدائی ٹیوڈر عہد میں تھا اس کا اب وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹیوڈروں کے ہاتھوں قوم کی ایسی پرداخت اور نشوونما ہوئی تھی کہ اسے خارجی سہاروں کی ضرورت نہیں تھی۔ سولہویں صدی میں وہ صرف شاہی اقتدار کے سہارے ہی آگے بڑھ سکتی تھی۔ اب صورتِ حال ایسی نہیں تھی۔ اس میں خود ایسی اہلیت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنے مسائل آپ حل کر سکتی تھی۔ بات صرف یہی نہیں تھی کہ اس کی صلاحیتیں اور خوابیدہ قوتیں بیدار ہو چکی تھیں۔ بلکہ ان صلاحیتوں سے وہ کام لینے پر مُصر اور بے چین تھی۔ وہ سب کچھ تاج پر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھی۔ تاج کی "مطلق العنانی" کے لئے نہ اب کوئی جگہ تھی اور نہ قوم اس کی اجازت دینے کے لئے تیار تھی۔ اسٹورٹ عہد کی ابتدائی پارلیمنٹیں قوم کے اس بدلے ہوئے مزاج کی آئینہ داری کرنے لگیں۔ قدم قدم پر تاج اور پارلیمنٹ میں چپقلشیں پیدا ہونے لگیں۔ اور ملک میں تاج کی مطلق العنانی کی روش کے خلاف ایک خاموش لیکن

باعزم مخالفت کے آثار نظر آنے لگے۔ جیمز قوم کے اس نفسیاتی تغیر کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی رہی۔ اس کا بیٹا چارلس تو اس سے زیادہ اس معاملہ میں کم اندیش ثابت ہوا۔ اسٹورٹ بادشاہ سیاسی بصیرت سے یکسر محروم تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ٹیوڈروں نے جس انداز سے حکومت کی ہے اسی طرز کو جاری رکھیں۔ جیمز نے اس مصمم ارادہ سے اپنی حکومت کا آغاز کیا کہ وہ پارلیمنٹ کی ایک نہ چلنے دے گا اور پارلیمنٹوں سے تعلقات میں اسی درشتی، بے اعتنائی اور سخت گیری سے کام لے گا جیسا کہ اس کی پیشرو الزبتھ کا وطیرہ تھا۔ مختصر یہ کہ وہ عملاً ٹیوڈروں کی "مطلق العنانی" کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی کمی کو وہ اپنے شاہانہ اقتدار کی تذلیل سمجھتا تھا۔

نظریہ "حقوقِ آسمانی"

جیمز اپنے مزاج، اُفتادِ طبع اور اپنے محبوب نظریات کے لحاظ سے اس زمانے کے لئے نہایت ناموزوں حکمراں تھا۔ اس کا عالمِ دین ہونا بھی اس کے لئے غضب ثابت ہوا۔ اس نے "نظریہ حقوق آسمانی" کو اپنا جزوِ ایمان بنالیا۔ کلیسا بڑے شد و مد سے اس نظریہ کی تائید کرتا تھا۔ جیمز کا یہ غیر متزلزل ایقان تھا کہ بادشاہت ایک عطیۂ ربانی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو ہر قسم کی بازپرس سے بالاتر سمجھتا تھا۔ وہ اپنے منصب کو مقدس اور اپنے اختیارات کو ناقابلِ انتقال تصور کرتا تھا۔ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ قوم یا قوم کی کوئی نمائندہ مجلس اس کے اختیارات پر کوئی تحدید عاید نہیں کرسکتی تھی۔ وہ پارلیمنٹ کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن پارلیمنٹ کا کام اس کی ہمسری کرنا نہیں بلکہ اس کی ہدایت اور نگرانی میں حکومت کے کام میں اس کا ہاتھ بٹانا تھا۔ اس کے صریح معنیٰ یہ تھے کہ وہ اپنے آپ کو ملک کے قانون اور دستور سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کے اعمال و افعال کو کسی قانونی دائرہ میں محدود کرنا اس کے نزدیک عطیۂ ربانی کی تضحیک و تذلیل تھی۔ اسٹورٹوں کی بدنصیبی یہ تھی کہ یہ تصورات جیمز پر ختم نہیں ہوگئے بلکہ اس کی اولاد میں متوارث رہے۔ اس لئے اس خاندان کی تاجداری بالآخر ذلت اور رسوائی کے ساتھ اس صدی کے اختتام سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔

نظریاتی تصادم

انگلستان کے دستوری ارتقار کی تاریخ سے جو شخص تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ جیمز کے نظریاتی موقف کی انگلستان میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قوم

اپنی سابقہ دستوری ترقی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے لئے اسے قربانیاں دینی پڑی تھیں۔ اور یہ ترقی مسلسل اور پیہم کشمکش سے حاصل ہوئی تھی۔ عارضی طور پر بعض مخصوص حالات میں ٹیوڈروں کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ حکومت اپنی مرضی اور اختیار سے چلالیں۔ لیکن اس میں بھی بہ ظاہر ایک دھوکہ ہے۔ بادی النظر میں ٹیوڈر مطلق العنان نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت کو زیادہ گہری نظر سے ٹٹولا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلق العنانی بھی قوم کی رضامندی پر مبنی تھی۔

ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روزِ اول سے ہی پارلیمنٹ اور جیمز میں تصادم پیدا ہوگیا۔ پارلیمنٹ تاج کو قانون کے دائرہ سے تجاوز کرنے کی اجازت دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تاج پر بھی قانون کی حکمرانی مسلط کرنا چاہتی تھی۔ سترھویں صدی دستوری کشمکش کی صدی ہے۔ یہ کشمکش جس شدت سے اس زمانہ میں جاری رہی اس کی مثال پچھلے کسی دور میں نہیں ملتی۔ ایک طاقتور شاہی کا طاقتور پارلیمنٹ سے ٹکراؤ تھا۔ پارلیمنٹ پچھلی صدیوں کی مجتمعہ روایات، حقوق اور امتیازات کو دوبارہ سمیٹ کر میدان میں آئی تھی۔ تاج کو اپنے صدیوں پرانے اقتدارات پر گھمنڈ تھا۔ جسے ٹیوڈروں نے کچھ اور چمکا دیا تھا۔ دونوں حریف کافی طاقتور تھے اور دونوں اپنے اختیار کردہ موقف سے ایک انچ ہٹنا نہیں چاہتے تھے اس سے پہلے ایسی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لنکاسٹری عہد میں پارلیمنٹ طاقتور تھی لیکن تاج کمزور۔ ٹیوڈر دور اس کے برعکس تاج کی طاقت اور پارلیمنٹ کی کمزوری کا تھا۔ دونوں حالتوں میں ایک فریق دوسرے پر چھایا ہوا رہا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کوئی شدید تصادم پیدا نہیں ہوسکتا تھا بلکہ ایک فریق کے دبے دبائے رہنے کی وجہ سے ایک نوع کی ہم آہنگی کا پایا جانا قدرتی امر تھا۔ اسی وجہ سے لنکاسٹریوں' اور ٹیوڈروں کے زمانہ میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان کوئی کشمکش نظر نہیں آتی۔ 1399ء کے انقلاب کے بعد تاج کے اختیارات پر قابلِ لحاظ تحدیدیں عاید کر دی گئی تھیں۔ لنکاسٹری دور فی الحقیقت "محدود شاہی" کے تجربہ کا دور ہے۔ اس عہد میں دستور بنیادی طور پر "محدود شاہی" کے نظام کا آئینہ دار تھا۔ ایک عرصہ تک ملک میں اس نظامِ حکومت کی عملداری رہی۔ لیکن بعد میں یارکیوں اور ٹیوڈروں نے بدلے ہوئے حالات میں اسی دستور سے ایسا کام لیا کہ عملاً تاج کے لیے خود مختاری اور مطلق العنانی کی راہیں کھل گئیں۔ ان دونوں خاندانوں کے زمانے میں بہ ظاہر دستوری تقاضوں کو پورا کیا جاتا رہا۔ لیکن درپردہ دستور کا مرکزِ ثقل پارلیمنٹ سے تاج کی طرف منتقل ہوگیا تھا اور تاج کو نظامِ حکومت میں ایک غالب حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اب اس دور میں پارلیمنٹ دوبارہ لنکسٹری عہد کی "محدود شاہی" کی طرف لوٹنا چاہتی تھی۔ لیکن تاج اس خود مختاری کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا

تھا جو عملاً اسے گزشتہ ایک صدی سے حاصل ہوگئی تھی۔ ان حالات میں تصادم ناگزیر تھا۔ نزاع اور اختلاف کی قدم قدم پر صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ اگرچہ یہ اختلاف موقتی مسائل سے نمٹنے کے طریقۂ کار پر تھا۔ لیکن اس کے پیچھے دراصل بنیادی سوال یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کا کون حقیقی حامل ہے؟ مملکت کے انصرام اور انتظام میں فیصلہ کن اختیار کس کو حاصل رہے گا؟ اس اقتدار و اختیار کے اس وقت تاج اور پارلیمنٹ دونوں مدّعی تھے۔ دونوں اپنے اپنے دعووں کی تائید میں تاریخ سے مدد لیتے تھے۔ سترھویں صدی کی اس کشمکش میں تاریخ کی طرف بار بار رجوع کیا گیا۔ تاریخ کی روشنی میں دستور کی جانچ پڑتال کی گئی۔ لیکن دونوں حریف تاریخ کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ اور دستوری قوانین کی تاویل وہ اپنے مطلب اور مقصد کی روشنی میں کرتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ تاریخ ان دونوں فریقوں کے درمیان کوئی دوٹوک فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پچھلی صدیوں میں جن قوانین کے ذریعہ سے پارلیمنٹ نے اپنے اختیارات میں توسیع اور تاج نے ان سے دست برداری حاصل کی تھی وہ بسا اوقات ایسے مبہم تھے کہ ان کی ایک سے زیادہ تاویلیں ہوسکتی تھیں۔ تاج کی جانب سے قانون کے لغوی مفہوم سے استنباط کیا جاتا تھا۔ اور پارلیمنٹ اس کے منطقی نتائج سے استدلال کرتی تھی۔ ایسا مباحثہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکتا تھا بلکہ اس سے دستوری نکات کی بحثیں بہت زیادہ الجھ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مباحثہ نے آخر کار مجادلے اور مقاتلے کا رنگ اختیار کرلیا۔

کلیسا اور پیورٹن

جیمز کے عہد کی پہلی نزاع کلیسائی انتظام کے بارے میں پیدا ہوئی۔ وہ الزبتھ کے مذہبی انتظام کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی اس کو گوارہ نہ تھی۔ لیکن پیورٹن اس مذہبی انتظام سے خوش نہیں تھے۔ انھوں نے الزبتھ کے عہد میں ہی اس کی مخالفت کرنا شروع کردی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کالوینی طرز کا انتہا پسندانہ پروٹسٹنٹ کلیسا قائم کیا جائے۔ یہ فرقہ الزبتھ کے آخری زمانے میں کافی ذی اثر ہوگیا تھا۔ پارلیمنٹ میں بھی اس کی نمائندگی کا تناسب بڑھتا جارہا تھا خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں یہ لوگ عوام میں مقبول ہوتے جارہے تھے۔ اگرچہ اس وقت بھی وہ اقلیت میں تھے مگر مذہبی جوش و خروش اور موثر تنظیم کی وجہ سے ان کا اثر و رسوخ بڑھتا جارہا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں جیمز کی آمد کا خیر مقدم کیا کیونکہ انھیں امید تھی کہ وہ ان کا دوست اور ہمدرد ثابت ہوگا۔ وہ دیکھتے تھے کہ اسکاٹ لینڈ کے طول و عرض میں کالون کی تعلیمات قبول کرلی گئی تھیں اور پریسبٹرین

(PRESBYTERIAN) کلیسا قائم کر دیا گیا تھا۔ اس لئے انہیں اُمید تھی کہ جیمز قدرتی طور پر ان کا ساتھ دے گا۔ اور انگلستان میں بھی پریسبیٹرین مذہب کی ترویج عمل میں آئے گی۔ کلیسا پر اساقفہ کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ جس کے لئے وہ الزبتھ کے عہد سے جدوجہد کر رہے تھے۔ انگلستان میں اس وقت جس پیورٹن فرقہ کو غلبہ حاصل تھا وہ پریسبیٹرین عقاید رکھتا تھا۔ ان کو الزبتھ کے انتظام سے کئی امور میں اختلاف تھا۔ وہ کلیسا کا نظم ونسق ری پبلیکن اصولوں پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ کلیسا کی آرائش و زیبائش کے سخت مخالف تھے۔ کتاب عبادت (PRAYER BOOK) کی مسدودی کے خواہاں تھے۔ عبادت میں انتہائی سادگی ملحوظ رکھنا چاہتے تھے۔ انگلستان کے کلیسا میں پادریوں کے لباس میں چغہ، قبا، اور دستار کے جو تکلفات برقرار رکھے گئے تھے ان کو وہ کیتھولک دور کی ناپسندیدہ یادگار سمجھتے تھے۔ ان چیزوں کو وہ مٹانے کے درپے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ "اسقفی نظام کلیسا (EPISCOPACY) کا خاتمہ چاہتے تھے جس میں اقتدار اساقفہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ الزبتھ ان کی مخالفت کی چنداں پروانہ کرتی تھی۔ اور حسب ضرورت ان کی سرکوبی کے لئے کورٹ آف ہائی کمیشن سے کام لیتی تھی۔ اس جبر و تخویف کی پالیسی سے اس نے ملک میں مذہبی اتحاد برقرار رکھا۔ سرکاری کلیسا سے اپنے اختلاف کے باوجود پیورٹن فرقہ بھی ایک بہتر مستقبل کی اُمید میں کلیسا سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا اور اس سے قطع تعلق نہیں کیا۔ کلیسا میں رہ کر وہ کلیسا کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔

ہیمپٹن کورٹ کانفرنس

جیمز کی آمد سے فائدہ اُٹھا کر پیورٹن پادریوں نے اصلاح کے تعلق سے ایک مبسوط عرضداشت اس کی خدمت میں پیش کی۔ جیمز نے اس پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس طلب کی یہ ہیمپٹن کورٹ کانفرنس کہلاتی ہے جس میں دونوں فریق (اساقفہ اور فرقہ پیورٹن) کے نمائندوں کو طلب کیا گیا تھا۔ جیمز نے جس کو اپنے عالم دین ہونے پر گھمنڈ تھا، اس کانفرنس کی صدارت کی۔ دوران کانفرنس میں پیورٹن نے جب اس بات کا مطالبہ کیا کہ "اسقفی نظام" کا خاتمہ کیا جائے تو برافروختہ ہو کر جیمز نے کہا کہ "آج اسقف نہیں تو کل بادشاہ نہیں"۔ اور اسی برافروختگی کے عالم میں کانفرنس برخواست کر دی۔

اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد پیورٹن فرقہ رفتہ رفتہ ملک میں حزب مخالف کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ مذہب اور سیاسیات دونوں میدانوں میں مذہبی مخالفت نے سیاسی رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ پیورٹن یہ جاننے لگے تھے کہ ان کے حسب مرضی کلیسائی انتظام اسی وقت قائم ہو سکتا ہے،

جب وہ سیاسی طور پر طاقتور ہوجائیں۔ اسی لئے انھوں نے اپنا زور سیاسی میدان میں دکھانا شروع کیا۔ شہروں میں اپنے رسوخ سے فائدہ اُٹھاکر وہ پارلیمنٹوں کی نشستوں پر قبضہ کرنے لگے۔ اور اس مقام سے حکومتِ وقت کی مخالفت کرنے لگے۔ پیورٹن فرقہ میں اگرچہ اکثریت پرسبٹیرین عقاید رکھنے والوں کی تھی۔ لیکن ان میں ایک اور ذیلی فرقہ بھی نمودار ہونے لگا تھا۔ یہ لوگ انڈی پنڈنٹس INDEPENDENTS کہلاتے تھے۔ اس جماعت کا بانی "براؤن (BROWN) نامی ایک شخص تھا جو الزبتھ کے عہد کا بڑا مذہبی عالِم تھا۔ اس نسبت سے یہ لوگ براونسٹ (BROWNISTS) بھی کہلاتے ہیں۔ انڈیپنڈنٹس بھی مروّجہ کلیسا کے کٹر مخالف تھے۔ مذہبی معاملات میں ان کی انتہاپسندی پرسبٹیرین جماعت سے کچھ آگے ہی تھی۔ لیکن ان دونوں میں کلیسا کے نظمِ حکومت کے بارے میں سخت اختلاف تھا۔ ان میں مذہبی رواداری زیادہ پائی جاتی تھی۔ پرسبٹیرین ایک ہمہ گیر قومی کلیسا کے وجود کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس سے انحراف ان کے لئے ناقابلِ قیاس تھا۔ وہ اپنے مذہبی اصولوں کی کامیابی کے لئے جبر اور جارحیت سے بھی کام لینے کے لئے تیار تھے۔ غرض وہ تنگ نظری میں اپنے حریف اینگلیکن (مروّجہ) کلیسا کے پیروؤں سے کم نہ تھے۔ لیکن انڈی پنڈنٹس فرقہ کے پیرو کلیسا کے لئے کسی ہمہ گیر قومی نظام کے قائل نہیں تھے۔ وہ ہر فرقہ کو بہ استثنائے رومن کیتھولک ضمیر کی آزادی دینے کے لئے تیار تھے۔ مذہب کے معاملے میں پروٹسٹنٹ فرقوں کی حد تک جبر کے وہ سخت مخالف تھے۔ اگرچہ یہ دونوں فرقے باہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن اسٹورٹوں کی شاہی مطلق العنانی کے رجحان اور کلیسا میں اسقفی نظام کے دونوں یکساں طور پر بدترین دشمن تھے۔

جیمز کو ان فرقوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ بجا طور پر ان کو وہ اپنے لئے خطرہ سمجھتا تھا۔ اسکاٹ لینڈ میں وہ پرسبٹیرین نظامِ کلیسا سے خوب واقف تھا جہاں کلیسا پر اسے شمہ برابر بھی اختیار حاصل نہ تھا۔ انگلستان کے انگلیکن نظام (مروّجہ سرکاری کلیسا) میں بادشاہ کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ جیمز کے مطلق العنانی کے جذبات کے لئے یہ بات بڑی تسلی بخش تھی۔ اصلاح کے بعد سے تاج اور کلیسا میں قدرتی طور پر ایک گٹھ جوڑ قائم ہوگیا تھا۔ اساقفہ اپنی ترقی کے لئے بادشاہ کی نظرِ کرم کے محتاج تھے۔ وہ دن جاچکے تھے جبکہ وہ بادشاہ کی مزاحمت کرسکتے تھے۔ اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے قابل تھے۔ اب ان کے مستقبل کا انحصار اس کی خوشنودی پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے برخلاف کلیسا بادشاہ کا نہ صرف موئد تھا بلکہ اس کی فرماں برداری میں اپنی خیر اور نجات دیکھتا تھا۔ اسی جذبۂ فرمانبرداری میں کلیسا نے "نظریۂ حقوقِ آسمانی" کی شدت سے تائید کرنا شروع کی اور اسے اپنے پیروؤں میں ایک

رکنِ دین بنا کر پیش کیا۔ اینگلیکن کلیسا میں شاہی اقتدار کی تائید کرنے والی ایک انتہا پسند پارٹی وجود میں آنے لگی جو ہائی چرچ پارٹی کے نام سے موسوم تھی۔ دائیں بازو کی یہ انتہا پسند پارٹی بائیں بازو کی پریسبیٹیرین اور انڈی پنڈنٹ پارٹیوں کے توڑ پر قائم ہوئی تھی۔ سترھویں صدی کی مذہبی اور سیاسی تاریخ درحقیقت ان پارٹیوں کے محاربات اور مناقشات کی ایک پیچیدہ داستان ہے۔

مالیاتی مسئلہ

مذہب سے ہٹ کر ایک دوسرا خاردار مسئلہ مالیاتی پالیسی کا تھا۔ سترھویں صدی میں حکومت کے کاروبار کی انجام دہی کے لئے وہ محاصل قطعاً ناکافی تھے جو پارلیمنٹ روایتاً تاج کے لئے منظور کرتی تھی۔ سکہ کی قیمت گھٹ گئی تھی۔ قیمتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں آمد و خرچ میں توازن پیدا کرنا یوں بھی مشکل تھا، اس پر جیمز نے اپنی فضول خرچی سے صورت حال کو اور پیچیدہ کر دیا۔ الزبتھ کے عہد سے ہی مالیات میں تنگی محسوس کی جانے لگی تھی۔ مگر الزبتھ انتہائی کفایت شعار واقع ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ وقتاً فوقتاً اس کو ہسپانیہ کے سیم و زر سے لدے ہوئے جہازوں کی لوٹ کا ایک معتدبہ حصہ مل جاتا تھا۔ اب یہ صورتیں باقی نہیں تھیں اور ان مالیاتی مشکلات کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ پارلیمنٹ اپنی مقررہ منظوریوں میں ایک حبۂ سیاہ کا اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کسی نے ان مشکلات کے بنیادی اسباب کی جانچ پڑتال نہیں کی اور نہ یہ محسوس کیا کہ واقعی خارجی اسباب کی بنا پر تاج کو حکومت چلانے کے لئے زیادہ رقم درکار ہوگی۔ قوم ان معاشی اسباب کو سمجھنے سے قاصر تھی کیونکہ قومی ذہن کی اس کے لئے تربیت نہیں ہوئی تھی۔ جب تاج نے ان مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے تحصیلِ محاصل کے ایسے ذرائع اختیار کئے جن کے جواز میں اشتباہ تھا تو ملک میں ایک دستوری نزاع کی صورت پیدا ہو گئی جس کے بعد میں بہت سنگین نتائج برآمد ہوئے۔

جیمز کی پہلی پارلیمنٹ

جیمز نے اپنی پہلی پارلیمنٹ ۱۶۰۴ء میں طلب کی۔ انتخابات کے سلسلے میں جیمز نے یہ حکم صادر کیا کہ صرف ایسے اشخاص منتخب کئے جائیں جن کے کردار کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔ پارلیمنٹ جب منتخب ہو گئی تو اس نے چانسری کے عہدہ داروں کے ذریعہ سے یہ تحقیق کروانی چاہی کہ انتخابات کے ضمن میں اس کے احکام کی کہاں تک بجا آوری ہوئی ہے۔ پارلیمنٹ نے اس کو اپنے اختیارات میں مداخلت

تصور کیا۔ اراکین پارلیمنٹ کی اہلیت اور انتخابات سے متعلق تمام تنازعات کی جانچ پڑتال کا اختیار مسلمہ طور پر صرف پارلیمنٹ کو حاصل تھا۔ اس لئے بادشاہ کے اس اقدام کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ اس طرح تاج اور پارلیمنٹ کے درمیان دستور کے تعلق سے ایک اصولی بحث چھڑ گئی۔ جیمز نے کہا کہ "پارلیمنٹ کے تمام حقوق اور اختیارات تاج کے عطا کردہ ہیں"۔ پارلیمنٹ کا یہ استدلال تھا کہ "حقوق اور اختیارات اس کو وراثتاً ملے ہیں جو اس سے کسی قیمت پر بھی چھینے نہیں جا سکتے"۔ جیمز کی پارلیمنٹ سے یہ پہلی جھڑپ تھی۔ یہ مسئلہ فی الوقت تو دب گیا لیکن اس سے قوم کے بدلے ہوئے مزاج کی غمازی ہوتی ہے۔

بیٹ کا مقدمہ

اسی اثنا میں جیمز نے مالی مشکلات کے مدنظر ترکی سے درآمد کئے جانے والے خشک انگوروں پر اپنے ذاتی اختیار سے کچھ زائد محصول عائد کیا (IMPOSITION)۔ یہ پارلیمنٹ کی منظور کردہ شرح پر بطور ایک اضافہ کے تھا۔ چونکہ یہ بلا منظوری پارلیمنٹ نافذ کیا گیا تھا۔ اس لئے اس کا جواز مشتبہ تھا۔ بیٹ نامی تاجر نے اس زائد محصول کے ادا کرنے سے انکار کیا۔ یہ مقدمہ عدالتِ خزانہ میں پیش ہوا۔ تاج کی جانب سے یہ استدلال کیا گیا کہ زمانہ ماسبق میں بھی بادشاہوں نے اس قسم کا زائد محصول عاید کیا ہے، اور اس کو کبھی خلافِ قانون تصور نہیں کیا گیا۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ تاج نے جب کبھی محصول کروڑگری میں اپنے اختیار سے ردوبدل کیا تھا تو اس کا مقصد اس کی اپنی ضروریات کے لئے اضافۂ محاصل نہیں تھا بلکہ یہ اقدامات عموماً قومی تجارت اور صنعت کے تحفظ کے لئے کئے جاتے تھے، یا اس غرض سے کہ بیرونی مقابلہ کی وجہ سے ملک کے مفادات کو نقصان نہ پہنچے لیکن جیمز کا مقصد اس وقت صرف محاصل میں اضافہ کرنا تھا جس کے لئے صریحاً اسے پارلیمنٹ کی منظوری ناگزیر تھی۔ بایں ہمہ حکامِ عدالت نے فیصلہ بادشاہ کے حق میں دیا۔ انھوں نے اس ٹیکس کو جائز قرار دیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ بلاشبہ تاج کے اختیاراتِ محصول اندازی پر تحدید عائد کی گئی ہے لیکن کوئی قانون ایسا نہیں وضع کیا گیا جس سے بیرونی درآمدات پر محصول عاید کرنے سے اسے روکا گیا ہو۔ یہ حق ہنوز برقرار ہے۔ اس فیصلہ میں تاج کے "غیر معمولی" اختیارات (PREROGATIVE) پر مبسوط بحث کی گئی تھی اور یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اس کے اختیارات ناقابلِ انتقال اور غیر محدود ہیں۔ اور کوئی ادارہ ان اختیاراتِ شاہی پر تحدید عاید نہیں کر سکتا۔ اس فیصلہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس عہد میں نظریہ

بہ حقوقِ آسمانی " سے ملک کا قانون داں طبقہ کس حد تک متاثر تھا۔ یہ اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ اس فیصلہ کی بنیاد مطلق العنان شاہی کے تصورات پر رکھی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ سترھویں صدی میں حکامِ عدالت اپنی بقا کے لیے بادشاہ کو ناخوش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ابھی وہ دن نہیں آئے تھے کہ عدلیہ آزاد ہو۔ ایک محکوم عدلیہ سوائے تاج کی فرماں برداری کے اور کیا کر سکتا تھا۔

اس مباحثہ کے ایک اور پہلو کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ تاج اپنے اختیارات کی تائید میں پچھلے قوانین کی تشریح و توضیح کو لغوی اور لفظی مفہوم کے تنگ دائرہ میں مقید رکھنا چاہتا تھا۔ وہ قوانین کو ان کے محدود ترین معنوں میں قبول کرتا تھا۔ لیکن فریقِ مقابل لفظوں کی بجائے قانون کی اسپرٹ اور اس کے منطقی نتائج سے اس کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر بنانا چاہتا تھا۔ سترھویں صدی میں دستور کے تعلق سے جتنی موشگافیاں ہوئیں اس میں طرفین تے سابقہ قوانین کی متضاد تاویلات سے اس مسئلہ کو پیچیدہ اور لاینحل بنا دیا۔ غرض جیمز نے اس فیصلہ کی روشنی میں متعدد اشیائے درآمد پر بھاری " زائد محصول " غیر مجاز (IMPOSITION) عاید کیا۔ اس طرح پارلیمنٹ کے سامنے گئے بغیر اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیا۔ پارلیمنٹ نے بارہا اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

اعلاناتِ شاہی

پارلیمنٹ نے اپنے آخری اجلاس میں اعلاناتِ شاہی (PROCLAMATIONS) کی پیہم اجرائی پر بھی اعتراض کیا جو قانون سازی کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر بادشاہ قانون بنانے کا مجاز نہیں تھا۔ اعلاناتِ شاہی کے بارے میں پارلیمنٹ کی شکایت پر جیمز نے چار ججوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تاکہ اس مسئلہ کے دستوری پہلوؤں کا جائزہ لے۔ اس کمیٹی نے بتایا کہ بادشاہ اپنے اعلان سے کوئی جدید[1] جرم قائم نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی جرم کی مقررہ سزاؤں میں وہ اضافہ کر سکتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر قانوناً کسی مقدمہ کی " عدالت اسٹار چیمبر میں پیشی کا لزوم نہیں ہے تو وہ اپنے اعلان کے ذریعہ سے ایسا لزوم پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ صرف نافذالوقت قوانین کے بارے میں یہ اعلان کر سکتا ہے کہ ان پر سختی کے ساتھ عمل کیا جائے۔ اس کمیٹی کے اظہارِ رائے کے بعد اس شکایت کا

---

[1] یعنی جو فعل کہ اعلان کے اجرا سے پہلے قانونِ ملک کی رو سے جرم نہیں تھا وہ بعد اجرائی اعلان جرم نہیں ہو سکتا۔

کسی حد تک ازالہ ہوا۔ گو کلیتہً اس کا سدباب نہیں ہوا۔

دوسری پارلیمنٹ

جیمز نے اپنی پہلی پارلیمنٹ سنہ 1611ء میں برخاست کر دی اور تقریباً تین سال تک کوئی پارلیمنٹ طلب نہیں کی لیکن تین سال بعد جب سنہ 1614ء میں دوسری پارلیمنٹ طلب کی گئی تو وہ صرف دو مہینوں میں برخاست کر دی گئی۔ کیونکہ اس نے انعقاد کے ساتھ ہی "امپوزیشنز" (ناجائز زائد محصول) کے خلاف ایک قرارداد پاس کی جس میں پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کسی محصول کے عائد کرنے کو دستور کے مغائر ٹھیرایا۔ جیمز پارلیمنٹ کے اس رویہ سے ایسا ناراض ہوا کہ فوراً اسے برخاست کر دیا۔ اس پارلیمنٹ نے نہ تو کوئی مالی منظوری دی اور نہ کوئی قانون پاس کیا۔

جیمز کے اب تک پارلیمنٹوں سے تعلقات ایسے خراب رہے تھے کہ اس نے سنہ 1621ء تک پھر کوئی پارلیمنٹ طلب نہیں کی۔ گویا عملاً اس نے دس سال تک بغیر پارلیمنٹ کے حکومت کی کیونکہ سنہ 1614ء کی پارلیمنٹ بغیر کوئی کام کئے برخواست ہوگئی تھی۔ اور بادشاہ کو کوئی مالی منظوری بھی نہیں دی تھی۔ ان حالات میں روپیہ کے حاصل کرنے کے لئے جیمز کو ایسے ذرائع اختیار کرنے پڑے جو قانوناً جائز نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ اس نے جبری قرضے لینے شروع کئے۔ جُرمانوں اور پُرانے قرضوں کو سختی سے وصول کیا جانے لگا۔ اعزازات اور خطابات فروخت کئے جانے لگے۔ بیرونٹ (BARONET) کا ایک نیا اعزاز وجود میں لایا گیا تاکہ اسے فروخت کر کے روپیہ بٹورا جائے۔ نذرانوں کی وصولی کا انتظام کیا گیا۔ یہ سب طریقے ایسے تھے جن پر ہمیشہ پارلیمنٹ نے اعتراض کیا تھا اور جن کا جواز دستوری نقطۂ نظر سے مشتبہ تھا۔

جیمز کی تیسری پارلیمنٹ

اسی اثنا میں یوروپ میں جنگ سی سالہ کا آغاز ہوا۔ (سنہ 1619ء) یہ جنگ جرمنی کی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ریاستوں کے درمیان شروع ہوئی۔ اس میں پروٹسٹنٹوں کا موقف بہت کمزور تھا۔ انگلستان کے لوگ اپنے ہم مذہب پروٹسٹنٹوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ نیز ان کو فریڈرک الکٹر آف پلاٹینٹ (FREDERICK ELECTOR OF PALATINATE) سے خصوصی دلچسپی تھی جو جیمز کی لڑکی الزبتھ کا شوہر اور جرمنی کی ایک پروٹسٹنٹ ریاست کا حکمران تھا۔ الزبتھ انگلستان میں

بہت ہر دلعزیز تھی ۔ فریڈرک کا تاج و تخت خطرہ میں تھا ۔ ان حالات میں انگلستان کی مداخلت کا امکان پیدا ہوگیا تھا ۔ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے جیمز نے اپنی تیسری پارلیمنٹ 1621ء میں طلب کی پارلیمنٹ نے فوجی تیاریوں کے لئے ایک معتدبہ رقم منظور کی ۔ گو اتنی نہیں جتنی کہ جیمز نے مانگی تھی ۔ اس مرتبہ رقم کی منظوری میں اس نے لیت و لعل سے کام نہیں لیا ۔ کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ پروٹسٹنٹوں اور فریڈرک کی حمایت میں فوری فوجی اقدام کیا جائے ۔

رقمی منظوریوں سے فراغت پانے کے بعد پارلیمنٹ بعض بدعنوانیوں کے دُور کرنے کی طرف متوجہ ہوئی ۔ جیمز کے عہد میں پچھلے چند برسوں سے اجارہ داری (MONOPLY) کے طریقہ کو بہت فروغ حاصل ہوگیا تھا ۔ اکثر عام ضروریات کی اشیاء کی فروخت کا انتظام کسی اجارہ دار کو دے دیا جاتا تھا اجارہ دار قیمتوں میں اضافہ کرکے خوب روپیہ بٹورتا اور حکومت کو ایک گرانقدر رقم اجارہ کے معاوضہ میں ادا کرتا تھا ۔ جیمز نے دیکھا کہ یہ روپیہ حاصل کرنے کا بہت آسان طریقہ ہے اور پارلیمنٹ کی دارو گیر سے بچنے کا بھی اس میں موقعہ نکل آتا ہے ۔ چنانچہ اس نے وسیع پیمانے پر اجاروں کے فروخت کرنے کا سلسلہ شروع کیا ۔ اس طریقہ سے اپنے لئے آمدنی کی ایک نئی صورت پیدا کرلی لیکن پارلیمنٹ ہمیشہ اس کو بُری نظر سے دیکھتی تھی اور اجاروں کی فروخت کو صریحاً ناجائز سمجھتی تھی ۔ الزبتھ کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ پیدا ہوا تھا ۔ پارلیمنٹ میں اس کے خلاف اس وقت بہت چیخ و پکار ہوئی تھی ۔ اب بھی پارلیمنٹ نے اس بدعنوانی کو روکنا چاہا ۔ فی الوقت اس کے خلاف کوئی قانون تو پاس نہیں کیا گیا لیکن اس انتظام کے ضمن میں جو بدعنوانیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو دُور کرنے کے لئے پارلیمنٹ نے تحقیقات کا آغاز کیا ۔

حقِ مواخذہ کی تجدید

اس تحقیقات کا اصلی مقصد تو بدعنوانیوں کا سدباب تھا ۔ لیکن اس سے ایک اہم دستوری نتیجہ برآمد ہوا ۔ وہ یہ کہ پارلیمنٹ کے حقِ مواخذہ کی تجدید ہوئی ۔ چودھویں صدی میں پارلیمنٹ نے یہ حق حاصل کرلیا تھا کہ وہ بدعنوانیوں کے مرتکب وزراء اور دیگر طاقتور اشخاص کا مواخذہ کرکے ان کو سزا دے ۔ ازمنہ وسطیٰ میں پارلیمنٹ نے اس ہتھیار کے ذریعہ سے تاج کو اپنے قابو میں رکھنے کا ایک ذریعہ دریافت کرلیا تھا ۔ مواخذہ کا بنیادی تصور یہ تھا کہ وزراء اور عمائدین سلطنت اپنے اعمال اور افعال کے لئے پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہیں ۔ باوصف اس کے کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے بادشاہ

کے ایما پر ہی کیوں نہ ہو۔ تاج کی غلط پالیسیوں کی سزا ان کو بھگتنی پڑتی تھی۔ پارلیمنٹ نے اس طرح تاج پر بالواسطہ کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ مواخذہ کی کارروائی میں دارالعوام مستغیث ہوتا اور دارالامراء عدالت کی حیثیت سے نشست کرتا تھا۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دارالامراء کو بحیثیت عدالت فوجداری اختیارات حاصل تھے۔ اور وہ کسی بھی فوجداری مقدمہ کی جو اس کے سامنے پیش کیا جائے سماعت کا مجاز تھا۔ دارالامراء فی الحقیقت "گریٹ کونسل" کا جانشین ہے۔ اس لحاظ سے کونسل کے فوجداری اختیارات کا وہ وارث ٹھیرا۔ اسی نسبت سے مواخذہ کا پارلیمنٹ کو اختیار حاصل ہو گیا تھا۔ اور چودھویں صدی میں بادشاہ اور اس کے وزراء اور عمائدین کے خلاف پارلیمنٹ کا ایک مسلّمہ دستوری حربہ بن چکا تھا۔ لیکن پندرھویں صدی کے نصف آخر سے پارلیمنٹ نے مواخذہ سے کام نہیں لیا تھا۔ کیونکہ اس دور میں تاج اور پارلیمنٹ میں کوئی تصادم نہیں تھا لہٰذا ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی کہ تاج کے خلاف اس اس ہتھیار کو استعمال کیا جائے۔ ان حالات میں مواخذہ کا ہتھیار کسی قدر زنگ آلود ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی اس حق کی تجدید اتفاقی اسباب کا نتیجہ تھی۔ پارلیمنٹ کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ مواخذوں کے ذریعہ سے جیمز یا اس کی حکومت کو مطعون کیا جائے۔ اصل میں "چھان بین" "اجارہ داری" کی بدعنوانیوں کی ہو رہی تھی۔ اس میں یہ پتہ لگا کہ دو اجارہ دار مم پیسن (MOMPESSON) اور مچل (MICHELL) بعض بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے ہیں ان کو سزا دینے کے لئے ان دونوں کا مواخذہ کیا گیا اور بھاری سزائیں بھی دی گئیں۔ لیکن تیسری پارلیمنٹ کے دوران سب سے اہم مواخذہ لارڈ بیکن کا تھا۔ یہ مشہور فلسفی لارڈ چانسلر کی حیثیت سے عدلیہ کا سربراہ اور پریوی کونسل کا ممبر تھا۔ اس پر رشوت ستانی کا الزام تھا۔ اس مواخذہ کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ یہ کارروائی تاج کے ایک وزیر کے خلاف کی گئی ہے۔ گو کہ اس میں بھی تاج کے اختیارات پر کوئی چوٹ منظور نہ تھی۔ جیمز کی چوتھی پارلیمنٹ نے وزیرِ خزانہ مڈل سکس کا مواخذہ کر کے اپنے اس حق کو مستحکم کر لیا کہ وہ وزراء کو ان کی بدعنوانیوں کی صورت میں سزا دینے کی مجاز ہے۔ آئندہ زمانے میں یہ حربہ تاج کے مقابلہ میں بہت کارگر ثابت ہوا۔

جیمز اور پارلیمنٹ کی کشمکش

پارلیمنٹ نے اپنے پہلے سیشن میں جو روپیہ منظور کیا تھا وہ کافی نہیں تھا۔ اور نہ وہ اس مسئلہ کی طرف فی الوقت کوئی توجہ دینا چاہتی تھی۔ وہ ہمہ تن بدعنوانیوں کے انسداد میں مشغول رہی۔ جیمز نے

کسی قدر ناراضی کے ساتھ اس کو چند مہینوں کے لئے ملتوی کر دیا۔ اور پھر نومبر میں دوبارہ طلب کر کے اس سے ایک بھاری رقم کا مطالبہ کیا۔ پارلیمنٹ یہ جانتی تھی کہ اگر روپیہ کے ہتھیار کو ہاتھ سے دیدے تو پھر وہ آگے کچھ نہ کر سکے گی۔ اس لئے کچھ رقم کی منظوری تو دے دی لیکن وہ اس قدر قلیل تھی کہ بادشاہ اپنی فوری ضروریات کے لئے پارلیمنٹ کا محتاج کا محتاج رہا۔ پارلیمنٹ کو اس وقت بادشاہ کی خارجہ حکمتِ عملی کے بارے میں سخت تشویش تھی۔ جیمز ایک عرصہ سے اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ اسپین سے قریبی تعلقات پیدا کرے۔ وہ اپنے لڑکے چارلس کی شادی اسپین کی شہزادی سے کرنا چاہتا تھا۔ یہ مجوزہ رشتہ انگریزوں کو سخت ناپسند تھا۔ اسپین کو وہ کیتھولک دنیا کا لیڈر سمجھتے تھے۔ اس سے پہلے میری کے زمانہ میں جو ازدواجی رشتہ قائم ہوا تھا اس کے بُرے نتائج سے وہ بے خبر نہیں تھے۔ اسپین سے دوستی کو وہ اپنی قومی آزادی اور پروٹسٹنٹ مذہب دونوں کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ لیکن جیمز اسپین سے بے حد مرعوب تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے داماد فریڈرک کی کوئی موثر فوجی امداد نہیں کی تھی۔ وہ اسپین سے دوستی قائم کر کے یورپ میں امن قائم کرنا چاہتا اور اس طرح فریڈرک کو اس کی ریاست واپس دلانا چاہتا تھا جو اس عرصہ میں اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ یورپ میں کیتھولکیوں کی کامیابیوں سے پارلیمنٹ بے حد خائف تھی۔ چنانچہ اس نے ایک عرضداشت پیش کی کہ ولی عہد کے لئے کسی پروٹسٹنٹ شہزادی کا انتخاب کیا جائے اور اسپین سے دوستی اور تحالف کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔ جیمز نے اس مشورہ کو اختیاراتِ شاہی پر ایک حملہ تصور کیا اور نہایت تند و تیز لہجے میں پارلیمنٹ کو آگاہ کیا کہ "رموزِ سلطنت میں وہ کسی بھی مداخلت کو سختی سے کچل دے گا۔" پارلیمنٹ نے اس برہمی کی پرواہ کئے بغیر دوسری عرضداشت پیش کی جس میں اس نے کہا کہ "اسے اظہارِ رائے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ نیز یہ کہ اس کے حقوق اور اختیارات اس کو اپنے بزرگوں سے وراثتاً ملے ہیں اور یہ اس کا ایک نہایت ہی قیمتی ورثہ ہے۔" پارلیمنٹ کا یہ تلخ و تند لہجہ اس کی خود اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے۔ اب وہ اس موقف میں تھی کہ بادشاہ کا ڈھٹائی سے مقابلہ کرے۔

جیمز نے اس کا تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ بلکہ پارلیمنٹ کے حقوق کو محض اپنی اور اپنے پیش روؤں کی بخشش قرار دیا۔ تاج اور پارلیمنٹ کے درمیان اس نوعیت کا دستوری مباحثہ آنے والے زمانے میں ایک شدید تصادم کی غمازی کر رہا تھا۔ پارلیمنٹ اب اتنی دلیر ہو گئی تھی کہ اس نے بڑے جوش و خروش سے ایک قرارداد منظور کی جس کو "احتجاج" (PROTESTATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں پارلیمنٹ نے صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ "پارلیمنٹ کے حقوق اختیارات اور اس کی آزادیاں اس

کا ناقابلِ تنسیخ ورثہ ہیں۔ اور یہ کہ اسے قومی زندگی کے ہر مسئلہ پر آزادانہ اظہار رائے کا حق حاصل ہے چاہے ان مسائل کا تعلق اُمورِ مملکت سے ہو۔ تاج سے ہو یا کلیسا سے " احتجاج " کی زبان نہایت سخت صاف اور غیر مبہم تھی۔ جیمز آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے پارلیمنٹ کو ملتوی کر دیا اور چند دن بعد " کتابچہ دارالعوام (— JOURNAL OF THE HOUSE OF COMMONS) طلب کر کے اراکین کونسل کی موجودگی میں اس کے اس صفحہ کو چاک کر دیا جس پر احتجاج درج کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ پارلیمنٹ برخواست کر دی گئی (جنوری سنہ 1622ء)۔ اور پارلیمنٹ کے بعض ممبروں کو قید کر دیا گیا۔

جیمز کی چوتھی پارلیمنٹ

جیمز کی چوتھی اور آخری پارلیمنٹ سنہ 1624ء کے اوائل میں طلب کی گئی۔ اس وقت جیمز اسپین کے خلاف جنگ کے لئے زیادہ آمادہ تھا۔ کیونکہ اسپین نے نہایت حقارت سے اس کی دوستی اور اتحاد کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ پارلیمنٹ بھی جنگ چاہتی تھی۔ اس نے ایک معتدبہ رقم کی منظوری دے دی۔ اس پارلیمنٹ کا اہم کارنامہ وزیر خزانہ لارڈ مڈل سکس کا مواخذہ ہے جس کا اس سے پہلے ضمناً ذکر آچکا ہے۔ اس نے " اجارہ داری " کے خلاف بھی قانون بنایا اور اس کو ناجائز قرار دیا۔ چند مہینوں کے بعد یہ پارلیمنٹ برخواست کر دی گئی اور خود جیمز کا سنہ 1625ء کے اوائل میں انتقال ہوگیا۔

چوتھا باب

شاہان اسٹورٹ (2)

چارلس اول اور دستوری کشمکش

چارلس کے نظریات حکومت

چارلس اول 1625ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا 23 سالہ عہد حکومت سکون اور چین سے یکسر خالی نظر آتا ہے۔ دستوری کشمکش جو اس کے باپ کے عہد میں شروع ہوئی تھی وہ اس کے زمانے میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ پارلیمنٹ اور تاج کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔ بظاہر مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ چارلس اپنے مزاج اور اُفتادِ طبع کے لحاظ سے اس قابل نہیں تھا کہ وہ پارلیمنٹ کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے یا مفاہمت کے لئے تیار ہو جائے۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ غیر لچکدار رویّہ اختیار کرتا رہا۔ وہ نہایت مغرور اور ضدی واقع ہوا تھا۔ قوم کے مزاج اور اس کے رجحانات کے سمجھنے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی۔ زیادہ تر اس کی نخوت اور اس کا تبختر اس کی بربادی کا موجب ہوا۔ انگریز قوم کے لئے یہ ایک آزمائش کا دور تھا۔ چارلس اور اس کے حواریین بڑی شدت کے ساتھ نظریہ حقوقِ آسمانی کے مویّد اور قائل تھے۔ وہ ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کے اختیاراتِ اعلیٰ پر کوئی پابندی یا تحدید عاید نہیں کی جاسکتی۔ جیمز کی طرح چارلس بھی یہ سمجھتا تھا کہ اس کا اقتدار دو قسم کا ہے۔ ایک معمولی' دوسرا غیر معمولی اور ما وری تحدید۔ معمولی اقتدار کی حد تک وہ پارلیمنٹ کی صلاح اور مشورہ ماننے کے لئے تیار تھا۔ اور اس کے ساتھ اشتراک اور تعاون کو ممکن سمجھتا تھا۔ لیکن اس سرحد سے پرے ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں اس کا اقتدار محیطِ کامل' اور ناقابلِ تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس اعلیٰ اقتدار میں وہ اپنا کسی کو شریک و سہیم بنانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ تصورات انگلستان کے صدیوں پرانے دستور اور قانون کے تصورات سے کسی طرح میل نہ کھاسکتے تھے۔ انگریز قوم بجز ایک خوشامدی اور شاہ پسند گروہ کے

ان تصورات کو کسی قیمت پر بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ منشورِ اعظم کے وقت سے اس کی مسلسل یہی کوشش رہی کہ بادشاہ اور رعایا دونوں ہی قانون کے پابند اور تابع رہیں۔ چارلس کے لئے ایسا خیال بھی اس کی جناب میں کفر سے کچھ کم نہ تھا۔ اقتداراتِ شاہی کے مسئلہ کو چارلس اور اس کے ساتھیوں نے جزوِ ایمان بنالیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چارلس کے عہد میں کسی مفاہمت یا سمجھوتے کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔

تخت نشینی کے وقت چارلس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اسپین سے جنگ کا تھا۔ چارلس کو اس مسئلہ سے ایک شخصی دلچسپی تھی۔ وہ اسپین سے اپنی ذلتوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اسپین کے دربار میں اس کی ناکامی اس کو خار کی طرح کھٹکتی تھی۔ اسی لئے اس نے فوراً پارلیمنٹ طلب کی اور جنگ کے لئے ایک بھاری رقم کا مطالبہ کیا۔ انگریز اسپین سے جنگ کا ہر وقت خیر مقدم کرنے تیار تھے وہ اسپین کو اپنا قومی دشمن سمجھتے تھے۔ اس لئے جب جیمز اور چارلس دونوں کی کوششوں کے باوجود اسپین نے بڑی حقارت کے ساتھ اس مجوزہ رشتہ کو ٹھکرادیا۔ اور خود شہزادہ چارلس، اسپین سے بغیر بیوی کے خالی ہاتھ آیا تو ملک میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور بڑے جشن ہوئے۔ یہ جیمز کے بالکل آخری دنوں کی بات تھی۔ اس وقت سے جنگ کی تیاریاں بھی ہونے لگی تھیں۔ اور پارلیمنٹ اس میں بہت پیش پیش تھی۔

جنگ سے اس قدر دلچسپی کے باوجود پارلیمنٹ کے سامنے روپیہ کی منظوری کا جب سوال آیا تو وہ ٹھٹھکی اور متامل نظر آئی۔ اس کو چارلس پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ اسٹورٹ بادشاہوں کی ذہنیت سے بھی وہ کچھ واقف ہوگئی تھی۔ وہ ایک ہی مرحلہ میں بھاری رقم منظور کرکے بادشاہ کو اپنی گرفت سے آزاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اور لوگ بھی اسپین سے مجوزہ رشتہ کے ٹوٹنے کی خوشی دیکھتے دیکھتے رنج اور افسوس میں بدل گئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ چارلس کا رشتہ فرانس کی شہزادی "ہنریاٹا ماریا" (HENRIETTA MARIA) سے طے پاچکا ہے۔ انگریز اسپین کے مقابلہ میں فرانس کو اتنا خطرناک دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ شاہی محل میں ایک رومن کیتھولک ملکہ راج کرے۔ انگلستان کے مذہب اور ان کی دستوری آزادیوں کے لئے یہ ایک ایسا کھلا خطرہ تھا، جس سے ہر کس و ناکس بجا طور پر خائف تھا۔ پارلیمنٹ نے روپیہ کی منظوری کے سوال کو پسِ پشت ڈال دیا۔ وہ بادشاہ سے اس بات کا تیقن حاصل کرنا چاہتی تھی کہ جسدِ مملکت میں جہاں جہاں بدعنوانیاں اور خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کا ازالہ کردیا جائے گا۔ اس بارے میں اس نے ایک قرارداد بھی منظور کی۔ چارلس کو پارلیمنٹ کی یہ سرد مہری اور بےحسی اس قدر ناگوار گزری کہ اس نے اسے برخواست کردیا۔

لیکن پارلیمنٹ کے بغیر کوئی مفر نہیں تھا۔ پچھلی پارلیمنٹ نے ایک حیثیت سے یا بھی منظور نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ ٹینیج اور پونڈیج کی منظوری بھی نہیں دی گئی تھی جو عموماً ہر بادشاہ کو اس کی پہلی پارلیمنٹ اس کے لئے تا حیات منظور کرتی ہے۔ ان حالات میں جنگ تو درکنار حکومت کے معمولی اخراجات کی ادائیگی بھی ناممکن تھی۔ اس لئے چارلس نے طوعاً وکرہاً دوسری پارلیمنٹ طلب کی جو اوائل 1626ء میں منعقد ہوئی۔

بکنگھم کا مواخذہ

اگر بادشاہ کو یہ امید تھی کہ یہ پارلیمنٹ اس کی زیادہ ہمدرد و ہمنوا ہوگی تو یہ امید بہت جلد خاک میں مل گئی۔ کیونکہ یہ پارلیمنٹ پچھلی پارلیمنٹ سے زیادہ سخت نکلی۔ اس نے سب سے پہلا وار ایک ایسے شخص پر کیا جو چارلس کو بے حد عزیز تھا۔ جیمز کے عہد سے یہ شکایت چلی آرہی تھی کہ حکومت کی مشینری پر ایک نا اہل اور ناقابل اعتبار آدمی چھایا ہوا ہے جس کی نا اہلی، عشرت پسندی اور عدم صلاحیت کی وجہ سے ملک کے مفادات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ ڈیوک آف بکنگھم تھا جو جیمز اور چارلس دونوں کا منظور نظر تھا۔ پارلیمنٹ اس کو ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار گردانتی تھی جو پچھلے چند برسوں سے ملک میں پیدا ہوگئی تھیں۔ چارلس کا وہ قریب ترین دوست، معتمد علیہ اور مشیر تھا۔ خارجہ پالیسی کی تمام غلط کاریاں اور تباہیاں پارلیمنٹ کے نزدیک اسی شخص کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھیں۔ وہ نہ صرف اس کو اس مقام سے ہٹانا چاہتی تھی جہاں وہ فائز تھا بلکہ اس کو سزا دینے کی بھی خواہاں تھی۔ اس لئے دارالعوام نے اس کے مواخذہ کی کارروائی کا آغاز کیا۔

وزرا کی ذمّہ داری

چارلس کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اس نے صاف طور پر یہ اعلان کیا کہ وہ کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ پارلیمنٹ ایسے عمائدین اور ارکین سلطنت پر ہاتھ ڈالے جو اس کے اعتماد کے حامل ہیں یا جنھیں اس کا تقرب حاصل ہو۔ پارلیمنٹ کو اس نے یہ بھی جتایا کہ اس کا اہم فریضہ صرف روپے کی منظوری دینا ہے اور یہ کہ اس کی طلبی، برخواستگی اور اس کے اجلاسوں کا جاری رہنا تمام تر اسی کی مرضی پر منحصر ہے لیکن پارلیمنٹ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ اور اپنا کام جاری رکھا۔ اس مقدمہ کی تیاری اور دارالامرا میں اس کی پیش کشی کا کام سر جان ایلیٹ اور سر ڈڈلے ڈگس کے سپرد تھا۔

دارالعوام کے یہ دونوں بڑے جیالے لیڈر تھے۔ وہ شاہی رعب و داب سے خائف ہونے والے نہ تھے۔ امرا کے سامنے جب یہ مقدمہ پیش ہوا تو ان دونوں نے اس موقعہ پر جو تقریریں کیں ان سے دستور کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ سر ڈڈے نے کہا کہ "بادشاہ کی ذات قصور و خطا سے بالاتر ہے" لہٰذا اگر مملکت میں کچھ خرابیاں یا بدعنوانیاں پیدا ہوتی ہیں تو ان کی ذمہ داری کلیتہً اس کے وزیروں پر ہے۔ لہٰذا ان کو اپنی غلط کاری کی سزا ملنی چاہیئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر بالفرض بادشاہ نے کوئی ایسا حکم دیا تھا جو انگلستان کے دستور اور قانون کے مغائر تھا تو ڈیوک آف بکھنگم کا یہ فریضہ تھا کہ اس پر عمل کرنے سے وہ انکار کر دیتا۔ بادشاہ کو صحیح مشورہ دیتا اور اس کو اس غلطی سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ چونکہ اس نے اپنے اس فریضہ کی بجاآوری میں کوتاہی برتی ہے لہٰذا وہ خاطی ہے اور سزا کا ہر طرح مستحق"۔ ان الفاظ میں دستور انگلستان کے ایک بنیادی تصور پر روشنی پڑتی ہے۔ سترھویں صدی میں بھی یہ تصور پیدا ہو چکا تھا کہ "بادشاہ سے کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا"۔ جس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ حکومت کی پالیسیوں کی تمام تر ذمہ داری وزرا پر ہے۔ چاہے ان پالیسیوں کو بنانے اور نافذ کرنے میں بادشاہ کا ہاتھ ہی کیوں نہ ہو۔ پارلیمنٹ چونکہ راست بادشاہ پر حملہ کرنا خلاف مصلحت سمجھتی تھی اس لئے اس کی غلط پالیسیوں سے اس کو روکنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اس کے وزرا کو ان کے ہر کردہ اور ناکردہ گناہ کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے۔ وزرا بادشاہ کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔ ان پر اگر پارلیمنٹ کنٹرول حاصل کرے تو بالواسطہ بادشاہ پر کنٹرول حاصل ہو سکتا تھا۔ چارلس نے بکھنگم کی برات میں یہی کہا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ احکام شاہی کی متابعت میں کیا ہے لیکن پارلیمنٹ اس عذر کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ بادشاہ کی ہر غلطی کی سزا اس کے وزیروں کو دینا چاہتی تھی۔ "مواخذہ" اسی معنی میں پارلیمنٹ کا بادشاہ کے خلاف ایک موثر ہتھیار تھا۔

چارلس ان تقاریر سے ایسا برافروختہ ہوا کہ سر جان ایلیٹ اور سر ڈڈے ڈگس کو قید کر دیا۔ اس پر ایوان نے متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی کہ جب تک اس کے یہ لیڈر رہا نہ کئے جائیں وہ کوئی کام انجام نہ دے گا۔ مجبوراً بادشاہ نے ان دونوں کو رہا کر دیا۔ اس کے باوجود دارالعوام کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس نے ایک اور قرارداد منظور کی کہ ٹیج اور پونڈیج کی تحصیل اس کی منظوری کے بغیر ناجائز ہے۔ چارلس کے لئے اب بکھنگم کو بچانے کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں تھی کہ پارلیمنٹ کو برخواست کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ دوسری پارلیمنٹ بھی ایک پیسہ کی منظوری دیئے بغیر ختم ہو گئی۔

غیر دستوری ذرائع آمدنی

چارلس کی مشکلات دن بدن بڑھتی جارہی تھیں۔ اسپین کی جنگ ہی کیا کم مصیبت تھی کہ فرانس کے ساتھ ایک نیا قضیہ کھڑا ہوگیا یہ محض بکھنگم اور چارلس کی حماقتوں کا نتیجہ تھا۔ جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ جنگ کا انتظام کیا جائے تو کیسے؟ چارلس مجبوراً روپیہ کی فراہمی میں دستور کی خلاف ورزی کرنے لگا۔ ٹینج اور پونڈیج کی تحصیل بلا منظوری پارلیمنٹ جاری رہی۔ نذرانے طلب کئے جانے لگے اور ان کے معاوضہ میں پریوی سیلس (PRIVY SEALS) اجراء ہونے لگیں۔ جبری قرضوں کی مانگ شروع ہوئی۔ اس کی شکل ایک مستقل ٹیکس کی بنادی گئی۔ لوگ اس سے سخت ناراض تھے۔ ان سب طریقوں کے استعمال کے باوجود بہت کم روپیہ وصول ہورہا تھا۔ ملک میں بددلی کی لہر پیدا ہوچلی تھی۔ شاہی عدالت کے ججوں نے بادشاہ کے اس مطالبہ کو مسترد کردیا کہ جبری قرضوں کی وصولی کو وہ جائز قرار دیں۔ امراء اور شرفاء جو اس رقم کو دینے سے انکار کرتے تھے۔ انھیں جیل میں ٹھونسا جانے لگا۔ اور "مارشل لاء" سے وسیع پیمانے پر کام لیا جانے لگا۔ عوام پر فوجیوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو اس غرض سے مسلّط کیا جانے لگا کہ وہ ان کے اخراجات کا انتظام کریں۔

پانچ نائٹوں کا مقدّمہ

ان بدعنوانیوں کے ضمن میں ایک اہم مقدمہ شاہی عدالت کے سامنے آیا۔ ڈارنل نامی ایک نائٹ اور اس کے چار ساتھی "جبری قرضہ کی عدم ادائی کی علت میں نظر بند کردیئے گئے تھے۔ یہ قضیہ پانچ نائٹوں کے مقدمہ کے نام سے موسوم ہے۔ محروسین نے "رہائی از حبس بے جا" کی درخواست پیش کی۔ اس درخواست کے ضمن میں ان کا استدلال یہ تھا کہ ان کا حراست میں رکھا جانا غیر قانونی ہے۔ کیونکہ ان سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا ہے۔ اور نہ ہی حکومت نے اسباب حراست سے انھیں واقف کرایا ہے۔ وکلائے سرکار کا استدلال یہ تھا کہ بادشاہ مصالح ملکی کے مدنظر بلا اظہار وجوہ کسی کو بھی نظر بند رکھ سکتا ہے۔ بادشاہ کے اس حق سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ اور پچھلے دور میں اس نوع کی متعدد نظیریں پائی جاتی تھیں۔ مگر یہاں جو بات سب پر عیاں تھی، وہ یہ تھی کہ چارلس کا یہ اقدام مصالح ملکی پر نہیں بلکہ اس کی اس کوشش پر مبنی تھا کہ ملک میں ایک جابرانہ اور غیر دستوری حکومت قائم کی جائے۔ عدالت نے محروسین کو رہا کرنے سے انکار کردیا۔ فیصلہ بادشاہ کے حق میں ہوا۔

یہ بات دوبارہ جتانے کے قابل ہے کہ عدالتیں اس عہد میں آزاد نہیں تھیں۔ نیز یہ کہ قانون دان طبقہ قانون کی تاویل میں نہایت تنگ نظری سے کام لیتا تھا۔ اس سے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ شخصی آزادی کا عظیم قومی ورثہ تاج کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہے گا۔

چارلس پیسہ کے لئے تنگ ہوا جا رہا تھا۔ متذکرہ دستوری خلاف ورزیوں کے باوجود وہ بہت کم روپیہ حاصل کرسکا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی تیسری پارلیمنٹ مارچ سنہ 1628ء میں طلب کی۔ یہ پارلیمنٹ ایسے حالات میں منتخب ہوئی جب کہ قوم میں تاج کے رویّہ سے ایک عام تشویش پیدا ہوگئی تھی۔ پچھلے چند برسوں کے تجربات نے قوم کو ان خطرات سے آگاہ کردیا تھا جو اس دستوری کشمکش میں مضمر تھے۔ پارلیمنٹ اب غیر قانونی حکومت کے سدباب کے لئے زیادہ کمربستہ نظر آرہی تھی۔ اس نے بادشاہ کے رقمی مطالبات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اور اپنی شکایات کے ازالہ کو اولیت دی۔ چارلس کی مطلق العنانی نے جن جن سمتوں میں قوم کی آزادیوں کو مجروح کیا تھا ان کے سدباب کے لیے دستوری راستے تلاش کئے جانے لگے

عرضداشت حقوق سنہ 1628ء

ابتداءً دارالعوام ایک قانون (STATUTE) کے ذریعہ سے بادشاہ کی حالیہ خلاف ورزیوں اور بے راہ رویوں کو روکنا چاہتا تھا لیکن چارلس نے کھلے طور پر واضح کردیا کہ وہ کسی قانون کی منظوری نہیں دے گا۔ اس لئے پارلیمنٹ نے اپنی شکایات کو ایک عرضداشت کی شکل میں تیار کیا۔ منظوری کی صورت میں اگرچہ اس کی حیثیت قانونِ موضوعہ کی تو نہ ہوتی البتہ عدالتیں اس کو بطور ایک "جوڈیشل ریکارڈ" کے تسلیم کرتیں۔ اور اس کی پابندی ان پر لازم ہوتی۔ "عرضداشتِ حقوق" ایک اہم دستوری دستاویز ہے۔ اس کے ذریعہ سے یہ کوشش کی گئی کہ خصوصی شاہی اختیارات (PREROGATIVE) کو قانون کے دائرہ میں لایا جائے۔ تاج سے پارلیمنٹ کی طرف اقتدارِ خصوصی کی منتقلی کا یہ پہلا زینہ ہے۔ اس میں بادشاہ کو جن افعال سے روکا گیا تھا ان کا تعلق اس کے "اقتدارِ خصوصی" سے سمجھا جاتا ہے۔ اس اقتدارِ خصوصی کو بادشاہ قانون کی سطح سے بالاتر سمجھتے تھے۔ اب یہ کوشش کی گئی کہ اس کو اس سطح پر لایا جائے جہاں "قانون" بادشاہ سے بالاتر ہے۔ اب تک تاج ان اختیارات سے بلا کسی مزاحمت کے کام لیتا رہا تھا۔ مگر اب پارلیمنٹ کو اصرار تھا کہ بادشاہ کا ہر فعل قانون کے دائرہ میں ہو۔ عرضداشتِ حقوق میں صرف ان ہی شکایات کے سدباب کا مطالبہ کیا گیا تھا جن سے قوم سخت

ناراض اور نالاں تھی۔ بادشاہ نے جن جن سمتوں میں اپنی دست درازیوں سے دستوری آزادی میں رخنے ڈالے تھے ان کا بند کرنا منظور تھا۔ دارالعوام نے بڑے جوش و خروش سے اسے منظور کیا۔ دارالامراء نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی۔ لیکن کسی قدر تامل اور جھجک کے ساتھ۔ چارلس نے ابتداءً کچھ ٹال مٹول سے کام لیا لیکن یہ دیکھ کر کہ پارلیمنٹ اس پر مُصر ہے بالآخر اس نے منظوری دے دی۔ (1628ء)۔

عرضداشت نے بادشاہ کو جن امور میں پابند کیا تھا وہ یہ تھے :

۱۔ کسی قسم کا ٹیکس بلا منظوری پارلیمنٹ عاید نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ کسی شخص کو قانونی طریقۂ کار کے بغیر نہ گرفتار کیا جائے گا اور نہ حراست میں رکھا جائے گا۔

۳۔ سپاہیوں کی سربراہی کا بار عوام پر نہ ڈالا جائے گا۔

۴۔ سیول نظم و نسق میں مارشل لا کے ذریعہ سے کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔

اس عرضداشت کی منظوری کو پارلیمنٹ بجا طور پر اپنی کامیابی سمجھتی تھی اور شاید اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ بادشاہ کی چیرہ دستیوں کی آئندہ کے لئے بڑی حد تک روک تھام ہو گئی ہے۔ اسی مسرت اور اطمینان کے زیرِ اثر چارلس کے لئے ایک معتدبہ رقم کی منظوری دی گئی۔ لیکن یہ ہم آہنگی کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ اختلافات کے پیدا ہونے میں دیر نہیں لگی۔ پارلیمنٹ نے بڑی حیرانی اور پریشانی سے یہ دیکھا کہ مذہب میں ایسے رجحانات کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے، جو کیتھولک عقاید اور پاپائیت میں رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان رجحانات کی علمبرداری ہائی چرچ پارٹی کر رہی تھی۔ اس پارٹی کے اثر و رسوخ کو پارلیمنٹ کی اکثریت پروٹسٹنٹ مذہب کے لئے خطرہ سمجھتی تھی۔ چارلس کا اس پارٹی سے بہت قریبی گٹھ جوڑ تھا۔ ایک اور بات جو وجہ اختلاف ہوئی وہ ٹنیج و پونڈیج کا مسئلہ تھا۔ چارلس اس محصول کو پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر برابر وصول کئے جا رہا تھا۔ ان بدگمانیوں کے پس منظر میں بادشاہ نے جب دارالعوام کے اجلاس کے ملتوی کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ٹنیج اور پونڈیج کے بارے میں کوئی اقدام نہ کر سکے، تو ایوان میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ "التواء" کا حکمنامہ نکل چکا ہے۔ اسپیکر اس بنا پر اپنی کرسی چھوڑ کر ایوان کی کارروائی کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اراکین نے ایوان کے دروازے بند کر دیئے تاکہ شاہی ہرکارے التواء کا حکم لے کر اندر داخل نہ ہو سکیں۔ دو ممبروں نے آگے بڑھ کر اسپیکر کو زبردستی کرسی پر بٹھائے رکھا۔ اور بڑے جوش و خروش کے عالم میں یہ قراردادیں منظور کی گئیں کہ :

۱۔ مذہب میں پاپائی طرز کی تبدیلیاں لانا۔

(2) اور بلا منظوری پارلیمنٹ ٹنیج وپونڈیج کی تحصیل ناجائز اور مذموم ہے۔ اور یہ کہ
(3) جو شخص کوئی ایسا محصول ادا کرے جس کی پارلیمنٹ نے منظوری نہیں دی ہے وہ
قوم کا دشمن سمجھا جائے گا۔

چارلس کی غیر دستوری حکومت

اس ڈرامائی واقعہ کے بعد یہ ظاہر ہوگیا کہ چارلس اور پارلیمنٹ کے درمیان کوئی نباہ ممکن نہیں۔ ملک میں ایک شدید جذباتی کیفیت پیدا ہوگئی تھی جو آنے والے انقلاب کا پتہ دے رہی تھی۔ چارلس اپنی حد تک یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اب پارلیمنٹ کے بغیر حکومت کرے گا۔ چنانچہ چند ہی دن بعد اس نے یہ پارلیمنٹ برخواست کردی۔ (1629ء)۔ اور اس کے لیڈروں کو قید کر دیا جن میں سر جان ایلیٹ بھی تھا۔ ایلیٹ کا قید کی حالت میں 1632ء میں انتقال ہوا اور اس کے دوسرے ساتھی اس وقت تک رہا نہ ہو سکے جب تک 1640ء میں چارلس پارلیمنٹ کے طلب کرنے پر پھر سے مجبور نہیں ہوگیا۔ چارلس نے پارلیمنٹ کی تحلیل کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ آئندہ پارلیمنٹ کے بلانے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے گیارہ سال تک کوئی پارلیمنٹ طلب نہیں کی۔ یہ "جابرانہ حکومت" کا دور کہلاتا ہے۔ سب سے اہم مسئلہ اس سلسلہ میں روپیہ کی فراہمی کا تھا۔ پچھلی پارلیمنٹ نے جو کچھ منظوریاں دی تھیں وہ قطعاً ناکافی تھیں۔ اب حکومت کے چلانے کے لئے سوائے اس کے کوئی صورت نہیں تھی کہ ایسے ذرائع تلاش کئے جائیں جن سے کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول ہوتا رہے۔ "عرضداشت حقوق" نے ٹیکس پر جو تحدیدات عائد کی تھیں اس میں خصوصیت کے ساتھ "نذرانوں" اور "جبری قرضوں" کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس واضح امتناع کی وجہ سے "تاج" کی آمدنی کا ایک بہترین ذریعہ بند ہو چکا تھا۔ کھلے طور پر اس کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی تھی۔ چارلس اور اس کے مشیروں نے ان حالات میں ایسے پرانے قوانین کو زندہ کرنے کی کوشش کی جن پر امتداد زمانہ کی وجہ سے عمل نہیں ہو رہا تھا۔ یہ اس لئے کہ یہ قوانین موجودہ حالات میں از کار رفتہ ہوگئے تھے، گو کہ ان کو منسوخ نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا ان سے کسی حد تک استفادہ کا امکان تھا۔ اور کچھ آمدنی کے ذرائع ان کی تجدید سے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ نیز یہ کہ چارلس عرضداشت حقوق کو منظور کرنے کے باوجود ایمانداری سے اس پر عمل پیرا ہونے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ قانون اور دستور سے راست متصادم ہونے کی بجائے ان کی ایسی

تنگ لفظی تاویلیں کرتا تھا جو قانون کے منشا کے یقیناً خلاف تھیں۔ اس قسم کی لفظی موشگافی سے قانون کی گرفت سے آزاد ہونے میں کسی قدر مدد ملتی تھی۔

اجارہ داری کے طریقہ کا دوبارہ احیاء کیا گیا۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے اجارے اشخاص کی بجائے کارپوریشنوں اور کمپنیوں کو دیئے جانے لگے۔ جس کا جواز قانون کے بعض الفاظ سے حاصل کیا گیا تھا۔ ہنری سوم کے عہد کے بھولے بسرے قانون کی تجدید کی گئی۔ اس کو "لزوم اسلحہ" (DISTRAINT OF KNIGHTHOOD) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اس عہد میں ہر ایسے شخص پر جو بیس پونڈ سالانہ مالیت کی زمین رکھتا ہو یہ لازم گردانا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ضروری اسلحہ سے لیس اور تیار رکھے تاکہ ضرورت کے وقت حکومت کی فوجی خدمت بجالاسکے۔ کم و بیش چار سو سال کے بعد اس قانون کی تجدید مضحکہ خیز تھی کیونکہ جن حالات سے نمٹنے کے لئے یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا اب ان کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ لیکن چارلس کو تو صرف روپیہ حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکالنا منظور تھا۔ اس قانون پر سختی سے جب عمل درآمد ہونے لگا تو لوگ اس کی زد سے بچنے کے لیے حکومت کو کچھ روپیہ بطور تاوان ادا کر دیتے اور اس سے نجات حاصل کرتے تھے۔ اس دور میں اگرچہ زمین کی مالیت کو بیس پونڈ سے بڑھا کر چالیس پونڈ کر دیا گیا تھا پھر بھی اس سے ایک وسیع لیکن کمتر معاشی حیثیت کا طبقہ متاثر ہو رہا تھا۔

قدیم قوانین جنگلات پر سختی سے عمل کیا جانے لگا۔ جن لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ شاہی اراضی پر کسی پچھلے زمانہ میں قبضہ کر لیا تھا ان کے قبضے ان قوانین کے تحت برخواست کئے جانے لگے یا پھر ان کو اپنی ملکیت کے ثابت کرنے کے لئے دستاویزات پیش کرنے پڑتے تھے۔ صدیوں پرانے دستاویزات کی فراہمی آسان نہ تھی۔ جو لوگ ان دستاویزات کی پیش کشی سے قاصر تھے ان پر بھاری جرمانے عاید کئے جانے لگے۔ بلا منظوری پارلیمنٹ ٹنیج و پونڈیج کی وصولی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی ابتداء کچھ مخالفت ہوئی لیکن چارلس باز نہیں آیا۔ بلکہ محاصل کروڑگری کی مقررہ شرح پر زاید محصول (IMPOSITION) اپنے ذاتی اختیار سے وصول کرنے لگا جس کے جواز کے بارے میں اس سے پہلے بہت بدمزگیاں پیدا ہوئی تھیں۔

زرِ سفینہ ۔۔۔۔۔ (SHIP MONEY)

آمدنی کے ذرائع کو وسعت دینے کے لئے جو تلاش اور تفحص جاری تھا اس میں محصول

زرِ سفینہ ایک نہایت ہی منفعت بخش ذریعہ ثابت ہوا۔ چارلس نے سب سے پہلے سنہ 1626ء میں اسپین سے جنگ کے سلسلے میں اس قدیم محصول کا احیا کیا تھا۔ اس محصول کی تاریخ قرونِ وسطیٰ بلکہ اس سے پہلے کے زمانہ تک پہنچتی ہے۔ عموماً بیرونی حملہ کے خطرہ کی صورت میں یہ ٹیکس ساحلی اضلاع کے شہروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ توقع یہ کی جاتی تھی کہ اضلاع ایک مناسب اور مقررہ تعداد میں جنگی جہازوں کی فراہمی کا انتظام کریں گے۔ اس قسم کے مطالبہ کو دستور یا قانون کے مغائر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ تصوّر یہ تھا کہ اپنی سلامتی اور تحفّظ کے لئے ملک کے دفاع میں اپنا حصّہ ادا کرنا سب کا ایک ناگزیر فریضہ ہے۔ اضلاع کسی زمانے میں اپنے تجارتی بیڑہ کے جہازوں کو جنگی جہازوں میں تبدیل کرکے حکومت کے حوالے کر دیتے تھے۔ لیکن بعد میں جب ایسی تبدیلی آسانی سے ممکن نہ رہی تو ان سے جہاز کے معاوضہ میں ایک مقرّرہ ٹیکس کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ غرض یہ ٹیکس ایک قدیم عملدرآمد پر مبنی تھا اور شاہانِ ماسلف اس سے حقیقی ضرورت کے وقت استفادہ کرتے تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کو کبھی ایک مستقل ٹیکس نہیں بنایا گیا۔ اور مقرّرہ محاصل کی فہرست میں اس کے شمول کا تصوّر تک نہیں تھا۔ چارلس اور اس کے مشیر جو اس قسم کے قدیم ذرائع آمدنی کی تلاش میں سرگرداں تھے اسے اپنی مالی مشکلات کا بہت اچھا حل سمجھنے لگے۔

سنہ 1634ء میں پہلی مرتبہ اس ٹیکس کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن یہ مطالبہ صرف ساحلی اضلاع تک محدود تھا۔ لندن کے تاجروں نے کچھ احتجاج ضرور کیا لیکن حکومت کے لئے نتائج بہت ہمّت افزا رہے۔ سنہ 1635ء میں اس کو وسعت دی گئی اور بلا تخصیص تمام اضلاع سے اسے وصول کیا گیا۔ اس کامیابی نے چارلس کے حوصلے بہت بلند کر دیئے۔ سنہ 1636ء میں پچھلے سال کی طرح پورے ملک پر یہ ٹیکس عاید کیا گیا۔ استدلال یہ تھا کہ قومی دفاع کے لئے ایسے وقت میں جبکہ بیرونی خطرات سر پر منڈلا رہے ہوں ایک طاقتور بحریہ ازبس ضروری ہے۔ اس کی فراہمی میں ہر شخص کو حصّہ لینا چاہیے۔ لہٰذا اس بار کا پورے ملک پر ڈالا جانا عین قرینِ انصاف ہے۔ مگر لوگ اس کو محسوس کئے بغیر نہیں رہے کہ چارلس دراصل اس بہانے سے ٹیکسوں کے حصول کا وہ ذریعہ نکالنا چاہتا ہے جو پارلیمنٹ کی محتاجی سے اسے آزاد کر دے۔ اس طرح وہ انگلستان کے آئین و دستور کے برخلاف اپنی جابرانہ حکومت جاری رکھنے کا خواہاں ہے۔ اگر چارلس اور اس کے مشیر واقعی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو انگلستان کے دستور کو خیرباد کہہ دینا پڑے گا۔ اس کا نام و نشان ہی مٹ جائے گا اور اس کی جگہ ایک ایسی مطلق العنان خودسر شخصی حکومت قائم ہو جائے گی جس میں قوم کے تعاون و اشتراک کا

تنگ لفظی تاویلیں کرتا تھا جو قانون کے منشار کے یقیناً خلاف تھیں۔ اس قسم کی لفظی موشگافی سے قانون کی گرفت سے آزاد ہونے میں کسی قدر مدد ملتی تھی۔

اجارہ داری کے طریقہ کا دوبارہ احیار کیا گیا۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے اجارے اشخاص کی بجائے کارپوریشنوں اور کمپنیوں کو دیئے جانے لگے۔ جس کا جواز قانون کے بعض الفاظ سے حاصل کیا گیا تھا۔ ہنری سوم کے عہد کے بھولے بسرے قانون کی تجدید کی گئی۔ اس کو "لزوم اسلحہ" (DISTRAINT OF KNIGHTHOOD) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اس عہد میں ہر ایسے شخص پر جو بیس پونڈ سالانہ مالیت کی زمین رکھتا ہو یہ لازم گردانا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ضروری اسلحہ سے لیس اور تیار رکھے تاکہ ضرورت کے وقت حکومت کی فوجی خدمت بجالاسکے۔ کم وبیش چار سو سال کے بعد اس قانون کی تجدید مضحکہ خیز تھی کیونکہ جن حالات سے نمٹنے کے لئے یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا اب ان کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ لیکن چارلس کو تو صرف روپیہ حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکالنا منظور تھا۔ اس قانون پر سختی سے جب عمل درآمد ہونے لگا تو لوگ اس کی زد سے بچنے کے لیے حکومت کو کچھ روپیہ بطور تاوان ادا کر دیتے اور اس سے نجات حاصل کرتے تھے۔ اس دور میں اگرچہ زمین کی مالیت کو بیس پونڈ سے بڑھا کر چالیس پونڈ کر دیا گیا تھا پھر بھی اس سے ایک وسیع لیکن کمتر معاشی حیثیت کا طبقہ متاثر ہو رہا تھا۔

قدیم قوانین جنگلات پر سختی سے عمل کیا جانے لگا۔ جن لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ شاہی اراضی پر کسی پچھلے زمانہ میں قبضہ کر لیا تھا ان کے قبضے ان قوانین کے تحت برخواست کئے جانے لگے یا پھر ان کو اپنی ملکیت کے ثابت کرنے کے لئے دستاویزات پیش کرنے پڑتے تھے۔ صدیوں پرانے دستاویزات کی فراہمی آسان نہ تھی۔ جو لوگ ان دستاویزات کی پیش کشی سے قاصر تھے ان پر بھاری جرمانے عاید کئے جانے لگے۔ بلا منظوری پارلیمنٹ ٹنیج و پونڈیج کی وصولی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی ابتداً کچھ مخالفت ہوئی لیکن چارلس باز نہیں آیا۔ بلکہ محاصل کروڑگری کی مقررہ شرح پر زاید محصول (IMPOSITION) اپنے ذاتی اختیار سے وصول کرنے لگا جس کے جواز کے بارے میں اس سے پہلے بہت بدمزگیاں پیدا ہوئی تھیں۔

زرِ سفینہ ......(SHIP MONEY.)

آمدنی کے ذرائع کو وسعت دینے کے لئے جو تلاش اور تفحص جاری تھا اس میں محصول

زر سفینہ ایک نہایت ہی منفعت بخش ذریعہ ثابت ہوا۔ چارلس نے سب سے پہلے 1626ء میں اسپین سے جنگ کے سلسلے میں اس قدیم محصول کا احیاء کیا تھا۔ اس محصول کی تاریخ قرونِ وسطیٰ بلکہ اس سے پہلے کے زمانہ تک پہنچتی ہے۔ عموماً بیرونی حملہ کے خطرہ کی صورت میں یہ ٹیکس ساحلی اضلاع کے شہروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ توقع یہ کی جاتی تھی کہ اضلاع ایک مناسب اور مقررہ تعداد میں جنگی جہازوں کی فراہمی کا انتظام کریں گے۔ اس قسم کے مطالبہ کو دستور یا قانون کے مغائر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ تصور یہ تھا کہ اپنی سلامتی اور تحفظ کے لئے ملک کے دفاع میں اپنا حصّہ ادا کرنا سب کا ایک ناگزیر فریضہ ہے۔ اضلاع کسی زمانے میں اپنے تجارتی بیڑہ کے جہازوں کو جنگی جہازوں میں تبدیل کر کے حکومت کے حوالے کر دیتے تھے۔ لیکن بعد میں جب ایسی تبدیلی آسانی سے ممکن نہ رہی تو ان سے جہاز کے معاوضہ میں ایک مقررہ ٹیکس کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ غرض یہ ٹیکس ایک قدیم عملدرآمد پر مبنی تھا اور شاہانِ ناسلف اس سے حقیقی ضرورت کے وقت استفادہ کرتے تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کو کبھی ایک مستقل ٹیکس نہیں بنایا گیا۔ اور مقررہ محاصل کی فہرست میں اس کے شمول کا تصور تک نہیں تھا۔ چارلس اور اس کے مشیر جو اس قسم کے قدیم ذرائع آمدنی کی تلاش میں سرگرداں تھے اسے اپنی مالی مشکلات کا بہت اچھا حل سمجھنے لگے۔

1634ء میں پہلی مرتبہ اس ٹیکس کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن یہ مطالبہ صرف ساحلی اضلاع تک محدود تھا۔ لندن کے تاجروں نے کچھ احتجاج ضرور کیا لیکن حکومت کے لئے نتائج بہت ہمت افزا رہے۔ 1635ء میں اس کو وسعت دی گئی اور بلاتخصیص تمام اضلاع سے اسے وصول کیا گیا۔ اس کامیابی نے چارلس کے حوصلے بہت بلند کر دیئے۔ 1636ء میں پچھلے سال کی طرح پورے ملک پر یہ ٹیکس عاید کیا گیا۔ استدلال یہ تھا کہ قومی دفاع کے لئے ایسے وقت میں جبکہ بیرونی خطرات سر پر منڈلا رہے ہوں ایک طاقتور بحریہ ازبس ضروری ہے۔ اس کی فراہمی میں ہر شخص کو حصّہ لینا چاہیے۔ لہٰذا اس بار کا پورے ملک پر ڈالا جانا عین قرینِ انصاف ہے۔ مگر لوگ اس کو محسوس کئے بغیر نہیں رہے کہ چارلس دراصل اس بہانے سے ٹیکسوں کے حصول کا وہ ذریعہ نکالنا چاہتا ہے جو پارلیمنٹ کی محتاجی سے اسے آزاد کر دے۔ اس طرح وہ انگلستان کے آئین و دستور کے برخلاف اپنی جابرانہ حکومت جاری رکھنے کا خواہاں ہے۔ اگر چارلس اور اس کے مشیر واقعی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو انگلستان کے دستور کو خیرباد کہہ دینا پڑے گا۔ اس کا نام و نشان ہی مٹ جائے گا اور اس کی جگہ ایک ایسی مطلق العنان خود سر شخصی حکومت قائم ہو جائے گی جس میں قوم کے تعاون و اشتراک کا

کوئی سوال ہی باقی نہیں رہے گا۔ اہل ملک کے سامنے اب یہی سوال تھا کہ آیا صدیوں پرانے دستور اور آئین کے مٹانے کی اس کوشش کے آگے وہ اپنا سر تسلیم خم کر دیں گے یا اس کے تحفظ کے لئے اپنی روایتی کشمکش جاری رکھیں گے۔ ہیمپڈن نے اس کا جواب بڑی بے جگری سے دیا۔ قوم کی جبر و ظلم کے خلاف مزاحمت کی اسپرٹ ہیمپڈن کی ذات میں متشکل ہو گئی تھی۔ اس نے ٹیکس کے شاہی مطالبہ کو مسترد کر دیا تاکہ عدالت میں اس کے جواز یا عدم جواز کی آزمائش ہو سکے۔

ہیمپڈن کا مقدمہ

ہیمپڈن کا یہ مقدمہ دستوری نقطۂ نظر سے بڑا معرکۃ الآراء سمجھا جاتا ہے۔ عدالت خزانہ میں "کامن لا ججس" کے متفقہ اجلاس پر اس کی سماعت ہوئی۔ حکام عدالت نے جو فیصلہ دیا وہ عدلیہ میں شاہ پرستی کے رجحانات کے مدنظر کچھ حیرت انگیز نہیں تھا۔ اگرچہ فیصلہ واضح طور پر اور واضح اکثریت کے ساتھ بادشاہ کی موافقت میں ہوا مگر قوم دل سے اس کے مبنی بر انصاف ہونے کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھی بلکہ فیصلہ میں جن تصورات کا بڑے شد و مد سے اظہار کیا گیا تھا۔ ان کو اہل نظر نے ملک کی دستوری آزادیوں پر ایک خطرناک حملہ سمجھا۔ فیصلہ میں بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ کو ہر ملکی قانون سے بالاتر بتایا گیا تھا۔ اور صاف طور پر کہا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کا کوئی قانون تاج کے مطلق اختیارات پر کوئی تحدید عاید نہیں کر سکتا۔ مملکت کا دفاع تاج کی عظیم ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری سے سر بر ہونے کے لئے وہ مملکت پر کسی قسم کا بھی ٹیکس عاید کر سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کا وضع کردہ قانون اس راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ بہ شرطِ ضرورت بادشاہ کسی بھی قانون کو معطل کر سکتا ہے۔ کوئی ایسا قانون جو دفاع کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں تاج کے لئے رکاوٹ کا باعث ہو۔ وہ از خود مہمل، بے اثر اور کالعدم متصور ہو گا۔

اقتدار شاہی کا یہ نظریہ انگلستان کے تاحال تمام دستوری ارتقار کے منافی اور محدود شاہی کے تمام تصورات کی یکسر تنسیخ کے مترادف تھا۔ اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ عدلیہ کی اعلیٰ ترین سطح سے لامحدود شاہی اقتدار کی توثیق و تائید قومی آزادی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دے گی۔ اور شاہی استبداد کے لئے تمام راہیں کھل جائیں گی۔

اس فیصلہ سے چارلس کے استبدادی رجحانات کو بہت تقویت پہنچی اور اس نے بلا منظوری پارلیمنٹ روپیہ وصول کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کسی قدر مشکل سے ہی سہی مگر چارلس ان ذرائع سے

اتنا روپیہ تو حاصل کر رہا تھا کہ حکومت کی معمولی ضروریات پوری ہو جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں بددلی بڑھتی جا رہی تھی مگر چارلس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اپنی ظاہری کامیابی سے مطمئن نظر آتا تھا۔ پارلیمنٹ کو بُلائے کئی سال ہو گئے تھے۔ اگر چارلس محتاط رویہ اختیار کرتا اور کسی بڑے قضیئے میں اپنے آپ کو نہ اُلجھا لیتا تو ممکن تھا کہ اس کو فوری کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ انگریز قوم کے مزاج اور اس کی صدیوں پرانی روایات کی وجہ سے چارلس دستور کی بُنیادوں کو یکسر منہدم تو نہ کر سکتا۔ البتہ ایک طویل عرصہ تک شاید دستوری عمل درآمد کو معطل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن چارلس سخت ناعاقبت اندیش اور بے تدبیر آدمی تھا۔ اس ظاہری کامیابی سے اس کے حوصلے اتنے بڑھ گئے، کہ اپنے شخصی اقتدار کو زیادہ مستحکم کرنے کے لئے اس نے کلیسا پر دست اندازی کی اور قومی زندگی کے ایک ایسے شعبے میں مداخلت کی جو قوم کے لئے عظمت اور تقدیس کا حامل تھا۔ اس مداخلت نے ایسا طوفان و تلاطم برپا کیا کہ اس کے بعد وہ خود سنبھل نہ سکا اور مملکت کی کشتی ایک عظیم گرداب میں پھنس گئی۔

چارلس کی مذہبی پالیسی

چارلس کی مذہبی پالیسی نے اس عہد کی دستوری کشمکش کو تیز تر کر دیا۔ مذہبی معاملات میں چارلس نے لاڈ (LAUD.) کو اپنا مشیر بنایا تھا۔ یہ پہلے لندن کا بشپ تھا۔ ویسے جیمز کے زمانے سے اس کو دربار میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ لیکن چارلس کے عہد میں وہ بہت طاقتور ہو گیا۔ 1633ء میں اس کو کنٹربری کا صدر اسقف بنایا گیا۔ اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد اس کی یہی کوشش رہی کہ کلیسا سے پیورٹنوں کو نکال باہر کیا جائے۔ اب تک پیورٹن اپنے بہت سے اختلافات کے باوجود کلیسا سے وابستہ تھے۔ طریقِ عبادت میں نمائش اور شان و شکوہ، عبادت گاہ کی آرائش و زیبائش بعض مخصوص رسوم کی ادائی، پادریوں کا بوقتِ عبادت مخصوص اور پرشکوہ جامہ کا زیبِ تن کرنا، کتابِ عبادت کا استعمال ان سب چیزوں سے پیورٹنوں کو نفرت تھی بلکہ ان کو ایامِ گمراہی کی یادگار سمجھتے تھے۔ ان کو ان چیزوں سے جیسی نفرت تھی۔ لاڈ اور اس کا ہم خیال گروہ اس کو اتنا ہی لابدی اور ناگزیر سمجھتا تھا۔ یہ گروہ ہائی چرچ پارٹی کے نام سے موسوم تھا۔ اس جماعت کا یہ عقیدہ تھا کہ متذکرہ صدر امور کی پیروی اور پابندی میں کسی انحراف کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔

پیورٹن اور آرمینیزم

ہائی چرچ پارٹی کا گروہ جس عقیدے کا شدت سے حامی تھا اس کو آرمینیزم (ARMINI-ANISM) کہتے ہیں۔ لاڈ جو ان عقائد کا سرگروہ تھا کلیسا میں ان کو ہر قیمت پر نافذ کرنا چاہتا تھا۔ ایسے پیورٹن پادری جو نظر بچا کر اس سے انحراف کرتے تھے ان کو وہ پکڑ پکڑ کر سزائیں دینے لگا۔ کلیسا میں معمولی سے معمولی انحراف کو مٹانے کے لئے کورٹ آف ہائی کمیشن سے کام لیا جانے لگا۔ لاڈ سے پہلے ایبٹ (ABBOT) صدر اسقف تھا۔ اس نے پیورٹن پادریوں کو اپنے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ ویسے وہ خود آدھا پیورٹن تھا۔ اس لئے اس کے زمانے میں ان پر کوئی سختی نہیں کی گئی۔ لیکن لاڈ جب کلیسا کا سربراہ مقرر ہوا تو اس نے ایسی دارو گیر شروع کی کہ پیورٹنوں میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ پیورٹن عقاید کے پیرو آرمینیزم کو کیتھولک مذہب کا دوسرا رُخ سمجھتے تھے۔ اس سے کسی قیمت پر وہ کسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں تھے۔ لاڈ انتہائی تنگ نظر آدمی تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ تنگ نظری میں پیورٹن بھی اس سے کچھ کم نہ تھے۔ مذہبی جنون میں دونوں شمشیر براں تھے۔ لہٰذا دونوں کا ایک ہی کلیسا میں نباہ ناممکن تھا۔ لاڈ کی پالیسی کا سنگِ بنیاد یہ تھا کہ پیورٹن پادریوں کا کلیسا سے جبراً و قہراً اخراج عمل میں لایا جائے تاکہ کلیسا کے جسد میں انحراف کا کوئی جرثومہ باقی نہ رہے لاڈ کو اس تمام دارو گیر میں چارلس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ کلیسا میں ہائی چرچ پارٹی کے عروج کو چارلس اپنے لئے فالِ نیک سمجھتا تھا۔ اس پارٹی کا بنیادی سیاسی عقیدہ یہ تھا کہ بادشاہ حاکمِ علی الاطلاق ہے۔ زمین پر اس کی حیثیت خدا کے نائب اور خلیفہ کی ہے۔ اس لئے اس کے اقتدارات میں چوں و چرا کرنا منشائے خداوندی کے خلاف بغاوت ہے۔ ان کے ذہن میں بادشاہ کی اطاعت، طاعتِ ایزدی کے مترادف تھی۔ چونکہ پیورٹن اس عقیدے کے قائل نہیں تھے۔ لاڈ کے نزدیک ان کا قلع قمع کرنا مذہب اور سیاست دونوں کی ایک بہترین خدمت تھی۔ تعجب نہیں کہ ان حالات میں پیورٹن فرقہ کے لوگ لاڈ اور چارلس کی کامیابیوں کو طاغوتی طاقتوں کی فتح سمجھنے لگے ہوں۔

لاڈ اور اسکاٹ لینڈ

لاڈ کی مدد سے کلیسا میں پیورٹنوں کو کچلنے میں چارلس کو کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ اب وہ اس حکمتِ عملی کو اسکاٹ لینڈ میں آزمانا چاہتا تھا جہاں کا کالونی (پریسبیٹیرین) کلیسا اس کیلئے ایک

چیلنج تھا۔ اسکاٹ لینڈ جیمز کے ایامِ طفولیت میں ناکس (KNOX) کی اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر کالون کی تعلیمات قبول کر چکا تھا۔ اس نظام کے تحت کلیسا پر وہاں شاہی اقتدار عملاً ختم ہو چکا تھا۔ اسقفی نظام معطل کر دیا گیا تھا۔ بادشاہ اور اسقف کی حکومت کی بجائے مقامی کانگریگیشن (CONGREGATION) کے اراکین سے لے کر جنرل اسمبلی تک مختلف سطحوں پر وہاں منتخبہ نمائندوں کی مجالس کے ذریعہ سے کلیسا کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جیمز کو اپنے اقتدار کا کھویا جانا سخت ناپسند تھا۔ اس نے اس نظام میں خفیف ترمیمیں کروائیں لیکن کسی طرح اسقفی اور شاہی اقتدار کو بحال نہ کر سکا۔ چارلس نے اب لاڈ کے مشورہ سے اسکاٹ لینڈ پر مکمل اسقفی نظامِ حکومت کو ٹھونسنا چاہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک نئی "کتابِ عبادت" تیار کروائی گئی جس میں انگلستان کی کتابِ عبادت کا تتبع کیا گیا تھا۔ کلیساؤں میں اس کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔ یہ سب اس لئے کیا جا رہا تھا کہ اگر اسکاٹ لینڈ میں پریسبٹیرین نظام کا خاتمہ کر دیا جائے اور ایک محکوم و فرمانبردار کلیسا وہاں وجود میں آئے تو مطلق العنان شاہی کے قیام کے دروازے کھل جائیں گے اور شاہی استبداد کی مانع اور مزاحم قوتوں کا قلع قمع ہو جائے گا۔

لیکن اسکاٹیوں کو اپنے مذہب اور اپنے طرزِ کلیسا سے جو وابستگی تھی اس کا چارلس نے صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ چارلس نے انگریزی طرز کے کلیسا کو جب ان پر مسلط کرنا چاہا تو پوری قوم ایک شخصِ واحد کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسکاٹیوں کو مذہب کے معاملہ میں ایسا غلو تھا کہ وہ اپنے عقائد میں رمق برابر تبدیلی کو بدترین کفر سمجھتے تھے۔ مجوزہ تبدیلیاں ایسے تصورات پر مبنی تھیں جن سے انھیں صرف اختلاف نہیں بلکہ سخت نفرت تھی۔ اس "طاغوتی نظام" کو وہ کسی قیمت پر قبول کرنے آمادہ نہ تھے۔ انگریزی طرزِ کلیسا کو وہ "مانعِ نجات' مخالفِ عیسائیت اور کیتھولک گمراہی" کا گہوارہ سمجھتے تھے۔

اسکاٹ لینڈ سے جنگ

چارلس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑا تھا۔ اور بہت جلد اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اسکاٹی یہ جان گئے تھے کہ اپنے مذہب کو بچانے کے لئے انھیں مسلح مزاحمت کرنی پڑے گی۔ چنانچہ پوری قوم نے آپس میں ایک "مقدس اتحاد و عہدنامہ" (SOLEMN LEAGUE & COVENANT) کی بنیاد ڈالی اور اس بندھن میں اپنے آپ کو متحد کر لیا۔ اور چارلس کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی

تیاریاں بھی شروع کردیں۔ اس طرح چارلس نے اپنی حماقت سے ایک نئی جنگ مول لی تھی۔ اسکاٹی فوجیں حرکت میں آگئی تھیں اور وہ سرحد کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے چارلس نے قابلِ اعتراض اور غیر دستوری طریقوں سے روپیہ حاصل کرنا شروع کیا مگر یہ سب تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ اسکاٹی خطرہ سے نمٹنے کے لئے بھاری رقم کی ضرورت تھی اور یہ صرف پارلیمنٹ مہیا کرسکتی تھی۔ لہٰذا پارلیمنٹ ناگزیر ہوگئی۔ بادشاہ کے رفقاء نے بھی اسے یہی مشورہ دیا۔ مجبوراً چارلس نے پارلیمنٹ طلب کی۔ (اپریل 1640ء)۔

گیارہ سال سے کوئی پارلیمنٹ نہیں بلائی گئی تھی۔ دستوری روایات کی یہ ایک ایسی کھلی خلاف ورزی تھی کہ جس کی پچھلے زمانے میں مشکل سے نظیر مل سکتی ہے۔ قوم نہایت بددل اور بیزار تھی۔ اور چارلس بدنیّت اور بدعہد۔ دونوں میں مصالحت اور تعاون کی کوئی راہ نکلنی مشکل تھی۔ پارلیمنٹ جیسے ہی آئی بادشاہ نے روپے کی فی الفور منظوری کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ دارالامراء نے اس کی تائید کی۔ لیکن دارالعوام اس پر مُصر تھا کہ پہلے شکایات کا ازالہ کیا جائے۔ یہ لوگ اس بات سے واقف تھے کہ اگر یکبارگی روپیہ کی منظوری دے دی جائے تو پھر چارلس جیسے بدعہد آدمی سے کسی قسم کی اُمید رکھنا عبث ہوگا۔ نئی پارلیمنٹ میں نہایت پختہ اور آزمودہ کار لیڈرشپ موجود تھی۔ سر جان ایلیٹ کا انتقال ہوچکا تھا لیکن پم اور ہیمپڈن جیسے دلیر اور جری اشخاص ایوان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اس کشمکش میں تین ہفتے گزر گئے۔ مصالحت کی کوئی صورت نکل نہ سکی۔ ہر چند چارلس نے وعدہ کیا کہ اگر ایک معتد بہ رقم منظور کی جائے تو وہ "زرِ سفینہ" سے دست بردار ہوجائے گا۔ مگر پارلیمنٹ بادشاہ کے زبانی وعدوں پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ غرض اسی باہمی تکرار، بدگمانی اور بدمزگی کی فضاء میں یہ پارلیمنٹ صرف تین ہفتوں میں برخواست کردی گئی۔

لارڈ اسٹرافورڈ

پارلیمنٹ کا تحلیل کرنا تو آسان تھا مگر اس کے نتائج سے نمٹنا اتنا آسان نہ تھا۔ شمال میں خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اسکاٹیوں کی پیش قدمی کو روکنا وقت کی اوّلین ضرورت تھی۔ پارلیمنٹ کی امداد اور تائید کے بغیر کسی جنگی کارروائی کو جاری رکھنا ناممکن تھا۔ چارلس نے اسکاٹیوں کے مقابلے کے لئے جو فوج تیار رکھی تھی اس میں نہ تو نظم و ضبط تھا اور نہ ہتھیار و اسلحہ۔ لباس

و رسد کی سہولتیں تک اسے حاصل نہیں تھیں۔ ٹامس ونٹ ورتھ اس زمانے میں بادشاہ کا مُشیر تھا۔ یہ شخص بڑا ذہین اور طبّاع تھا۔ چارلس کے ابتدائی عہد کی پارلیمنٹوں میں اس نے صفِ اول کے قائدین میں اپنی جگہ پیدا کرلی تھی۔ عرضداشتِ حقوق کے منظور کرانے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس زمانے میں یہ سرجان ایلیٹ اور دوسرے لیڈروں کا ساتھی اور چارلس کی غیر دستوری حکومت کا سخت مخالف تھا۔ لیکن عرضداشتِ حقوق کے منظور ہوجانے کے بعد وہ اپنے پُرانے ساتھیوں کو چھوڑکر بادشاہ سے جاملا۔ اس اچانک تبدیلی سے اس کے قدیم رفقائے کار اسے غدّار اور دشمنِ قوم سمجھنے لگے۔ لیکن ونٹ ورتھ کے خیالات میں یہ تبدیلی محض کسی منفعت پسندی اور لالچ کی بنا پر نہیں آئی تھی۔ وہ ایمانداری سے یہ سمجھتا تھا کہ دستور میں بادشاہ کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے اور اب تک جو تحدیدیں اس پر عاید کی گئی ہیں وہ دستور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اب اس سمت میں مزید پیش رفت یا تاج کے اختیارات میں مزید قطع و برید کی کوشش دستور کی اسپرٹ کے منافی ہوگی۔ چارلس نے 1633ء میں اسے آئرلینڈ کا حاکم بنا کر بھیج دیا تھا۔ یہاں اس نے ایک طاقتور فوج تیار کی۔ آئرلینڈ اس وقت آماجگاہ فتنہ و فساد تھا لیکن ونٹ ورتھ نے ہر مخالفت کو سختی سے کچل دیا۔ یہاں وہ اپنی بیرحمانہ سخت گیری سے بہت بدنام ہوا۔ چارلس کا وہ زبردست حامی اور دستِ راست تھا۔ اس لئے چارلس نے اپنی پچھلی پارلیمنٹ (اپریل 1640ء) کے طلب کرنے سے پیشتر اسے آئرلینڈ سے طلب کرلیا تھا۔ اسی کے مشورہ پر یہ پارلیمنٹ بلائی گئی تھی۔ پارلیمنٹ کے حلقوں میں اسے بہت بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چونکہ وہ چارلس کی غیر دستوری اور جابرانہ حکومت کا مؤید سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے پارلیمنٹ اس کے خون کی پیاسی تھی۔ بادشاہ نے اس کی وفاداریوں کے صلہ میں اسے "لارڈ اسٹرافورڈ" بنادیا۔

طویل پارلیمنٹ کی طلبی

اس مرحلہ پر اسٹرافورڈ کے مشوروں سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کیاگیا۔ زرِ سفینہ، قرضے، نذرانے سب ہی طریقوں سے کام لیاگیا۔ کوئی ایسا امکانی ذریعہ نہیں تھا جس پر ہاتھ نہ ڈالاگیا ہو۔ دستور کی حُرمت اب عملاً بالائے طاق تھی۔ اس کے باوجود جنگ کا جاری رکھنا تو درکنار فوج کو رسدات فراہم کرنا دشوار تھا۔

اسکاٹی فوجیں دَرّاتی ہوئی سرحد کے اِس پار آگئیں اور دو شمالی ضلعوں پر قبضہ کرلیا۔ ان پریشان کن حالات میں چارلس نے پارلیمنٹ سے بچنے کے لئے ایک قدیم عملدرآمد کا احیار کیا۔ نارمن زمانے میں مجلس عظمیٰ (GREAT COUNCIL) پارلیمنٹ کا کام انجام دیتی تھی — پارلیمنٹ کے قیام کے بعد بھی بعض اوقات سلاطین، امراء کی اس مجلس کو طلب کرتے تھے۔ اس نظیر کو سامنے رکھ کر چارلس نے امراء (PEERS.) کو طلب نامے بھیجے کہ وہ یارک کے مقام پر اس سے ملاقات کریں۔ اس مجلس نے اپنے انعقاد کے ساتھ ہی اسکاٹیوں سے ایک عارضی معاہدہ کیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ جلد از جلد پارلیمنٹ کو طلب کرے۔

ہرچند چارلس یہ تلخ گھونٹ پینا نہیں چاہتا تھا لیکن حالات کی نزاکت کے پیش نظر اس کو سپر ڈالتے ہی بنی۔ اس نے طوعاً و کرہاً پارلیمنٹ کی طلبی کے احکام جاری کر دیئے۔ یہ مشہور پارلیمنٹ نومبر 1640ء میں منتخب ہوکر آئی اور اپنے عہد آفرین فیصلوں سے انگلستان کی تاریخ پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

پانچواں باب

شاہانِ اسٹورٹ

چارلس اول (2) — پارلیمنٹ کی کامیابی

استبدادی حکومت کا خاتمہ

چارلس نے گزشتہ گیارہ سال کی استبدادی حکومت سے ملک میں ایک دستوری بحران پیدا کر دیا تھا۔ قدرتی طور پر قوم اس سے بہت متشوش تھی۔ قومی آزادیوں کی میراث کو خطرہ میں دیکھ کر عوام میں یہ احساس جاگ چکا تھا کہ انھیں ایک کٹھن مقابلہ درپیش ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ سترھویں صدی کی پارلیمنٹ ہر چند پوری قوم کی نمائندہ نہیں تھی اور اس کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے انتخابی قوانین اسے پوری طرح رائے عامہ کا آئینہ دار نہیں بنا سکتے تھے مگر ان نقائص کے باوجود جب 1640ء میں انتخابات کا مرحلہ پیش آیا تو ایک ایسی پارلیمنٹ منتخب ہو سکی جو زیادہ سے زیادہ قوم کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کر سکتی تھی۔ انگریزوں کے قومی مزاج میں سیاسی آگہی ہمیشہ سے کچھ اتنی رچی ہوئی تھی کہ ہر نازک مرحلہ پر باوجود موانعات کے وہ ایسی پارلیمنٹ منتخب کر سکتے تھے جو بڑی حد تک قوم کے احساسات کی آئینہ دار ہو۔ چنانچہ اس وقت بھی یہی ہوا۔ یہ پارلیمنٹ جب آئی تو معلوم ہوا کہ یہ مختلف اشخاص و افراد، مختلف گروپس اور جماعتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک جسدِ واحد ہے جو کامل ہم آہنگی کے ساتھ ان مسائل سے نمٹنے پر تلا ہوا ہے جو اس وقت قوم کے سامنے درپیش تھے۔ دارالعوام کی قیادت نہایت قابل ہاتھوں میں تھی۔ پم، ہیمپڈن، اسٹروڈ، ہیسل رگ (HASELRIG.) جیسے لوگ دارالعوام کی رہبری کر رہے تھے۔

طویل پارلیمنٹ LONG PARLIAMENT } 1640ء کی طویل پارلیمنٹ انگلستان کی دستوری تاریخ میں بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے نہ صرف چارلس

کے استبداد کا خاتمہ کر دیا بلکہ آنے والے زمانے کے دستوری نظامِ حکومت کو استوار اور مستحکم کر دیا اور استبدادی حکومت کے امکانات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ جبر و استبداد کی جو عمارت چارلس اور اس کے مشیروں نے کھڑی کی تھی اس کو آن کی آن میں مسمار کر دیا۔ چارلس بہ نظرِ حیرت یہ سب کام دیکھتا رہا، مگر اس قابل نہیں تھا کہ پارلیمنٹ کی ان پیہم یورشوں کے خلاف کچھ مدافعت کر سکے۔ پارلیمنٹ کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ کافی طاقتور ہے، اور وہ کسی صورتِ حال کا بھی مقابلہ کر سکتی ہے۔ قوم اس کی تائید اور پشت پناہی کرنے تیار تھی۔ پارلیمنٹ کے سامنے پہلا کام ان ذرائع کا مسمار کرنا تھا جن کی مدد سے چارلس نے استبداد کا ڈھانچہ تیار کیا تھا۔ جو لوگ اس کام میں اس کے معاون و مددگار تھے وہ پارلیمنٹ کی نظر میں بدترین مجرم تھے۔ سب سے پہلے انھیں ان کے کیفرِ کردار کو پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے سب سے پہلا وار چارلس کے ان مشیروں پر کیا۔ لارڈ اسٹرافورڈ گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس کے مواخذہ کی کارروائی شروع کی گئی۔

لاڈ بھی اس داروگیر سے نہیں بچا۔ حالانکہ کلیسائی سربراہ ہونے کے اعتبار سے وہ یک گونہ قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ ونڈی بنک، لارڈ کیپر فنچ اور بعض ایسے حکامِ عدالت جنھوں نے شاہی استبداد کی موافقت میں فیصلے کئے تھے سب کے سب پکڑے گئے۔ اور ان کے خلاف کارروائیاں شروع کی گئیں۔ ان میں سے بعضوں نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ مگر پارلیمنٹ کو سب سے زیادہ دلچسپی اسٹرافورڈ سے تھی جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ قومی آزادی کا اگر کوئی بدترین دشمن ہے تو یہی شخص ہے۔ چارلس کے کئے دھرے کا اسی کو ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ پارلیمنٹ نے فوراً اس کا مواخذہ شروع کیا۔ چارلس کچھ اتنا بے بس تھا کہ اس کو روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ عوام نے دار الامراء کے سامنے جب یہ مقدمہ پیش کیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ اسٹرافورڈ کے جرائم کیسے ہی شدید اور قابلِ عقوبت سہی مگر غدّاری کا الزام اس پر عاید نہیں کیا جا سکتا۔ پم اور ہیمپڈن وغیرہ اسے غدّاری کے الزام میں دار پر کھینچنا چاہتے تھے۔ امراء اس الزام کے تحت اسے سزا دینے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ "قانونِ غداری" جس کے تحت اس مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی اور جو ایڈورڈ سوم کے عہد میں پاس کیا گیا تھا، کسی طرح اسٹرافورڈ پر منطبق نہیں ہو سکتا تھا۔ "غداری" کی تعریف اس قانون میں بادشاہ کے خلاف جنگ کرنا تھی۔ یا اس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش یا اسے اور اس کے اہلِ خاندان کو قتل کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی تاویل کے ذریعہ سے بھی اسٹرافورڈ اس قانون کے تحت مجرم قرار نہیں پا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ تجویز کی گئی کہ بل آف اٹینڈر (BILL OF-ATTAINDER-) پاس

کرکے اس کو سزا دی جائے ۔ اس کی پچھلے زمانہ میں نظیریں ملتی تھیں اور عموماً یہ ہتھیار طاقتور سیاسی حریفوں کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہرچند بل آف اٹینڈر میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اسٹرافورڈ نے اپنی قوم دشمن پالیسیوں کے ذریعہ سے ملک کے بنیادی اور اساسی قوانین کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ نیز یہ کہ استبدادی طرزِ حکومت کی تائید اور پشت پناہی کرکے وہ قوم کی آزادیوں کے عظیم ورثہ کو تباہ کرنے کے درپے ہوا۔ لہٰذا اس "غداری کے عوض وہ قابلِ گردن زدنی ہے"۔ یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ غداری کس کے خلاف تھی ۔ امرا اس پر بھی مطمئن نہ ہوسکے اور متامّل نظر آتے تھے۔ لیکن خوف وہراس اور شکوک وشبہات کی فضا میں یہ بل پاس کیا گیا۔ اگرچہ بہت معمولی اکثریت سے جبکہ حاضر اراکین کی تعداد بھی قلیل تھی — بل آف اٹینڈر (BILL OF ATTAINDER —) سے ایسے موقعوں پر کام لیا جاتا تھا جہاں قانون عاجز تھا۔ قانونی کارروائی سے دست برداری حاصل کرکے صرف دو سطری "قتل نامہ" پاس کردیا جاتا۔ اس کو کسی قانون کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ چارلس نے ہرچند اسٹرافورڈ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی جان و مال اور عزت وآبرو کو کوئی دھکّہ نہ پہنچ سکے گا مگر جب اسٹرافورڈ کا قتل نامہ اس کے سامنے پیش کیا گیا تو سوائے دستخط ثبت کرنے کے اس کو کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا۔ چارلس نے آخری لمحہ تک اپنے اس رفیق عزیز کی جان بچانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن لندن کے شہریوں نے محل سرا کو گھیر لیا، ایک عام خوف وہراس کی فضا تھی۔ خود بادشاہ اور اس کے اہلِ خاندان کی جانیں خطرہ میں نظر آرہی تھیں ۔ ان حالات میں چارلس نے قتل نامہ پر اپنے دستخط ثبت کردیئے ۔ لاڈ کی کارروائی کو پارلیمنٹ نے فوراً ہاتھ پر نہیں لیا۔ کیونکہ اس میں بعض موانعات تھے۔ آرچ بشپ ہونے کے اعتبار سے اس کی حیثیت مذہبی پیشوا کی سی تھی اور وہ تقدیس کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے وہ فی الحال جیل میں پڑا سڑتا رہا۔ 1645ء میں اس کو قتل کیا گیا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے اس پارلیمنٹ کو عام طور پر "طویل پارلیمنٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی باضابطہ تحلیل 1660ء میں عمل میں آئی ۔ اس طویل عرصہ میں وہ صرف ابتدائی دس مہینوں تک جسدِ واحد کی طرح کام کرتی رہی۔ اس کے بعد اس میں پھوٹ اور اختلاف پیدا ہوگیا۔ لیکن ان دس مہینوں میں اس کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں ۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ چارلس نے حکومت کے جو غیر دستوری ذرائع پیدا کئے تھے انھیں کُلّیتہً فنا کردیا جائے۔ چنانچہ اسٹرافورڈ کے مواخذہ کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے مہم مسائل سے نمٹنے میں مشغول ہوگئی۔

قانون سہ 3 سالہ

سب سے پہلے اس بات کا تیقن حاصل کرنا تھا کہ پارلیمنٹ برابر بلائی جاتی رہے گی۔ اور ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہوگی کہ بادشاہ برسوں پارلیمنٹ نہ بلائے۔ اس غرض کے لئے ایک قانون پاس کیا گیا کہ ہر پچھلی پارلیمنٹ کے آخری اجلاس کے بعد زیادہ سے زیادہ تین سال کے اندر نئی پارلیمنٹ طلب کی جانی چاہئے۔ نیز یہ کہ کسی پارلیمنٹ کو التوا، اور عارضی برخواستگیوں کے ذریعہ سے (پچھلے اجلاس کی آخری تاریخ سے) تین سال سے زیادہ مدت کے لئے برقرار نہیں رکھا جائے گا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر بادشاہ مدتِ مقررہ کے انقضا کے بعد بھی پارلیمنٹ کی طلبی کے احکام جاری نہ کرے تو لارڈ چانسلر پر لازم ہوگا کہ وہ اس ضمن میں ضروری اقدام کرکے پارلیمنٹ کو مقررہ تاریخ پر طلب کرے۔ پچاس یوم کے اندر کسی نئی پارلیمنٹ کو تحلیل نہ کیا جا سکے گا۔ ان قوانین نے بادشاہ کے اختیارات پر کافی ضرب لگی۔ پارلیمنٹ کی طلبی اور تحلیل کی اسے جو آزادی حاصل تھی وہ ختم ہوگئی۔ اس پر بھی پارلیمنٹ قانع نہیں تھی۔ اسے چارلس سے ایسا خدشہ تھا کہ اس نے ایک اور انقلابی قانون منظور کیا۔ یہ کہ موجودہ پارلیمنٹ اپنی مرضی اور اجازت کے بغیر تحلیل نہیں کی جائے گی یہ تاج کے اختیارات پر ایسا حملہ تھا جس کی دستور میں کوئی نظیر نہیں تھی۔ چارلس شاید اس مطالبہ کو منظور نہ کرتا مگر یہ مسودہ ایسے وقت اس کے سامنے پیش کیا گیا جبکہ اسٹرافورڈ کے قصاص کی کارروائی کے سلسلے میں وہ بیحد پریشان اور حواس باختہ تھا۔ اسی حواس باختگی کے عالم میں اس نے اس قانون پر دستخط ثبت کر دیئے۔

طویل پارلیمنٹ کے اصلاحی قوانین

اسی ضمن میں پارلیمنٹ نے ایسے ذرائع آمدنی کا سدِباب کیا جن کو وہ ناجائز سمجھتی تھی۔ چنانچہ ٹنیج وپونڈیج اور دیگر محاصل کروڑگیری کی تحصیل بلامنظوریِ پارلیمنٹ صراحتاً ناجائز قرار دی گئی۔ زرِ سفینہ کو ہمیشہ کے لئے مسدود کیا گیا۔ مختلف قوانین کے ذریعہ سے شاہی جنگلات کی حدبندی، لزومِ اسلحہ (DISTRAINT OF KNIGHTHOOD) کی پابندی اور شاہی اختیارات کے ذریعہ سے فوج کے لئے زبردستی رسد اور سربراہی کی وصولی کو قطعاً ناجائز قرار دیا گیا۔ ان تمام قوانین کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ جن مخصوص اختیاراتِ شاہی کا مدعی تھا انھیں یک قلم ختم کر دیا جائے

استبدادی حکومت کے سہارے ایک ایک کرکے مسمار کئے جا رہے تھے۔ اس قطع و برید کے ضمن میں پارلیمنٹ کا سب سے اہم کام ان عدالتوں کی برخواستگی تھا جن کو اسٹورٹوں نے جور وظلم کا آلۂ کار بنالیا تھا۔ غیر دستوری حکومت کا یہ سب سے بڑا سہارا بن گئی تھیں اور ان کے مخصوص طریقۂ کار کی وجہ سے قانون کی تمام ضمانتیں جو شخصی آزادی کے لئے دی گئی تھیں بے اثر اور غیر کارگر ہوگئی تھیں۔ چارلس کے عہد میں خصوصیت کے ساتھ ان سے قومی آزادی کی اسپرٹ کو کچلنے کے لئے خوب کام لیا گیا تھا۔

پارلیمنٹ یہ جانتی تھی کہ جب تک ان کا بالکلیہ قلع قمع نہ ہوگا سرزمین انگلستان سے استبدادی حکومت کا بیج نہ مٹ سکے گا۔ اس لئے عدالت اسٹار چیمبر جو پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تھی برخواست کردی گئی۔ کونسل کا ابتدائی اختیارِ سماعت اس سے چھین لیا گیا۔ البتہ بحیثیت عدالتِ مرافعہ اس کے اختیارات باقی رکھے گئے۔ کونسل اب بھی گرفتاری کے احکام نافذ کرنے کی مجاز تھی لیکن یہ شرط لگائی گئی کہ محروسین کا مقدمہ ملک کی عام عدالتوں میں پیش کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ کونسل کی دوسری کمیٹیاں کونسل آف دی نارتھ، کونسل آف ویلز وغیرہ برخواست کردی گئیں۔ کورٹ آف ہائی کمیشن کا بھی یہی حشر ہوا۔

قانون سازی کے اس طویل سلسلہ نے انگلستان کے دستور کو بڑی حد تک اس مقام پر پہنچا دیا جہاں سے "محدود شاہی" کی طرف پیش قدمی آسان تھی۔ بلکہ ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ دستور جس منزل کی طرف گامزن ہے اس کا اقتضاء یہ ہے کہ شخصی حکومت کا خاتمہ کیا جائے۔ اور قانون کی حکمرانی قائم کی جائے۔ نیز اس بات کی طمانیت حاصل کی جائے کہ مقننہ کو عاملہ پر تفوق اور برتری حاصل رہے گی، اور شاہی مطلق العنانی کے تمام راستے بند ہوجائیں گے۔

دار العوام میں پھوٹ

یہ تمام کام پارلیمنٹ نے پہلے اجلاس میں کیا۔ دار العوام میں اب تک نہ کوئی پھوٹ تھی اور نہ اختلاف۔ متذکرہ بالا قوانین بھاری اکثریتوں کے ساتھ منظور ہوئے تھے لیکن اس اجلاس کے ختم ہوتے ہوتے یہ یکجہتی اور اتفاق ختم ہوتا نظر آرہا تھا۔ دار العوام پہلی مرتبہ دو بڑے فریقوں میں بٹا ہوا نظر آنے لگا۔ جس مسئلہ پر پھوٹ پیدا ہوئی اس کا تعلق کلیسا سے تھا۔ ویسے دار العوام میں سب ہی اراکین پروٹسٹنٹ تھے لیکن قیادت زیادہ تر پیورٹنوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں بھی پریسبٹیرین

گروپ زیادہ چھایا ہوا تھا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ کلیسا کا مذہب ان کے معتقدات کے مطابق ہو۔ اور کلیسائی نظامِ حکومت پریسبٹیرین طرز کا قائم کیا جائے۔ اب تک جو کچھ کام ہوا تھا وہ زیادہ تر سیاسی اور دستوری نوعیت کا تھا۔ مذہبی اصلاح کا مسئلہ سامنے نہیں آیا تھا۔ اس لئے باہمی اتحاد اور یکجہتی میں کوئی رخنے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اب پیورٹن اس امر کی کوشش کرنے لگے کہ اسقفی نظامِ کلیسا کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ موجودہ "سرکاری کلیسا" کی پوری تنظیم بدل دی جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے معتقدات اور اس کی کتابِ عبادت، اس کے مخصوص مذہبی اعمال، اس کا ظاہری حسن اور خوبصورتی اور اس کی آرائش و زیبائش یہ سب کی سب مٹا کر رکھ دی جائیں یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پارلیمنٹ میں اور ویسے ملک بھر میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جو ان تمام متذکرہ چیزوں کی محض دلچسپی نہیں بلکہ ایک قسم کی والہانہ محبت رکھتے تھے۔ یہ لوگ اینگلیکن کہلاتے ہیں۔ اس گروہ کو یہ ہرگز پسند نہیں تھا کہ ان کا محبوب کلیسائی نظام یوں تباہ و تاراج کر دیا جائے۔ یہ گروہ مروّجہ نظام کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس پر وہ کسی حملہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ گو اس میں شک نہیں کہ اس فریق نے لاڈ کے بُرے وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں تھے کہ اینگلیکن کلیسا کے یہ پیرو اپنے بنیادی اصولوں کی قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ انھیں پریسبٹیرینوں سے سخت نفرت تھی۔ یہاں تک ان کا جو ساتھ دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگلستان کے دستور کو استبدادیت اور مطلق العنانی کے رجحانات سے بچانا چاہتے تھے۔ اب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ خطرہ بڑی حد تک مٹ چکا ہے۔ تاج پر ضروری پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک یہ قطعاً ضروری نہیں تھا کہ تاج کے اختیارات کی قطع و برید کا مزید سلسلہ جاری رکھا جائے یا کلیسائی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں۔

پریسبٹیرینوں اور اینگلیکنوں میں کشمکش

غرض کلیسا کے اسقفی نظامِ حکومت کو ختم کرنے کے لئے جب دارالعوام میں مسودہ بیخ و بُن (ROOT AND BRANCH BILL.) پیش کیا گیا تو اینگلیکن گروہ اس کے خلاف ایک سدِ آہنی بن کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے یہ بل پاس نہ ہو سکا۔ یہ اس پارلیمنٹ کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ دارالعوام دو گروہوں میں بٹ گیا۔ اس نے پہلے اسقفوں کو دارالامراء کی رکنیت

سے محروم کرنے کی جب تجویز پیش کی گئی تھی تو اینگلیکن فریق نے اس کی مخالفت نہیں کی ۔ اس لئے دارالعوام میں یہ مسودہ آسانی سے منظور ہوگیا۔ مگر دارالامراء نے اسے مسترد کر دیا۔ اینگلیکن اساقفہ کو پارلیمنٹ سے خارج کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن سرے سے "نظامِ اسقفیت" کو مٹانے کے لئے ہرگز رضامند نہ ہو سکتے تھے۔ اس مرحلہ پر اس فریق نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایسے دوراہے پر پہنچ گئے ہیں کہ جہاں پرسبٹیرینوں سے تعاون کے فیصلے پر انھیں نظرِ ثانی کرنی پڑے گی۔ انھیں کلیسا اور تاج دونوں خطرہ میں نظر آنے لگے۔ اسی لئے آہستہ آہستہ یہ گروہ اس کے بعد سے تاج کے طرفداروں میں شامل ہوگیا۔ اینگلیکنوں کی کلیسا سے وفاشعاری نے انھیں تاج سے وفاشعاری پر آمادہ کیا۔

احتجاجِ عظیم (GRAND REMONSTRANCE)

پارلیمنٹ میں اس پھوٹ کا واضح مظاہرہ اس وقت ہوا جب مختصر التوار کے بعد اس کا دوسرا اجلاس اکتوبر 1641ء میں شروع ہوا۔ پیورٹن گروہ چارلس سے اتنا بدگمان تھا کہ اس کی حکومت کی مذمت اور مزید اصلاحی پروگرام کے لئے اس نے ایک جامع دستاویز پیش کیا۔ یہ "احتجاجِ عظیم" (GRAND REMONSTRANCE) کہلاتا ہے۔ اس میں سب سے اہم مطالبہ یہ تھا کہ بادشاہ کے وزراء کا انتخاب اور تقرر پارلیمنٹ کی مرضی سے ہونا چاہئے۔ جب یہ متنازعہ فیہ دستاویز دارالعوام میں پیش کی گئی تو اینگلیکن گروہ نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ پیورٹن بھی اسی شدت سے اُسے منظور کروانا چاہتے تھے۔ اس مباحثہ میں بڑی تلخیاں پیدا ہوئیں۔ طرفین کا تند و تیز لب و لہجہ اور دونوں جانب جذبات کا غلو اس بات کو ظاہر کر رہا تھا کہ یہ اختلافِ رائے سے بڑھ کر افتراقِ عظیم تک جا پہنچی ہے۔ جہاں نہ صرف پارلیمنٹ بلکہ پوری قوم دو متحارب اور حریف گروہوں میں عنقریب بٹ جائے گی۔ اس دستاویز پر جب رائے دہی ہوئی تو یہ صرف گیارہ ووٹوں کی قلیل اکثریت سے پاس ہو سکا جبکہ رائے دہی میں شریک اراکین کی تعداد تین سو سے کچھ اُوپر تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دارالعوام کی تقریباً نصف ممبرشپ اپنے آپ کو بادشاہ سے وابستہ کر چکی تھی۔

پارلیمنٹ کے لیڈروں کی گرفتاری کی کوشش

چارلس نے احتجاجِ عظیم کو نامنظور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ حکم دیا کہ

دارالعوام کے پانچ اراکین کے خلاف مواخذہ کی کارروائی کا آغاز کیا جائے ۔ یہ پانچوں اشخاص چارلس کے بدترین دشمن اور ایوان کے سرکردہ اراکین میں سے تھے ۔ ان میں سے دو پِم اور ہیمپڈن خصوصیت کے ساتھ چارلس کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے ۔ مواخذہ کی کارروائی کے آغاز میں کچھ دیر ہوتی نظر آئی تو چارلس زیادہ صبر نہ کرسکا ۔ اور ایک ایسی افسوسناک حماقت کی کہ اس کے بعد مفاہمت کے تمام راستے بند ہوگئے ۔ وہ اپنے خدم وحشم کے ساتھ اچانک پارلیمنٹ جا پہنچا ۔ اپنے ان دشمنوں کو وہ برسر موقعہ گرفتار کرنا چاہتا تھا ۔ جب ایوان میں داخل ہوا تو ایک سناٹا چھا گیا ۔ دارالعوام کی تاریخ میں یہ ایک ایسا منظر تھا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ۔ یہاں اس نے دیکھا کہ اس کا شکار اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے ۔ چارلس کے منصوبہ کی یہاں پہلے سے خبر ہوچکی ۔ اس لئے اراکین ' ایوان کے پچھلے دروازے سے چھپتے چھپاتے فرار ہوگئے تھے ۔ چارلس کو بڑی خفت کا سامنا کرنا پڑا ۔ اس ناکامی کی بوکھلاہٹ میں جیسے آیا تھا ویسے خالی ہاتھ لوٹ گیا ۔ اس واقعہ کے بعد جس کو عام طور پر پارلیمنٹ کے امتیازات پر حملہ تصور کیا گیا ۔ فریقین نے یہ جان لیا تھا کہ اب دستوری نزاع کا فیصلہ پارلیمنٹ کے ایوان میں نہیں بلکہ جنگ کے میدان میں ہوگا ۔

جنگ کی تیاریاں

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہی دونوں طرف جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں ۔ پارلیمنٹ کے دو حصے ہوگئے ۔ دونوں ایوانوں کے شاہ پسند اراکین بادشاہ سے جا ملے ۔ جنگ کے آغاز سے پہلے پارلیمنٹ نے " ملیشیا (MILITIA) یا " قومی فوج " کو اپنے قبضہ میں لے لینا چاہا ۔ چنانچہ ایک مسودہ قانون پاس کیا گیا کہ ملیشیا کی فوجی کمان ' پارلیمنٹ کے مقرر کردہ افسروں کے ہاتھ میں ہوگی جو براست پارلیمنٹ کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیں گے ۔ بادشاہ نے اس مسودہ کو نامنظور کردیا ۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اس قسم کا انتظام سابقہ روایات اور عملدرآمد کے خلاف ہوگا ۔ پارلیمنٹ بہرحال اس حربہ سے بادشاہ کو محروم کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کو کوئی فوجی برتری حاصل نہ رہے اس غرض سے بادشاہ کے امتناع (VETO) کے باوجود پارلیمنٹ نے اس مسودہ کو بطور " آرڈی ننس " جاری کیا ۔ پارلیمنٹ نے یہ دعویٰ کیا کہ " تاج کے اشتراک اور تعاون کے بغیر بھی ' وہ قانون سازی کی مجاز ہے ۔ تاج کے اقتدار اعلیٰ کی حقیقی عمل آوری صرف پارلیمنٹ میں ہوسکتی ہے ۔ ان اعمال و افعال کے ذریعہ سے نہیں جن کا صدور (پارلیمنٹ سے باہر) صرف اس کی (بادشاہ کی)

ذات سے ہو" دوسرے الفاظ میں پارلیمنٹ اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ "اقتدارِ اعلیٰ بادشاہ کی ذات میں مرکوز نہیں ہے، بلکہ صرف عوام اس کے حامل ہیں۔ لہٰذا پارلیمنٹ عوام کی نمائندہ ہونے کے باعث تاج کے بغیر قانون سازی کی مجاز ہے" ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ کا یہ نظریاتی موقف اس دستور کی حدبندیوں اور قیود سے آگے نکل چکا تھا جس سے کہ اس عہد کا عام آدمی آشنا تھا۔ یا جس کو ازمنۂ وسطیٰ کی دین سمجھا جاسکتا تھا۔

اُنّیس تجاویز NINETEEN PROPOSITIONS.

پارلیمنٹ دستوری اصلاح نہیں بلکہ دستوری انقلاب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جنگ شروع ہونے سے پیشتر پارلیمنٹ نے "انیس تجاویز" کے نام سے نظمِ حکومت کا ایک خاکہ چارلس کو پیش کیا۔ اس میں پارلیمنٹ نے اپنے لئے وسیع اختیارات کا مطالبہ کیا تھا۔ اگر ان مطالبات کو مان لیا جاتا تو بادشاہ کے تمام عاملانہ اختیارات سلب ہو جاتے۔ نہ صرف اقتدارِ اعلیٰ عملاً پارلیمنٹ کو منتقل ہو جاتا بلکہ نظم ونسق کے تمام شعبے پارلیمنٹ کی راست ماتحتی میں آجاتے۔ کلیسا کی اصلاح کا کام اس کے سپرد ہو جاتا۔ اعلیٰ ترین سطح پر (بشمول اراکینِ کونسل وحکام عدالت وغیرہ) تمام عہدہ داروں کا تقرر اور برطرفی کا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہو جاتا۔ چارلس نے ان تجاویز کو سرے سے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ انھیں پہلی نظر میں اس نے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد ایک طویل خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا۔

خانہ جنگی

خانہ جنگی کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ ویسے لڑائی میں چارلس کو شکست ہوگئی لیکن اس کے مخالفین خود آپس میں لڑ پڑے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پرسبیٹرین گروہ کو جو پارلیمنٹ میں اکثریت رکھتا تھا، یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جس مقصد کے لئے انھوں نے قربانیاں دی ہیں وہ سب کی سب رائیگاں جائیں گی۔ ان کا عزیز ترین مقصد پرسبیٹرین کلیسا کا انگلستان میں رائج کرنا تھا مگر انھوں نے بڑی حیرانی سے یہ دیکھا کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ کیوں کہ فوج اس راستے میں حائل نظر آنے لگی۔ جنگ پارلیمنٹ نے نہیں بلکہ فوج نے جیتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ بات تعجب خیز نہیں تھی کہ آئندہ نظامِ سلطنت اور نظامِ کلیسا کے متعین کرنے میں

اس کا قدرتی طور پر بڑا ہاتھ رہے۔ یہ فوج جنگ کے زمانے میں بھرتی کی گئی تھی۔ اس کی تاسیس اور تربیت کا سہرا آلیور کرامول کے سر تھا۔ کرامول کی یہ "نیو ماڈل آرمی" انتہا پسند پیورٹنوں کا گڑھ تھی۔ یہ سب کے سب انڈی پنڈنٹ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اور ان کے مذہبی عقائد کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ لوگ پریسبٹیرین کلیسا کی تنگ نظری اور عدم رواداری کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کے قیام کے ہرگز روادار نہ ہوسکتے تھے۔ فوج کے انڈی پنڈنٹ اس لحاظ سے ایسا کلیسا چاہتے تھے جس میں جمہوریت اور ضمیر کی کامل آزادی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ اور فوج میں ٹھن گئی۔ پارلیمنٹ فوج کو راستے سے ہٹانا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے چارلس سے ایک خفیہ معاہدہ کرلیا کہ اگر وہ پریسبٹیرین کلیسا کے قیام کی ضمانت دے دے تو وہ اس کا تاج و تخت بحال کردے گی۔ چارلس نے خوشی سے یہ شرط مان لی۔ لیکن یہ بات اس نے صدق دل سے قبول نہیں کی تھی بلکہ پریسبٹیرینوں کو دھوکہ دینا چاہتا تھا۔ بہرحال فی الوقت پریسبٹیرینوں اور بادشاہ کا ایک نیا تحالف قائم ہوگیا۔ ان نئے حلیفوں نے اسکاٹیوں کی مدد سے جو قدرتی طور پر پریسبٹیرین کلیسا کے مؤید تھے پھر سے جنگ شروع کردی۔ یہ جنگ نیو ماڈل آرمی (انڈی پنڈنٹس) کے خلاف لڑی گئی۔ اس کو خانہ جنگی کا دوسرا مرحلہ سمجھنا چاہئے۔ فوج نے بہت جلد چارلس اور اس کے نئے حلیفوں کی مقاومت کا خاتمہ کردیا۔ اور انھیں شکست دے کر چارلس کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔

پریسبٹیرین اراکین کا پارلیمنٹ سے اخراج

1648ء کے ختم ہوتے ہوتے ملک کا تمام اقتدار سمٹ سمٹا کر فوج کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ حقیقی معنیٰ میں اس وقت اسی کا راج تھا۔ چارلس اس کے ہاتھ میں گرفتار رہا۔ اب فوج اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ پہلے چارلس کو اس کے کیفر کردار تک پہنچائے اور دوسری خانہ جنگی کی خونریزی کا اس سے بدلہ چکائے۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ محض اس کی دھوکہ دہی، سازش اور دغا کی وجہ سے دوسری خانہ جنگی میں ناحق خون بہا اور نہ جانے کتنی جانیں تلف ہوئیں۔

میدانِ جنگ سے واپس ہوتے ہی فوج نے پہلے پارلیمنٹ سے نمٹنے کی کوشش کی۔ اس کے اپنے آئندہ لائحہ عمل کو بروئے کار لانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ دارالعوام سے اس کے مخالفین

کی اکثریت کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ کرنل پرائیڈ (Col. PRIDE) نے فوج کے حکم پر پریسٹیرین اراکین کو ایوان سے نکال باہر کیا۔ ان میں سے بعض گرفتار کر لئے گئے اور بعضوں کا صرف اخراج عمل میں آیا۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوان میں صرف انڈی پنڈنٹ اراکین باقی رہ گئے اور پیرسٹیرین اراکین بڑی بے بسی اور ذلت سے خارج کر دیئے گئے۔ اب ایوان کی عددی طاقت اس کی حقیقی رکنیت کا آٹھواں حصہ رہ گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ شاید ہی پارلیمنٹ کہلانے کی مستحق تھی۔ اس عہد کے عوام نے تعجب نہیں کہ ان حالات میں اسے "رمپ" (RUMP) کا اہانت آمیز نام دیا تھا۔

بادشاہ کو سزا دینے کیلئے عدالت کا قیام

پرسبٹیرینوں کے اخراج کے بعد اب یہ ممکن ہوگیا تھا کہ فوج اور پارلیمنٹ (رمپ) یکجہتی سے کام کریں۔ سب سے پہلا مسئلہ چارلس کو سزا دینے کا تھا لیکن اس کارروائی کو کوئی دستوری شکل دینا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ واقعات اس مقام پر پہنچ گئے تھے جو کسی دستور کے احاطہ میں نہیں آسکتے تھے۔ ایک خونین انقلاب، دستور اور قانون کی پابندیوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب انگلستان میں یہی صورت تھی۔ بادشاہ مقید تھا۔ دارالامرا عملاً غائب ہوچکا تھا۔ دارالعوام مٹھی بھر سرپھرے انقلاب پسندوں کے قبضہ میں تھا۔ دستور پاش پاش ہوچکا تھا۔ ان حالات میں بادشاہ کے خلاف کارروائی کا جواز پیدا کرنے کے لئے دارالعوام نے اعلان کیا کہ "عوام اقتدارِ اعلیٰ کا حقیقی منبع ہیں۔ اور پارلیمنٹ عوام کی نمائندہ ہونے کے اعتبار سے اس اقتدار کی حامل اور امانت بردار ہے۔ بنابریں اس اقتدار کی عمل آوری میں وہ جو کچھ بھی قانون سازی کرے اس کی تمام قوم پابند ہوگی۔ ہرچند کہ اس قانون سازی کے عمل میں تاج اور دارالامرا کا تعاون حاصل نہ رہا ہو پارلیمنٹ (دارالعوام) کی منظوری حاصل ہو جانے کے بعد کسی بھی مسودۂ قانون کو مکمل قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور اس کا جواز ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوگا۔"

اس کے ساتھ ہی فوج کی ایما پر پارلیمنٹ نے چارلس پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک عدالت قائم کی۔ چارلس کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اس عدالت کے وجود اور اس کے

اختیار کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اس کے باوجود شہادتیں قلم بند کی گئیں۔ اور بالآخر چارلس کے قصاص کا حکم دیا گیا۔ چارلس پر قوم کے خلاف غداری کا الزام تھا: عدالت کے فیصلہ میں کہا گیا تھا کہ "چارلس نے محدود بادشاہت کی پابندیوں کو توڑ کر ایک ظالمانہ اور استبدادی حکومت قائم کی۔ ملک کے مسلّمہ اور بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کی اور قانون کو اپنا آلۂ کار بنالیا اور اپنی مرضی کو قانون کا منبع بنا کر عوام کے جائز حقوق، اختیارات اور آزادیوں کو پامال کرنے کی کوشش کی اور قوم سے جنگ آزما ہو کر ملک میں خوں ریزی کا باعث ہوا۔ لہٰذا وہ قوم کا دشمن ہے اور اس کا قصاص واجب ہے"

چارلس کا قصاص 30 جنوری سنہ 1649ء کو عمل میں آیا۔ ایک ہنگامہ پرور اور خونین داستان کا یہ آخری باب تھا۔

چھٹا باب

دولتِ عامہ

دستوری تجربات

فوجی آمریت

چارلس کے قصاص نے ایک دستوری خلا پیدا کر دیا۔ اب بادشاہ تھا نہ پارلیمنٹ۔ دارالامراء کا کہیں وجود نہیں تھا۔ دارالعوام تتر بتر ہو چکا تھا۔ چند مٹھی بھر انقلاب پسند افراد اپنے آپ کو دارالعوام کہتے اور خود کو پارلیمنٹ کے تمام اختیارات کے حامل سمجھتے تھے۔ لیکن یہ سب باتیں ہی باتیں تھیں۔ یہ چھوٹی سی کٹی پھٹی جماعت گو اپنے آپ کو پارلیمنٹ کہتی تھی مگر حقیقی اقتدار اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ملک میں اب صرف فوج مقتدرِ اعلیٰ تھی۔ ہر طرف اسی کا حکم چلتا تھا۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہر خونیں انقلاب کے بعد کسی نہ کسی نوعیت کی فوجی آمریت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ انگلستان میں اس وقت یہی ہوا۔ دستور کے تحفظ کے لئے جو جنگ لڑی گئی اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ دستور کا نام و نشان مٹ گیا۔ گو یہ ایک عارضی صورتِ حال تھی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہی کی جگہ فوجی آمریت نے لے لی تھی۔

اگرچہ اس وقت ملک پر فوج اور اس کے سربراہِ اعلیٰ آلیور کرامول کی حکومت تھی مگر یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ فوج کے حکام، چھوٹے بڑے عہدہ دار اور عام سپاہی سب کے سب پوری نیک نیتی سے یہ چاہتے تھے کہ ملک میں جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی جائے اور قومی اور انفرادی آزادی کو استبداد کا جو خطرہ لاحق ہے اس کا کما حقہٗ استیصال کیا جائے۔ فوج انڈی پنڈنٹ فرقہ کے پیروؤں پر مشتمل تھی۔ یہ سب کے سب جمہوریت کے دلدادہ تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مملکت اور کلیسا کے نظمِ حکومت میں جمہوری اقدار کارفرما رہیں۔ آلیور کرامول خصوصیت

کے ساتھ اس بات کا خواہشمند تھا کہ وہ اپنے مجصلہ اقتدار کو ایک دستوری جامہ عطا کرے۔ مگر باوجود اپنی سعی لاحاصل کے وہ اپنے آپ کو کبھی دستوری حکمران بنا نہ سکا۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ جو اقتدار تلوار کے بل بوتے پر حاصل کیا گیا ہے وہ دستوری پابندیوں کا متحمل نہیں ہوسکتا دستور اور فوجی انقلاب دو متضاد چیزیں ہیں۔ دونوں مشکل سے ایک جا جمع ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے "دولت عامہ" اور "پروٹکٹوریٹ (PROTECTORATE) کا دور حقیقی معنی میں فوجی آمریت کا زمانہ تھا۔ اگرچہ نظری طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا رہا کہ اس کی بنیادیں جمہوریت پر قائم کی گئی ہیں، اور یہ کوشش بھی کی جاتی رہی کہ فوجی اقتدار پر دستور کا پردہ ڈال رکھا جائے۔ لیکن اصل حقیقت چھپ نہیں سکتی تھی۔

عہد نامۂ عوام AGREEMENT OF THE PEOPLE.

ان حالات میں تعجب نہیں کہ دستور سازی کے مختلف تجربات ہوتے رہے۔ فوج کے اونچے حلقوں میں بادشاہ کے قتل سے پہلے ہی آئندہ دستور کے بارے میں خیال آرائیاں اور مباحثے جاری تھے۔ عام طور پر پیورٹن اور خصوصیت کے ساتھ انڈی پنڈنٹ فرقے حکومت کی بنیاد عوام کی مرضی پر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ دل سے ایک ایسی عوامی حکومت کے خواہاں تھے جو عوام کے اقتدار کی عکاسی کرے۔ ان کے سیاسی نظریات میں انتہاپسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ خلوص نیت کے ساتھ اس بات کے قائل تھے کہ حکومت عوام کی ہو، عوام کے لئے ہو اور عوام کے ذریعہ سے روبہ عمل لائی جائے۔ اس لامتناہی بحث و تمحیص میں نظم حکومت اور دستور کے مختلف خاکوں کو پیش کیا جاتا رہا۔ اور ان پر غور و فکر کا سلسلہ جاری رہا۔ ان تجاویز کے ضمن میں خصوصیت کے ساتھ ایک ایسی تجویز بھی سامنے آئی کہ اگر اس کو قبول کر لیا جاتا تو سترھویں صدی میں ہی انگلستان کا دستور کلی طور پر جمہوریت پر مبنی ہو جاتا۔ مگر دستور کا یہ خاکہ محض ایک تجویز کی شکل میں ہی رہ گیا۔ اصل دستاویز کو چارلس کے قتل سے پہلے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ یہ عام طور پر "عہد نامۂ عوام" (AGREEMENT OF THE PEOPLE.) کے نام سے موسوم ہے۔ انگلستان میں تحریری دستور سازی کی شاید یہ پہلی کوشش تھی۔ اس میں عوام تمام اقتدار کا سرچشمہ قرار دیئے گئے تھے۔ حکومت کے مختلف اعضا کو جو اختیارات دیئے تھے ان کی حد بندی کر دی گئی تھی۔ بنیادی تصور یہ تھا کہ عوام اپنے لئے اپنی مرضی کی حکومت کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ اور حکومت صرف انہی اختیارات

کی حامل ہوگی جو صراحتاً اسے تفویض کئے گئے ہوں اور وہاں "اساسی حقوق" میں جن کی صراحت کی گئی تھی، کسی تغیر یا تبدیلی کی مجاز نہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ آئین ایک چھوٹی سی انتہا پسند جماعت کے سیاسی تصورات کا آئینہ دار تھا۔ انگلستان کے عوام کی اکثریت غالباً ان تصورات کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس مجوزہ آئین کی، چونکہ کوئی عملی صورت گری نہ ہوسکی اس لئے اس کو صرف نظریاتی اہمیت حاصل ہے۔ اس سے البتہ یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ سترھویں صدی میں تشکیلِ حکومت کے نظریات کس حد تک انقلاب آفرین ہوگئے تھے۔

دولتِ عامّہ کا قیام

چارلس کے قتل کے بعد سب سے اہم مسئلہ نئی حکومت کی تشکیل کا تھا۔ رمپ (RUMP) نے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اکتالیس (41) اراکین پر مشتمل کونسل آف اسٹیٹ کا تقرر کیا۔ خارجی اور داخلی نظم ونسق کلیتہً اس کے سپرد کر دیا گیا۔ حکومت کی عارضی تشکیل کے بعد پارلیمنٹ (رمپ) نے بعض دوسرے اہم اقدامات کئے۔ ادارہ شاہی کو یکقلم موقوف کیا گیا اور اسی سلسلہ میں دارالامراء کا خاتمہ بھی عمل میں آیا۔ ان اداروں کا فی الواقع پہلے ہی خاتمہ عمل میں آچکا تھا، پارلیمنٹ نے اسی حقیقت کو مستقل قانونی شکل دے دی۔ کچھ عرصہ بعد اعلان کیا گیا کہ "انگلستان اور اس کے متعلقہ تمام علاقوں) کو "دولتِ عامّہ" اور ایک "آزاد مملکت" کی حیثیت حاصل رہے گی۔ یہاں کا نظمِ حکومت اب قوم کے اقتدارِ اعلیٰ پر مبنی، قوم کے نمائندوں یعنی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہوگا اور ایسے وزراء اور عہدہ داروں کے ذریعہ سے روبہ عمل لایا جائے گا جنھیں عوامی فلاح وبہبود کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔" اس قانون سازی کا مقصد یہ تھا کہ نظامِ حکومت کے لئے کوئی جمہوری بُنیاد تلاش کرلی جائے۔ پارلیمنٹ کے انتہا پسند اراکین یہ سمجھتے تھے کہ ملک کا وہ دستور جس کے پرخچے اُڑانے میں انھوں نے ہاتھ بٹایا تھا اب ایسا فرسودہ اور از کار رفتہ ہوگیا ہے کہ قوم کے جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ "رمپ" نے یہ سب کام بادشاہ کے قتل کے بعد دو تین مہینوں کے اندر مکمل کرلیا اور انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کی ایک متحدہ "آزاد مملکت" کے قیام کی داغ بیل ڈالی۔ اور اس کو "دولتِ عامّہ" یا "کامن ویلتھ" کا نام دیا۔

فوج اور رمپ میں اختلافات

لیکن یہ سب انتظامات بالکل عارضی ثابت ہوئے۔ کیونکہ پارلیمنٹ اور فوج کے درمیان بُنیادی

اختلافات رُونما ہونے لگے ۔ جب تک نئی حکومت اندرونی و بیرونی خطرات میں گھری ہوئی رہی یہ اختلافات کچھ دبے دبائے سے رہے ۔ آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں بغاوتیں ہوگئی تھیں ۔ ان کا کچلنا ضروری تھا ۔ اس لئے فوج ان فتنوں کی سرکوبی میں مشغول رہی ۔ اسی ضمن میں ہالینڈ سے بھی جنگ شروع ہوگئی ۔ جب ان خطرات سے کچھ نجات ملی تو فوج نے زیادہ شدت سے یہ مطالبہ کرنا شروع کیا کہ پارلیمنٹ اپنے آپ کو برخواست کر دے اور ایک نئی پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے جگہ خالی کر دے ۔ مگر رمپ کے اراکین کو اقتدار کا ایسا چسکہ لگ گیا تھا کہ وہ کسی طرح اس سے دستکش ہونے کے لئے تیار نہیں تھے ۔ فوج نہایت نیک نیتی سے یہ چاہتی تھی کہ ملک کے لئے جلد سے جلد کوئی ایسا دستور بنا دیا جائے جو جمہوریت پر مبنی ہو تاکہ اقتدار عوام کے حقیقی نمائندوں کو سونپ دیا جاسکے ۔ اس غرض کے لئے متعدد کانفرنسیں ہوئیں ۔ بات چیت کا سلسلہ جاری رہا ۔ مختلف تجاویز پر غور کیا گیا ۔ رفتہ رفتہ یہ بات فوج کے عہدہ داروں پر عیاں ہوئی کہ رمپ کے موجودہ اراکین کسی طرح اپنی نشستیں چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں ۔ اور یہ کہ اس انکار و لیت و لعل میں شخصی مفادات کے تحفظ کا جذبہ کارفرما ہے ۔ ان کی دیانت اور ایمانداری بھی مشتبہ تھی ۔ بالکل آخری صورت میں رمپ کے اراکین یہ چاہتے تھے کہ خواہ کوئی پارلیمنٹ بھی منتخب ہو کر آئے ۔ ان کی اپنی رکنیت بالاستقلال' بلا انتخاب کے برقرار رہے ۔ اور ان کی حیثیت نئی پارلیمنٹ میں ایک ایسی نگران جماعت کی سی ہو جو انتخابات سے متعلق تمام امور کی جانچ پڑتال کرنے کی مجاز رہے ۔ ان مطالبات کے بعد فوج کے لئے پانی سر سے اُونچا ہوگیا ۔ آلیور کرامول' جو فوج کا اس وقت سربراہ تھا پارلیمنٹ کا بھی ممبر تھا' اس پر بھی یہ بات عیاں ہوگئی کہ پارلیمنٹ نہ صرف اپنے آپ کو برقرار رکھنا چاہتی ہے بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے فوج کو ہی راستے سے ہٹانے کی تجویزوں پر غور کر رہی ہے ۔

رمپ کی بہ جبر برخواستگی

بات جب یہاں تک پہنچی تو آلیور کرامول نے یہ فیصلہ کیا کہ اس نام نہاد پارلیمنٹ کا بہ جبر خاتمہ کر دیا جائے ۔ اس کو ہٹانے کی کوئی اور صورت نہیں تھی ۔ چنانچہ وہ ایک چھوٹے سے فوجی دستے کو لے کر دارالعوام پہنچا ۔ فوجیوں کو باہر چھوڑا ۔ اور خود ایوان میں داخل ہوا اور اپنی نشست پر خاموشی سے بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر' جو تقریریں ہو رہی تھیں انھیں سنتا رہا ۔ اس کے بعد اُٹھ کر

خود تقریر شروع کی اور اپنے ساتھی ارکین کو سخت لعنت و ملامت کی۔ ان پر الزام لگایا کہ وہ اب مفاد پرستی اور خود غرضی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان کو اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آپ کو پارلیمنٹ کی حیثیت سے برقرار رکھیں۔ اس نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ انھیں نکال باہر کیا جائے چنانچہ اس کے اشارے پر فوجی اندر گھس آئے اور تمام ارکین کو بہ جبر نکال باہر کیا۔ اس پر ایوان میں بڑا شور و غوغا ہوا لیکن چند لمحوں میں مطلع صاف ہو گیا۔ طویل پارلیمنٹ فوج کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ ایوان کے دروازوں پر تالے ڈال دیئے گئے۔[1] (20 اپریل 1653ء)۔

طویل پارلیمنٹ کا یہ حسرتناک انجام اس عہد کے متعدد طوفانی مناظر میں سے ایک ہے۔ جن کے کچھ مرقعے اس سے پہلے ہی نظروں کے سامنے آچکے ہیں۔ فوج پارلیمنٹ کو برخواست کر کے جلد سے جلد کوئی نیا دستور ملک میں نافذ کرنا چاہتی تھی۔

بیربون پارلیمنٹ

اس غرض کے لئے ایک نئی پارلیمنٹ بلائی گئی۔ یہ فی الحقیقت کسی دستوری مفہوم میں پارلیمنٹ نہیں تھی۔ اس کو زیادہ سے زیادہ کنونشن کہا جاسکتا ہے۔ اس کے ارکین کا عام انتخاب عمل میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ مقامی انڈی پنڈنٹ کلیسا کی (.CONGREGATIONS) جماعتوں کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ "خدا ترس" اور "نیک" لوگوں کو اپنے اپنے حلقوں سے نامزد کر کے روانہ کریں۔ یہ نامزد کردہ ارکین کی جماعت اپنے ایک رکن "بیربون" کے نام سے موسوم ہوگی۔ اور عام طور پر بیربون پارلیمنٹ کہلاتی ہے۔ اس کے ارکین خواہ کیسے ہی خدا ترس کیوں نہ ہوں، وہ بہر حال اس منصب کے لائق نہیں تھے جس کے لئے انھیں طلب کیا گیا تھا۔ وہ نظری بحثوں میں اُلجھ گئے اور ایسی ناقابل عمل تجویزوں پر غور کرنا شروع کیا کہ جن کا موقتی عملی سیاست سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ آلیور کرامول بھی تنگ ہو گیا۔ مگر کرامول کو اس مصیبت سے نجات اس طرح ملی کہ خود اس پارلیمنٹ نے اپنے اختیارات کرامول کے سپرد کر کے اپنے آپ کو تحلیل کر دیا۔ یہ صرف چند مہینے نشست کر سکی۔ اس کو "چھوٹی پارلیمنٹ" بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کے ممبروں کی تعداد 156 سے زیادہ نہیں تھی۔

---

[1] کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد کسی من چلے نے ایوان پارلیمنٹ پر یہ الفاظ تحریر کر دیئے ہے:—
"یہ مکان کرایہ کے لئے خالی ہے"

آئینِ حکومت اور پروٹکریٹ کا قیام

فوج نے ان کے بعد کچھ زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ ایک نیا دستور تیار کیا گیا۔ اس کے بنانے میں فوج کے ایک اعلیٰ عہدہ دار اور کرامول کے داماد آئرٹن (IRETON.) اور لیامبرٹ کا خاص حصہ تھا۔ یہ دستور (INSTRUMENT OF GOVT.) آئینِ حکومت کے نام سے موسوم ہے۔ کرامول نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس دستور کو بنانے کے لئے نہ کوئی دستور ساز اسمبلی بلائی گئی اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ریفرنڈم یا عام رائے شماری کی شکل میں عوام کی اس بارے میں مرضی معلوم کی جائے۔

"آئینِ حکومت" پہلا تحریری دستور ہے جو انگلستان میں نافذ کیا گیا۔ (دسمبر 1653ء)۔ اس کو انگلستان کے تدریجی اور ارتقا پذیر دستور سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس سرزمین کے لئے یہ ایک ایسا پودہ تھا جس کو یہاں کی آب و ہوا راس نہ آسکتی تھی۔ انگلستان کا سیاسی مزاج کسی زمانے میں بھی تحریری دساتیر سے کوئی مناسبت یا دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا تعجب نہیں کہ یہ یہاں کی سرزمین میں جڑ پکڑ نہ سکا۔ اس آئین کے ذریعہ سے انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کی متحدہ مملکت وجود میں لائی گئی۔ ویسے یہ متحدہ مملکت عملاً پہلے سے قائم تھی لیکن اب اس کے وجود کو قانوناً تسلیم کیا گیا۔ اس کو دولتِ عامّہ کا نام دیا گیا۔ عوام اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ تھے۔ دستور کی بنیاد یہی اقتدار تھا۔ اس اقتدار کی عمل آوری کے لئے مختلف اعضائے حکومت کے اختیارات کی تصریح اور حد بندی کی گئی۔ مملکت کا سربراہِ اعلیٰ لارڈ پروٹکٹر تھا۔ دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی آلیور کرامول کو لارڈ پروٹکٹر تسلیم کیا گیا۔ اس کو وسیع عاملانہ اختیارات دیئے گئے تھے۔ لیکن ان کی حد بندی بھی کر دی گئی تھی۔ عاملانہ فرائض میں "کونسل" کو اس کا شریکِ کار بنایا گیا۔ کونسل کے ممبروں کے انتخاب کا حق پہلی مرتبہ کرامول کو دیا گیا۔ لیکن بعد میں ان کے تقرر و برطرفی میں پارلیمنٹ کی توثیق اور منظوری ناگزیر تھی۔ یہی حال ملک کی دوسری اعلیٰ خدمات کا تھا۔ نظم و نسق میں کونسل، لارڈ پروٹکٹر پر ایک دیدہ نگران تھی۔ کرامول کے بعد پروٹکٹر کا انتخاب کونسل کے سپرد کیا گیا تھا۔

مملکت کے قانون سازی کے اختیارات لارڈ پروٹکٹر اور پارلیمنٹ کو دیئے گئے تھے۔ پارلیمنٹ کی بڑی حد تک اصلاح کر دی گئی تھی۔ ایسے بار روز دبلدی شہر، جو صرف برائے نام نقشہ پر

تھے۔ یا جہاں آبادی خال خال تھی حقِ نمائندگی سے محروم کردیئے گئے۔ عام طور پر نمائندگی کے لئے کثیر آبادی کے مقامات کو چُنا گیا۔ اس طرح بعض نئے بڑے بڑے شہر مثلاً مانچسٹر اور لیڈس پہلی مرتبہ پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل کرسکے۔ پارلیمنٹ صرف ایک ایوان دارالعوام پر مشتمل تھی۔ اس میں انگلستان سے چارسو اور اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ سے تیس تیس اراکین کے چُنے جانے کا انتظام کیا گیا۔ اضلاع کو نئی پارلیمنٹ میں زیادہ نمائندگی دی گئی۔ اور باروز (BOROUGHS.) کی رکنیت کو گھٹا یا گیا۔ یہ انتظام آبادی کے تناسب کے لحاظ سے کیا گیا۔ حقِ رائے دہی کا ایک واضح معیار قائم کیا گیا۔ صرف ایسے اشخاص رائے دہی میں حصہ لینے کے مجاز تھے جو کم ازکم دو سو پونڈ سالانہ مالیت کی زمین یا جائیداد رکھتے ہوں۔ اس سے حقِ رائے دہی صرف ذی حیثیت اور صاحب جائیداد افراد کے لئے مختص ہوگیا۔ ہرچند یہ بات جمہوری اصولوں کے منافی تھی لیکن اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ تحدید ضروری سمجھی گئی۔ اس خامی کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ پارلیمنٹ اب زیادہ نمائندہ حیثیت کی حامل تھی۔ آئندہ چار انتخابات تک ایسے لوگ رائے دہی میں حصہ نہیں لے سکتے تھے جنھوں نے پارلیمنٹ کے خلاف جنگ کی تھی۔ آئرلینڈ کے باغیوں اور کیتھولکوں کو ہمیشہ کے لئے حقِ رائے دہی سے محروم کیا گیا۔ ہر تین سال کے بعد نئی پارلیمنٹ کا انعقاد لازمی قرار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ انتظام بھی کیا گیا کہ کوئی پارلیمنٹ انعقاد کے بعد پانچ مہینے سے کم مدت میں تحلیل نہیں کی جاسکے گی۔

قانون سازی میں پروٹکٹر کو ایک عارضی (ویٹو) حقِ امتناع حاصل تھا لیکن اگر پارلیمنٹ دوبارہ اس مسودہ کو پاس کردے تو ویٹو کا اثر زائل ہوجائے گا اور بلا لحاظ منظوریِ پروٹکٹر اس کو قانون کی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ عام طور پر کسی مسودۂ قانون کو منظور کرنے کے لئے پروٹکٹر کو بیس دن کی مہلت دی گئی تھی۔ اگر اس مدت میں منظوری حاصل نہ ہو تو بھی مسودۂ قانون کی حیثیت حاصل کرے گا۔ دستور کی ترمیم کے لئے بظاہر کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ مذہبی آزادی میں تمام عیسائی فرقے برابر کے شریک تھے۔ صرف کیتھولکوں اور اسقفی کلیسا والوں (PRELACY) کو اس سے محروم کیا گیا تھا۔

آئینِ حکومت" پیورٹن انقلاب کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ باوجود نیک نیتی کے کرامول اس آئین کو زیادہ مفید اور کارآمد نہ بنا سکا۔ وہ دستوری حکمران نہ بن سکا۔ اس کی کسی پارلیمنٹ سے نہ بن سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حکومت کی بُنیاد آئین و دستور سے زیادہ

فوجی طاقت پر رکھی گئی تھی۔ اس کی ناکامی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے بالآخر میجر جنرلوں کے ذریعہ سے حکومت کی۔ ہر ضلع پر ایک میجر جنرل کا تقرر کیا گیا تھا۔

پیورٹن انقلاب کے نتائج

ہر چند پیورٹن انقلاب ملک میں جڑ پکڑ نہ سکا۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ پیورٹن اقتدار کا کم و بیش بیس سالہ دَور دستوری ترقی کے لئے محض رائگاں ثابت ہوا۔ پیورٹنوں نے اپنے نظریات کے گہرے ارتسامات ملک کی تاریخ پر چھوڑے ہیں۔ گو بادی النظر میں یہ بات اتنی واضح نہیں ہے۔ اگرچہ انگلستان ری پبلیکن جمہوریہ نہیں بن سکا لیکن عوامی اقتدار اور جمہوریت کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہوگئیں۔ انگلستان میں شاہی کا رجحان اس قدر شدید تھا کہ پیورٹنوں کے اقتدار کے زمانے میں کرامول کی ایک پارلیمنٹ نے "معروضہ و مشورہ ادب" (HUMBLE PETITION & ADVICE) کے نام سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ تاج و تخت حاصل کرکے اپنی بادشاہی کا اعلان کردے۔ کرامول نے اسے منظور نہیں کیا۔ لیکن اس سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ انگلستان کے لوگ کسی ایسے نظام حکومت سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے جس میں ادارۂ شاہی کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ ادارۂ شاہی سے وابستگی کے یہ معنیٰ نہیں تھے کہ شاہی استبداد اور مطلق العنانی کی مضرتوں کو قوم نے بھلا دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پیورٹن انقلاب کی ایک بڑی خدمت یہ تھی کہ اس نے شاہی استبداد کے امکانات بہت موہوم کردیئے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آئندہ زمانے میں مطلق العنان شاہی کے احیار کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن اس کوشش کی ناکامی اس سیاسی شعور کی وجہ سے جو گزشتہ بیس سالہ کشمکش میں پیدا ہوا تھا روزِ اول سے مقدر ہوچکی تھی۔

اس عہد نے پارلیمنٹ پر اپنے جو اثرات چھوڑے ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دارالعوام مسلسل طاقتور ہوتا گیا۔ اس کی فوقیت اور برتری ہر منزل پر نمایاں تھی۔ وہ قوم کا ایک ایسا فورم بن گیا تھا جہاں سے قوم کی متحدہ اور طاقتور آواز ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ رائے عامہ کا آئینہ دار بھی تھا، اور تشکیل کار بھی۔ دارالامراء

اپنی بحالی کے بعد بھی دارالعوام کی قیادت اور لیڈرشپ سے متعرض نہ ہوسکا۔ جہاں تک حکومتی معاملات اور رقومات کی منظوری کا سوال ہے دارالعوام کو کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "عود شاہی" کے بعد باستثنائے جیمز دوم کسی بادشاہ کی یہ ہمت نہ ہوسکی کہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ایک حبّہ سیاہ بھی قوم سے اپنے طور پر حاصل کرسکے۔

پیورٹن انقلاب نے کیتھولک مذہب کی خفیہ اور برملا آرزوؤں کو ہمیشہ کے لئے پامال کردیا۔ قوم کو اس سے اور پاپائیت سے ایسی نفرت ہوگئی تھی کہ آئندہ جب کبھی اس کے احیاء کا خطرہ پیدا ہوا اس کو کوئی جائے امان نہیں مل سکی۔

ساتواں باب

عودِ شاہی

1660ء

چارلس دوم

عودِ شاہی کے انتظامات

کرامول کے انتقال کے بعد (1658ء) دولتِ عامہ اور پروٹکٹریٹ کا نظامِ حکومت قائم نہ رہ سکا۔ کم و بیش دو سال افراتفری میں گزر گئے۔ پارلیمنٹ اور فوج میں بار بار چپقلش پیدا ہونے لگی۔ 1653ء کا دستور عملاً معطل ہو چکا تھا۔ اس سے ملک میں بدنظمی کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان حالات میں ایک ممتاز فوجی جنرل نے جو اس وقت اسکاٹ لینڈ میں متعین تھا بعض ایسے اقدامات کئے جن سے عودِ شاہی کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ جنرل مانک (MONK) اپنی فوج کے ساتھ اسکاٹ لینڈ سے لندن آیا۔ رمپ جس کو کرامول نے بہ جبر برخواست کیا تھا دوبارہ طلب کی گئی۔ اس میں ان ارکین کو بھی شریک کیا گیا جن کا اخراج 1648ء میں عمل میں آیا تھا۔ طویل پارلیمنٹ کے یہ اجزائے پریشاں اس طرح دوبارہ بحیثیت پارلیمنٹ کے جمع اُٹھے لیکن اس کو صرف اس غرض کے لئے طلب کیا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو تحلیل کر دے۔ کیونکہ قانوناً اس کی اپنی مرضی کے بغیر وہ برخواست نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اب بیس سال کے بعد خود اس کے اپنے فیصلے سے یہ پارلیمنٹ تحلیل ہوگئی۔

جنرل مانک اس عرصہ میں شہزادہ چارلس سے ربط پیدا کر چکا تھا جو باپ کے قتل کے بعد سے اب تک یورپ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کو دوبارہ انگلستان آکر تاج و تخت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ چارلس نے اس دعوت کو قبول کیا اور 1660ء میں

انگلستان پہنچ کر اپنی کھوئی ہوئی میراث دوبارہ حاصل کرلی۔

اس واقعہ کو انگلستان کی تاریخ میں "عودِ شاہی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بظاہر یہ بات حیرت ناک معلوم ہوتی ہے کہ انگلستان میں ادارہ شاہی کا احیاء ہو اور گزشتہ بیس سال میں اس کی وجہ سے جو قتل و غارت اور خون خرابہ ہوا تھا اس کو اس آسانی سے بھلا دیا جائے۔ اصل میں قوم نے حالیہ دستوری تجربہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس دَور میں جس پارٹی کو اقتدار حاصل رہا اس نے اپنی انتہا پسندیوں اور تنگ نظریوں سے قوم کو سخت ناراض کر دیا تھا۔ یہ لوگ اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کھو چکے تھے۔ بلکہ یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ قوم ان سے اتنی نالاں تھی کہ پرانے دستور کے احیاء کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگی تھی۔ اس حقیقت کو دہرانے کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ اہلِ انگلستان گزشتہ دَور کی دستوری اُکھاڑ پچھاڑ سے کوئی ذہنی ربط پیدا نہ کر سکے۔ ان کے لئے نیا دستور ایک ایسا پودا تھا جو اُن کی سرزمین کی آب و ہوا میں پنپ نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے پیورٹنوں کے ان تمام دستوری تجربات کو یکقلم مسترد کر دیا۔ وہ اپنے اس قدیم دستور کی طرف مراجعت کرنا چاہتے تھے جس میں ادارہ شاہی بھی ہو، پارلیمنٹ بھی، دارالعوام بھی ہو، دارالامرا بھی۔ پارلیمنٹ بھی وہ نئی اصلاح یافتہ پارلیمنٹ نہیں چاہتے تھے بلکہ کھلے نقائص کے باوجود وہ وہی پارلیمنٹ چاہتے تھے جس کی داغ بیل ان کے آباء و اجداد نے ڈالی تھی۔ یہ محض اس وجہ سے تھا کہ انگریز صرف ارتقائی دستور کو سمجھ سکتا اور مان سکتا تھا۔ وہ تحریری دستور کو اپنے جسدِ سیاسی میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

طویل پارلیمنٹ کی تحلیل کے فوراً بعد ایک کنونشن پارلیمنٹ طلب کی گئی۔ اس کے انتخاب کے لئے قدیم حلقہ ہائے انتخاب سے نمائندوں کو طلب کیا گیا۔ ازمنۂ وسطیٰ سے پارلیمنٹ کی جو ترتیب و تنظیم چلی آ رہی تھی اسی بنیاد پر اس کی تشکیل عمل میں آئی۔ قدیم دستور کی بحالی کی سمت میں یہ پہلا قدم تھا۔ اس کو پارلیمنٹ کا پورا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کی طلبی "شاہی حکم ناموں" (ROYAL WRITS.) کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آئی تھی۔ اسی لئے اس کو کنونشن پارلیمنٹ کہتے ہیں۔ اسی پارلیمنٹ کے ایماء اور منشاء کے پیش نظر جنرل مانک نے چارلس کو انگلستان آنے کی دعوت دی۔

یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ قوم نے یا پارلیمنٹ نے چارلس (دوم) کی بحالی کے لئے کوئی شرطیں عاید نہیں کیں۔ اس سے وعدے یا تیقنات نہیں لئے گئے۔ دستور کے لئے

کوئی نئی ضمانتیں حاصل نہیں کی گئیں۔ سابقہ دور میں شاہی اختیارات کے غلط استعمال کا نہ کہیں ذکر روا رکھا گیا اور نہ آئندہ اس کو روکنے کے لئے کوئی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ پارلیمنٹ نے دستور کی حفاظت کے لئے نئے قوانین پاس کئے اور نہ بادشاہ کے اختیارات و فرائض کی کہیں حدبندی کی گئی۔ پرانے بکھیڑوں کو چھیڑے بغیر نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ چارلس دوم کو بادشاہ مان لیا گیا۔ اور یہ سب کام اس طرح ہوا جیسے کہ انگلستان میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ نہ کوئی انقلاب آیا تھا نہ قتل و خون ہوا تھا اور نہ دستوری ڈھانچے کو سرے سے بدلنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بلکہ عملاً یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ چارلس اول کے قتل کے ساتھ ہی اس کا بیٹا چارلس دوم بادشاہ ہوگیا۔ درمیانی عرصہ میں جو کچھ ہوا اسے یکسر نظرانداز کیا گیا۔ اس نقطۂ نظر کے قانونی مضمرات پر آئندہ غور کیا جائے گا۔

عودِ شاہی کے دستوری نتائج

ادارۂ شاہی کی اس طرح بحالی سے یہ گمان ہوسکتا ہے کہ گزشتہ بیس سالہ کشمکش بے سود اور رائیگاں ثابت ہوئی اور عودِ شاہی دستوری ترقی کی شکست کا برملا اعتراف ہے۔ ایسا خیال صحیح نہیں۔ چارلس دوم نے جو وراثت حاصل کی وہ اس سے بہت مختلف تھی جو جیمز اول یا چارلس اول کو ملی تھی۔ طویل پارلیمنٹ اپنے رسواکن انجام کے باوجود اپنے پہلے سیشن میں جو قوانین منظور کرچکی تھی وہ دستور کا جزو بن چکے تھے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ قوانین مطلق العنان شاہی پر کاری ضرب لگا چکے تھے اور اس کے احیاء کے امکانات کو بہت کمزور کردیا تھا۔ اس کے قطع نظر وقت کا بہاؤ زمانے پر اپنے ارتسامات چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ چارلس کو اس بات کا احساس تھا کہ قوم کا کاروان دستوری استحکام کی منزل کی طرف ایک طویل مسافت طے کرچکا ہے۔ تصورات اور نظریات جہاں تک آگے بڑھ چکے ہیں وہاں سے ان کا پیچھے ہٹنا ایک خیالِ عبث ہے۔ قوم کا ذہن اور شعور ایک خاص سمت میں گامزن رہ چکا تھا۔ اور چند بنیادی تصورات سے اب ہر ذہن آشنا تھا۔ یہ بات کم و بیش سب کی سمجھ میں آگئی تھی کہ پارلیمنٹ کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے کہ بادشاہ اس کو نظرانداز بھی کرے اور ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہے۔ اس حقیقت کے تاڑنے والوں میں چارلس دوم کو سرفہرست سمجھنا چاہئے۔ چارلس بے حد ذہین آدمی تھا۔ وہ یہ جان گیا تھا کہ اس کے اقتدار کی کچھ حدیں مقرر ہوگئی ہیں۔ گو اس حدبندی کا اعلان کسی قانون یا

دستور کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا تھا۔ ان حدود کو توڑنا معصیت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ اگر پارلیمنٹ کسی مسئلہ پر اپنی رائے پر مُصر ہو جائے تو اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ بادشاہ اس سے اغماض برتے، یا اس کے برخلاف اپنی من مانی چلانے کی کوشش کرے۔ پارلیمنٹ پر شاہی تاخت کے دن گزر چکے تھے۔ اب تو جگہ جگہ اسے سپر ڈالنا تھا۔

جو حقیقت سامنے آئی تھی وہ پارلیمنٹ کی برتری اور سیادت تھی۔ اس برتری اور تفوّق کو کسی جگہ کبھی الفاظ میں ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس کا اعلان پارلیمنٹ کے قوانین کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا اور نہ اس کو دستور اور آئین کی شکل میں مدوّن کیا گیا۔ اس کا مادّی وجود کہیں نظر نہیں آتا مگر زمانے کے شعور اور مافی الضمیر میں یہ تصور جاگزیں ہو چکا تھا۔ قوم میں ایک عام تصور یہ پیدا ہو چلا تھا کہ کسی مسئلہ کو حل کرنے کے ضمن میں بحث و مباحثہ جب فیصلہ کی منزل پر پہنچ جائے تو اس آخری فیصلہ کی مجاز پارلیمنٹ ہوگی نہ کہ بادشاہ۔ یہ فیصلہ ایسا قطعی مختتم اور اٹل ہوگا کہ اس کے بعد کسی گوشہ سے چوں وچرا کی گنجائش نہ رہے گی۔ کسی ملک میں بھی قطعی اور مختتم فیصلہ کا اختیار صرف مقتدرِ اعلیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ۱۶۶۰ء کے بعد سے پارلیمنٹ اقتدارِ اعلیٰ کی حقیقی امین اور حامل بن چکی تھی۔ اور اس کے اقتدار کو بادشاہ اپنے مفادات کو خطرے میں ڈالے بغیر زیرِ بحث نہیں لا سکتا تھا۔ اقتدارِ اعلیٰ کی پارلیمنٹ کو یہ سپردگی بظاہر پردۂ خفا میں رہی۔ عام نظریں نہ اس حقیقت کو دیکھ سکتی تھیں اور نہ سمجھ سکتی تھیں کیونکہ بادشاہ سے اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے چھینے جانے کا کوئی بیّن مادی ثبوت موجود نہیں تھا۔ اس کی کج کلاہی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تاج اب بھی اسی کے سر پر تھا۔ اور قوم پارلیمنٹ کے ذریعہ سے جو کچھ فیصلے کرتی تھی وہ تاج کے نام پر اور بظاہر تاج کے حکم سے کرتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ محسوس نہیں ہوا کہ عودِ شاہی کے ساتھ ہی تاج نے بہت کچھ کھو دیا اور پارلیمنٹ نے بہت کچھ پا لیا ہے۔ پارلیمنٹ نے وہ سب کچھ پا لیا جس کے حاصل کرنے کے لئے جیمز اول کے عہد سے کوشش شروع ہو گئی تھی۔ اقتدارِ اعلیٰ کی تمام ظاہر داریاں بادشاہ کی ذات سے حسبِ سابق وابستہ رہیں مگر اس کی روح پارلیمنٹ کے کالبد میں داخل ہو گئی تھی۔ بادشاہ اب بھی اقتدارِ اعلیٰ کا حامل تھا لیکن اس کا اظہار اور اس کی عمل آوری وہ صرف پارلیمنٹ کے ذریعہ سے کر سکتا تھا۔ وہ تنہا کوئی چیز باقی نہیں رہا۔ اس کی ذات اقتدارِ اعلیٰ کی مرکز نہیں رہی۔ وہ جب باجلاسِ پارلیمنٹ کام کرتا تو تمام اختیارات واقتداراتِ شاہی کا حامل ہوتا۔ یہ انگلستان کے دستور کی ایک بازی گری ہے۔ وہ اصل میں ہے کچھ، اور نظر

آتا ہے کچھ بعد 1669ء میں سیاسی زندگی کی حقیقت کے طور پر اقتدارِ اعلیٰ کی، بادشاہ سے پارلیمنٹ کی طرف یہ خاموش منتقلی کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ ایک دنیا اسی دھوکہ میں رہی کہ دستور نے کوئی نئی کروٹ نہیں لی ہے۔ طاقت کا کوئی نیا تناسب وجود میں نہیں آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ عملاً پارلیمنٹ کے باہر بادشاہ کے اختیارات معطل اور اس کا اقتدار مفقود ہو چکا تھا۔ جسدِ سیاسی میں صرف پارلیمنٹ پُر معنیٰ طریقہ سے سرگرم عمل رہ سکتی تھی۔ بادشاہ عمل کے اس بہاؤ کو روک نہیں سکتا تھا۔ لوازمۂ شاہی کے طور پر اس کی ذات سے اقتدارِ اعلیٰ کے الفاظ کا وابستہ کیا جانا محض ایک دھوکہ اور واہمہ تھا جس کا وجود کہیں پایا نہیں جاتا تھا۔ ان حالات میں یہ کہنا درست اور حق بجانب ہو گیا تھا کہ " بادشاہ سے کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا "۔

یہ الفاظ انگلستان کے دستور کی ایک بنیادی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ بات مہمل نظر آتی ہے۔ بادشاہ نے حالات کے تقاضے کے طور پر اپنی شخصی مرضی کو مملکت پر مسلّط کرنا چھوڑ دیا۔ اب صرف پارلیمنٹ کی مرضی کا تسلّط تھا۔ اس لحاظ سے کسی پالیسی کے خواہ کیسے ہی اندوہناک نتائج کیوں نہ نکلیں بادشاہ اس کا ہرگز ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا۔ بادشاہ سے کسی جرم کے سرزد نہ ہونے کے یہی معنیٰ ہیں۔ اب وہ اپنی مرضی کو پارلیمنٹ کی مرضی کا تابع کر چکا۔ یا کم از کم حالات کے نتیجہ کے طور پر ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ صورتِ حال عودِ شاہی کے بعد سے دستور کی ایک واضح حقیقت بن گئی۔ گو جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ بات عرصہ تک عام نظروں سے اوجھل رہی۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ سنہ 1660ء کے بعد سے اقتدارِ اعلیٰ عملاً پارلیمنٹ کے سپرد ہو چکا تھا تو اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ آنے والے اسٹورٹ بادشاہوں نے اپنی اس کھوئی ہوئی میراث کو پھر سے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، یا یہ کہ تاج اور پارلیمنٹ میں ہمیشہ کے لئے کشمکش ختم ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسٹورٹ بادشاہ عقل کے اندھے تھے۔ وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ زمانے نے جو سبق پڑھایا تھا اس سے وہ فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کھلی حقیقتوں کو ماننے سے گریز کرتے رہے بلکہ یہ چاہتے تھے کہ بہ ہزار بہانہ و فسوں طاقت کے نئے تناسب کو مٹا کر رکھ دیں۔ مگر تاریخ نے ان کے حق میں ایک اٹل فیصلہ کر دیا تھا۔ وہ اس اٹل فیصلے کو کبھی بدل نہ سکے۔

کنونشن پارلیمنٹ کا کام

کنونشن پارلیمنٹ کو حتی الامکان مکمل قانونی حیثیت دینے کی کوشش کی گئی۔ جیسا کہ پہلے

کہا جا چکا ہے کہ اس کی ترتیب و تنظیم سابقہ پارلیمنٹوں کی سی تھی۔ دارالامرا میں ان سب اراکین (PEERS) کو جمع کیا گیا جو اس وقت ہاتھ آسکے۔ چارلس کی تاجپوشی کے بعد ایک قانون کے ذریعہ سے اس بات کی صراحت کی گئی کہ کنونشن ایک مکمل پارلیمنٹ ہے۔ ایک سال بعد جب چارلس کی دوسری پارلیمنٹ منتخب ہو کر آئی تو اس نے ان تمام قوانین کی توثیق کر دی جو کنونشن پارلیمنٹ نے منظور کئے تھے۔ دستوری تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے یہ تاویل اختیار کی گئی کہ چارلس دوم اپنے باپ چارلس اول کے قتل کے ساتھ ہی بادشاہ بن چکا تھا۔ اس تاویل کا نتیجہ یہ نکلا کہ چارلس اول کے قتل کے بعد جتنے بھی بل پاس کئے گئے تھے چونکہ انھیں جائز بادشاہ کی منظوری حاصل نہیں تھی وہ خود بخود منسوخ قرار پائے۔ ان کی تنسیخ سے قانونی خلا پیدا ہو سکتا تھا اس لئے اس دور کے تمام ایسے قوانین کو جو مفید اور ضروری تھے از سر نو پاس کیا گیا۔ چنانچہ قوانین جہاز رانی اور اسی قبیل کے دوسرے قوانین کی پھر سے منظوری دی گئی۔ غرض کنونشن پارلیمنٹ نے دستور کو قدیم چوکھٹے میں بٹھایا۔ ادارۂ شاہی کو بحال کیا۔ قدیم پارلیمنٹ بحال کی۔ بادشاہ کے لئے ٹنیج اور پونڈیج تاحیات منظور کیا۔ سابقہ جاگیری محاصل کے طریقہ کو مسدود کر کے بادشاہ کو ایک مقررہ رقم بطور محصول آبکاری (EXCISE) ادا کرنے کا انتظام کیا۔ انتہا پسندوں اور انقلاب پسندوں کا زور ٹوٹا۔ ملک میں عام معافی کا اعلان کیا۔ البتہ چارلس اول کے قتل نامہ پر دستخط کرنے والے بعض ججوں کو جو اب بھی زندہ تھے سزائے موت دی۔ اور بعضوں کو جو مر چکے تھے ان کی نعشوں کو قبروں سے نکلوا کر سر بازار لٹکایا۔ اس ابتدائی کام کی انجام دہی کے بعد یہ پارلیمنٹ تحلیل کر دی گئی۔ (دسمبر 1660ء)۔

چارلس کی دوسری پارلیمنٹ

چارلس کی دوسری پارلیمنٹ 1661ء میں طلب کی گئی۔ اس انتخاب میں شاہ پسندوں (CAVALIERS) کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ چارلس کی واپسی کے بعد ملک میں شاہ پرستی کی ایسی لہر پیدا ہو گئی تھی کہ انتخاب میں ہر اس جماعت کو جس نے کسی وقت بھی بادشاہ کی مخالفت کی تھی ہزیمت اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پرسبیٹرین جماعت کا تو اس میں صفایا ہو گیا حالانکہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عود شاہی میں پرسبیٹرینوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پرسبیٹرین فرقہ کے تعاون کے بغیر شاید ہی عود شاہی ممکن ہو سکتا۔ چنانچہ کنونشن

پارلیمنٹ میں پرسبیٹرین بھاری تعداد میں موجود تھے لیکن جب اس پارلیمنٹ کے انتخاب کا وقت آیا تو شاہ پسندوں اور اینگلیکنوں (ANGLICANS.) نے انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔ وہ بہت کم تعداد میں منتخب ہو سکے۔ اس پارلیمنٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ سے کہیں بڑھ کر شاہ پرست اور اساقفہ سے کہیں زیادہ اینگلیکن تھی۔ چارلس کے لئے اس سے بہتر آلۂ کار اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اس پارلیمنٹ کو 18 سال تک برقرار رکھا۔ اس قدر طویل مدت تک اس کو برقرار رکھنے کے لئے قانون سہ سالہ کو منسوخ کرنا پڑا جس کو طویل پارلیمنٹ نے اپنے پہلے سیشن میں منظور کیا تھا۔

کلیسا کی تنظیمِ جدید

اس پارلیمنٹ کا ایک اہم کام کلیسا کی تنظیمِ جدید تھا۔ یہ مسئلہ گزشتہ بیس سال سے متنازعہ فیہ رہا تھا۔ پچھلی دستوری اور سیاسی کشمکش کے محرکات میں مذہبی تنگ نظریوں کو بھی بڑا دخل تھا اور اس کی وجہ سے سخت رنجشیں اور تلخیاں پیدا ہوئی تھیں۔ اس عہد کے لوگ مذہب سے ایسی جذباتی وابستگی رکھتے تھے کہ زندگی کے دوسرے مسائل کی اہمیت ان کی نظر میں نسبتاً کم تھی۔ ہر فرقہ اور ہر گروہ صرف اپنے عقاید کی ترویج چاہتا تھا۔ اور یہ بھی کہ ان عقاید کو دوسروں پر مسلط کیا جائے۔ رواداری کی اسپرٹ پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ اسی مذہبی غلو اور جذباتی شدت نے پچھلے عہد کی تاریخ کو اتنا خونریز بنایا تھا۔ پارلیمنٹ کے سامنے اب یہی کام تھا کہ اس مسئلہ کا کوئی تشفی بخش حل دریافت کیا جائے۔ مگر پارلیمنٹ پر اینگلیکن فرقہ کا تسلط تھا۔ پیورٹن اس میں منتخب نہیں ہو سکے تھے۔ اور اینگلیکن فرقہ پیورٹنوں پر خار کھایا ہوا تھا۔ یہ لوگ پیورٹنوں کے کسی فرقے کا کوئی لحاظ رکھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ خالصتاً اینگلیکن قسم کا کلیسا قائم کرنا چاہتے تھے۔ اینگلیکن عقاید سے سرمو اختلاف کرنے والوں کو وہ کلیسا میں کوئی جگہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ پیورٹنوں میں انڈی پنڈنٹ فرقہ تو نئے حالات میں اپنے لئے کوئی امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بازی تو ہاتھ سے جا چکی ہے اور اینگلیکن بھلا ان سے کیوں رعایت کریں، جبکہ خود انھوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اینگلیکنوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں چھوڑی تھی۔ البتہ پرسبیٹرین پُرامید تھے۔ کیونکہ محض ان کے تعاون کی وجہ سے عود شاہی ممکن ہو سکا تھا۔ اس خدمت کے معاوضہ میں وہ قومی کلیسا میں اپنے لئے کسی گنجائش

کے پیدا کئے جانے کی اُمید رکھتے تھے۔ پرسبٹیرین اپنے ذیلی اختلافات کے باوجود قومی کلیسا سے باہر جانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی خواہش صرف اتنی تھی کہ بعض مخصوص رسوم اور امور میں ان کے اختلافی رویّہ سے اغماض برتا جائے، اور انھیں کچھ آزادیِ عمل حاصل رہے۔ اگر کلیسا کے بعض رسوم و قیود کی وہ پابندی نہ کریں تو اس سے چشم پوشی کی جائے۔ اگر یہ رعایت مل جائے تو پرسبٹیرین قومی کلیسا سے وابستہ رہنا چاہتے تھے۔ مگر اینگلیکن تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی کلیسا میں کسی اختلاف کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے رویّہ میں کوئی لچک نہیں تھی۔ وہ مطلق کسی رواداری یا وسیع المشربی کی پالیسی اختیار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کنونشن پارلیمنٹ کے زمانے میں انھوں نے کلیسا کے مسئلہ کو نہیں چھیڑا تھا کیونکہ اس میں پرسبٹیرین کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان کی عددی طاقت کے مدنظر یہ مناسب نہیں سمجھا گیا کہ کلیسا سے متعلق کوئی اقدامات کئے جائیں۔ اب تو کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ غالب اکثریت رکھتے تھے۔ غرض اینگلیکن ایسا کلیسا قائم کرنا چاہتے تھے جس میں ہر قسم کے اختلاف، انحراف اور افتراق کا بیج ہی مٹا دیا گیا ہو۔ جنھیں ذرہ بھر بھی اختلاف ہو وہ کلیسا میں کوئی جگہ پا نہ سکیں۔

قوانین کلیرنڈن CLARENDON CODE

سنہ 1661ء سے 1665ء تک سلسلہ وار کلیسا کی تنظیمِ جدید کے لئے قوانین پاس کئے گئے۔ قوانین کے اس مجموعہ کو "کلیرنڈن کوڈ" کہتے ہیں۔ کیونکہ لارڈ کلیرنڈن اس وقت چانسلر کی خدمت پر فائز تھا۔ ان قوانین میں پیورٹنوں پر جو سختی روا رکھی گئی تھی، وہ چانسلر کلیرنڈن کی ایماء پر نہیں تھی۔ جس شدید تنگ نظری کا ان میں اظہار کیا گیا تھا اس سے نہ تو چارلس کو اور نہ کلیرنڈن کو کوئی ہمدردی تھی۔ یہ سب کیا دھرا پارلیمنٹ کے ان جوشیلے ارکین کا تھا جو کلیسا کی تعمیرِ جدید میں انتقامی جذبہ سے سرشار تھے۔

(۱) پہلا قانون سنہ 1661ء میں پاس کیا گیا۔ اس کو "قانونِ بلدیہ" (CORPORATION ACT) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے یہ لازم قرار دیا گیا کہ بلدی شہروں میں ہر وہ شخص جو کسی عہدہ کا حامل ہو "مقدس اتحاد و معاہدۂ واثق" (SOLEMN LEAGUE & COVENANT) سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے۔ بادشاہ کی کلیسائی سیادت (OATH OF SUPREMACY) کا حلف لے اور حلفاً اس بات کو تسلیم کرے کہ بادشاہ کی مخالفت ہر حال میں ناجائز ہے۔ نیز اپنے انتخاب سے

ایک سال کے اندر اینگلیکن طرز کے عشائے ربانی (SACRAMENT) کو قبول کرے۔

(۲) دوسرے سال (1662ء) قانونِ یکسانیت (ACT OF UNIFORMITY) منظور کیا گیا۔ ہر پادری کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ اپنا خرقہ پادریت کسی اسقف کے ہاتھ سے حاصل کرے۔ "کتاب عبادت" کو لفظاً و معناً قبول کرے اور اس پر عمل کرے۔ اساتذہ اور معلّمین پر بھی "کتاب عبادت" کی قبولیت کا لزوم عاید کیا گیا۔

(۳) 1664ء میں قانون اجتماع بغرضِ عبادت (CONVENTICLE ACT) منظور کیا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ پانچ یا پانچ سے زاید اشخاص بغرض عبادت کسی جگہ جمع نہ ہوسکیں گے، اگر ان کا طریقۂ عبادت اینگلیکن مذہب کے اصولوں کے منافی ہو۔ خلاف ورزی کے لئے بھاری سزائیں رکھی گئی تھیں۔

(۴) 1665ء کے "قانون پنج میل" میں یہ وضاحت کی گئی کہ ایسے پادری جنھوں نے "قانونِ یکسانیت" کی شرائط کی تکمیل نہیں کی ہے وہ حلفاً اس بات کا اقرار کریں کہ بادشاہ کی مخالفت بہر عنوان ناجائز ہے نیز یہ کہ وہ نظامِ مملکت وکلیسا میں کوئی تبدیلی لانے کے خواہاں نہیں ہیں۔ ایسے پادری یا معلّم جو اس قسم کا حلف لینے سے انکار کریں سخت سزاؤں کے مستوجب ہوں گے، اگر وہ اپنے آپ کو ایسے بلدی شہر سے پانچ میل دور نہ رکھیں جہاں پہلے کبھی انھوں نے اپنے فرائض منصبی انجام دیئے تھے۔

کلیرنڈن کوڈ کا اثر پرسبیٹیرین فرقہ پر

صاف ظاہر ہے کہ ان تمام قوانین کا منشا یہ تھا کہ پیورٹنوں کی طاقت توڑی جائے۔ خصوصیت کے ساتھ پرسبیٹیرین ان قوانین کا نشانہ تھے۔ ان کا اثر ورسوخ شہروں میں بہت تھا۔ مقامی بلدیات پر وہ چھائے ہوئے تھے۔ پارلیمنٹ کے اراکین کا انتخاب ان ہی بلدیات کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ بلدیات اور شہر ان کے گڑھ تھے جہاں سے وہ قومی سطح پر پارلیمنٹ کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان کے اس کلیدی موقف کا قلع قمع کرنے کے لئے یہ قوانین نافذ کئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرسبیٹیرین اب نہ سیاسی قوت حاصل کرسکتے تھے اور نہ ہی کلیسا کی رکنیت انھیں حاصل ہوسکتی تھی۔ "عشائے ربانی" اور "کتاب عبادت" سے متعلق جو شرطیں رکھی گئی تھیں انھیں قبول کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ اس طرح پرسبیٹیرین ان قوانین سے بہت متاثر ہوئے۔ انھیں بڑی

مایوسی ہوئی ۔ وہ ایک متحدہ کلیسا کے خواب دیکھ رہے تھے جس میں دانستہ ان کے لئے کوئی گنجائش پیدا کی گئی ہو ۔ مگر انھیں بڑی بے مروتی بلکہ کسی قدر ذلت و خواری کے ساتھ قومی دھارے سے نکال باہر پھینکا گیا تھا ۔ ہزاروں پرسبٹیرین پادری ان قوانین کے نفاذ کے بعد اپنی آسامیوں کے چھوڑنے پر مجبور ہوئے ۔ کلیسا میں ان کی شمولیت (COMPREHENSION) کا دور ختم ہوگیا ۔ اب تک کسی نہ کسی طرح ، کسی نہ کسی شکل میں وہ اپنے بعض اختلافات کے باوجود کلیسا کی رکنیت برقرار رکھ سکتے تھے ۔ مگر نئے انتظام نے ان کے اس رشتہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ۔ اس سے ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوئی ۔ کلیسا ، سابق میں ایسے لوگوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا جو اس کے بعض عقاید و رسوم سے اختلاف رکھتے تھے لیکن ان کی کلیسا کی رکنیت پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا تھا ۔ ایسے لوگ کلیسا میں "غیر مقلّدین" (NON-CONFIRMISTS) کی حیثیت رکھتے تھے ۔ مگر اب انھیں کلیسا سے بالکل خارج کر دیا گیا ۔ ان کی حیثیت اب صرف غیر مقلّدین کی نہیں بلکہ منحرفین یا مخالفین (DISSENTERS) کی سی ہوگئی ۔ یہ تصور کیا جانے لگا کہ باعتبار تعلق و وابستگی اب یہ سرے سے دوسرے ہی کلیسا کے پیرو ہیں ۔ قومی مذہبی دھارے سے یہ اخراج پرسبٹیرینوں کو بہت شاق گزرا ، کیونکہ ان کے عقاید کی ایک بنیادی بات یہ تھی کہ قومی کلیسا سے وابستگی کو وہ ازبس ضروری اور ناگزیر سمجھتے تھے ۔ اس میلان کی بنا پر رفتہ رفتہ ان کا انحراف کمزور ہوتا چلا گیا ۔ اور وہ کلیسائے انگلستان میں جذب ہوتے چلے گئے ۔ دوسرے پیوریٹن فرقے جو قومی کلیسا کی ضرورت کے اتنے قائل نہیں تھے ، اپنے انحراف اور علٰحدگی کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے تا آنکہ وہ دور آیا جبکہ تمام فرقوں کو یکساں مذہبی آزادی حاصل ہوگئی ۔

یہ مذہبی انحراف و افتراق سیاسی سطح پر اپنے اثرات ڈالے بغیر نہ رہا ۔ اس کا ایک بالواسطہ نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی اُفق پر ایک نئی پارٹی نمودار ہونے لگی جو بعد میں چل کر وہگ پارٹی کے نام سے موسوم ہوئی ۔

چارلس دُوم کی مذہبی و سیاسی حکمتِ عملی

چارلس اس قانون سازی کو شاید ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ دیکھتا رہا ۔ پارلیمنٹ جو کچھ کر رہی تھی اس سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ چارلس طبعاً انتقام پسند نہیں تھا ۔ اور تو اور وہ

ان لوگوں کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار تھا جنھوں نے اس کے باپ کو قتل کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یہ بلا کا زیرک اور دانشمند واقع ہوا تھا۔ جذبات کی رو میں بہنا جانتا ہی نہ تھا۔ ہر بات پر یہ نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کا عادی تھا۔ یہ خصوصیات اس کے باپ اور دادا دونوں میں نہیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ورثہ اسے اپنے نانا ہنری چہارم کی طرف* سے ملا تھا جو اپنی دانائی اور فراست میں فرانس کے بادشاہوں میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ چارلس مذہب اور سیاست دونوں میں اپنے واضح مقاصد رکھتا تھا۔ سیاست کی حد تک وہ ٹیوڈروں اور اپنے باپ دادا کی مطلق العنانی کی طرف لوٹنا چاہتا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کے اختیارات پر غیر مرئی تحدیدات عاید ہوگئی ہیں۔ وہ اس زنجیر و سلاسل کو توڑنا چاہتا تھا۔ مگر اس طرح نہیں کہ کوئی انقلاب اچانک اسے آگھیرے۔ وہ اپنے تاج و تخت کو خطرہ میں ڈالے بغیر پارلیمنٹ کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ "رودبار" کے اس پار اس کی نظریں لوئی چہار دہم پر پڑتی تھیں جس کی مطلق العنانی پر کسی پابندی کی پرچھائیں تک نہ تھی۔ عمر بھر وہ یہ کوشش کرتا رہا کہ طاقت کا توازن جو 1660ء کے بعد قائم ہوا تھا اس کو اُلٹ کر رکھ دے۔ مگر اس کوشش میں بڑی احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ اور اپنے مقصد کو ہزار پردوں میں چھپائے رکھا۔ بظاہر وہ عیش کوشی میں لگا رہا اور طبعاً وہ تھا بھی عیاش۔ اس عیاشی اور لاابالی پن کی آڑ میں وہ برابر اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کرتا رہا۔ چارلس کی یہ روش اور اس کی درپردہ ریشہ دوانیاں، دستور کے لئے مہلک ثابت ہوسکتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چارلس نے اپنی ذہانت سے دستور کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی پیہم تدبیریں کیں اور اس میں کچھ عارضی کامیابی بھی حاصل کی، لیکن قوم کی بیدار مغزی نے اس کی کوششوں کو ناکام بنادیا۔

چارلس کا دوسرا بڑا مقصد کیتھولک مذہب کا احیاء تھا۔ اس کو دوبارہ سرکاری مذہب کی حیثیت دینا تو ناممکن تھا مگر اس کی غایت یہ تھی کہ اس مذہب کے پیروؤں کو مکمل قانونی آزادی حاصل ہوجائے اور وہ انگلستان میں آزادی اور مساوات کی اساس پر اپنے مذہب کی پیروی کرسکیں۔ اس دوہرے مقصد کے حصول میں وہ مسلسل سرگرم عمل رہا۔ مگر اس طرح کہ عام نگاہیں اس کے حقیقی منشاء اور مطمح نظر کو تاڑ نہ سکتی تھیں۔

پہلا اعلانِ مراعات ـ (DECLARATION OF INDULGENCE)

چارلس نے 1662ء میں اپنا پہلا "اعلانِ مراعات" جاری کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایسے تمام قوانین کو عملاً بے اثر کر دیا جائے جو کیتھولکوں کے خلاف اس وقت نافذ تھے لیکن صرف کیتھولکوں کی حمایت میں کوئی اقدام صریحاً خلافِ مصلحت تھا۔ اس نے اعلانِ مراعات میں ڈسنٹرس (منحرفین) کا لفظ استعمال کیا۔ اس لفظ کا اطلاق ہر اُس فرقہ پر ہو سکتا تھا جو کلیسائے انگلستان سے منحرف اور اس کی رُکنیت سے محروم ہو۔ اس میں نہ صرف کیتھولک شامل تھے بلکہ وہ تمام پیورٹن فرقے بھی جن کے خلاف ابھی حال میں بعض قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ چارلس نے اعلان کیا کہ وہ پارلیمنٹ کی رضامندی کے ساتھ ڈسنٹرس کو ان قوانین کی پابندی سے مستثنیٰ کر دے گا جو فی الوقت ان کے خلاف نافذ ہیں۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ اس قسم کا استثنار (DISPENSING POWER) بخشنے کا اختیار اسے بحیثیتِ بادشاہ کے حاصل ہے۔ لیکن پارلیمنٹ اس اختیار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اور نہ وہ ڈسنٹرس کو مراعات دینا چاہتی تھی۔ پارلیمنٹ کی مخالفت کے مدنظر چارلس نے "اعلانِ مراعات" سے دست کشی اختیار کر لی۔ واضح رہے کہ یہ پوری کارروائی چارلس نے پروٹسٹنٹ ڈسنٹرس کی ہمدردی میں نہیں بلکہ کیتھولکوں کو مذہبی آزادی دینے کے لئے کی تھی۔

دوسرا اعلانِ مراعات

پارلیمنٹ کا رنگ دیکھ کر چارلس فی الوقت خاموش رہا۔ اور آئندہ دس سال تک اس بارے میں کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔ 1672ء میں غالباً حالات کو موافق دیکھ کر اس نے اپنا دوسرا "اعلانِ مراعات" جاری کیا۔ اس مرتبہ یہ اعلان مجرد اختیاراتِ شاہی کی بنا پر کیا گیا۔ اس میں پارلیمنٹ کی منظوری یا توثیق کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اعلان کیا گیا کہ "مابدولت باہٰذا ایسے تمام تعزیری کلیسائی قوانین کو جو ڈسنٹرس (DISSENTERS.) اور نان کنفرمسٹ کے خلاف فی الوقت نافذ العمل ہیں اپنی مرضی اور حکم سے معطل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی عمل آوری باہٰذا معطل کر دی گئی ــ"

چارلس نے اس اعلان میں دوہرا وار کیا تھا۔ ایک طرف تو وہ پیورٹنوں کی آڑ میں کیتھولک مذہب کی بحالی کی کوشش کر رہا تھا، دوسری طرف وہ قانون سازی میں پارلیمنٹ

کی سیادت کو چیلنج کر رہا تھا۔ یہ چال بڑی گہری تھی۔ تمام پیورٹن فرقے اس وقت سخت شاکی اور نالاں تھے۔ پارلیمنٹ نے انھیں کلیسا سے باہر کرکے ان کے ساتھ سخت ناانصافی کا سلوک کیا تھا۔ کم ازکم ان جماعتوں کا تاثر تو یہی تھا، اور ان کے خلاف سخت تعزیری قوانین نافذ کیے جارہے تھے۔ چارلس ان زیادتیوں کے خلاف انھیں ایک جائے پناہ مہیا کر رہا تھا۔ اگر یہ سب فرقے اس کا ساتھ دیں تو اس کے مقاصد میں اسے بڑی حدتک کامیابی حاصل ہوسکتی تھی۔ لیکن پیورٹن مذہبی رواداری کے حاصل کرنے کے لئے اتنی بھاری قیمت ادا کرنے تیار نہیں تھے۔ وہ کسی قیمت پر بھی کیتھولکوں کو اس رواداری میں شریک دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کیتھولکوں کو وہ اب بھی دشمن قوم اور دشمن مذہب سمجھتے تھے۔ اس لئے پیورٹن کمال عزم اور یکجہتی کے ساتھ بادشاہ کے اس عطیہ کو مسترد کرنا ازبس ضروری خیال کرتے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چارلس کے اس اعلان سے کلیسا سے متعلق کم وبیش چالیس تعزیری قوانین عملاً منسوخ ہوگئے تھے۔ پارلیمنٹ پر درپردہ یہ ایک خطرناک حملہ تھا۔ اگر بادشاہ کے اس اختیار کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اپنے ایک مجرد حکم سے پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کو بیک جنبشِ قلم معطل اور عملاً منسوخ کرسکتا ہے تو پھر اس کے اختیارات پر تحدید ہی کیا باقی رہ گئی۔ پارلیمنٹ سے بےنیاز ہونے کے لئے اسے اور کیا چاہیے تھا؟ چارلس سمجھتا تھا کہ کیتھولکوں اور پیورٹنوں کے تعاون کے ساتھ وہ قومی تائید اور اتفاقِ رائے کی راہ ہموار کرسکے گا۔ اس طرح اس کے دونوں مقاصد کے حصول کے لئے سازگار فضا پیدا ہوجائے گی۔ لیکن پیورٹن چارلس کی اس بازی گری کو سمجھ گئے اور اس کی عطاکردہ مراعات کو ٹھکرادیا۔ دوسری طرف پارلیمنٹ نے اپنے دوسرے سشن میں صاف اعلان کیا کہ "کلیسا سے متعلق تعزیری قوانین کو سوائے پارلیمنٹ کے کوئی اور معطل نہیں کرسکتا۔ اس مفہوم کا اس نے ایک سخت ریزولیوشن بھی پاس کیا۔ لہٰذا بادشاہ نے اس دباؤ کے تحت اپنا اعلان مراعات واپس لے لیا۔

قانونِ آزمائش (TEST ACT)

پارلیمنٹ اس کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ حالیہ "اعلانِ مراعات" اس کی نظر میں ایک پوشیدہ خطرہ کی غمازی کر رہا تھا۔ چارلس کے متعلق شبہ تھا کہ وہ نہ صرف کیتھولکوں سے ہمدردی رکھتا ہے بلکہ درپردہ وہ خود کیتھولک ہے۔ اس کے بھائی جیمز کا کیتھولک ہونا بہت

سے آثار و قرائن کی بناء پر ایک یقینی امر سمجھا جاتا تھا۔ برطانوی قوم پاپائیت سے سخت متنفر اور خائف تھی۔ اس کے احیاء کا خطرہ پھر ایک بار اُسے سر پر منڈلاتا ہوا نظر آیا۔ فرماں روائے وقت اگر کیتھولک ہو تو پتہ نہیں قوم کی کسی ایک عارضی غفلت سے کب کیا فائدہ اٹھا لیا جائے۔ اس بات کا بھی قوی شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ ملک کی بڑی بڑی خدمتیں کیتھولکوں کے سپرد ہو گئی ہیں اور درپردہ ان کی خوب سرپرستی ہو رہی ہے۔ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ ان چھپے ہوئے کیتھولکوں کا راز فاش کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے پارلیمنٹ نے اسی سال (1672ء) ایک ایسا قانون بنایا جس سے کوئی شخص کیتھولک ہوتے ہوئے کسی خدمت پر فائز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کو قانون آزمائش کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے یہ لازم قرار دیا گیا کہ ہر وہ شخص جو کسی فوجی یا سیول خدمت پر فائز ہو "حلف سیادت و متابعت" (OATH OF SUPREMACY & ALLEGIANCE) لے اور کلیسائے انگلستان کے طریقہ پر "عشائے ربانی" کو قبول کرے۔ نیز اس بات کا حلفاً اقرار کرے کہ "تغیر لحم و دم" (TRANSUBSTANTIATION) کے عقیدے کو وہ تسلیم نہیں کرتا۔ یہ شرطیں ایسی تھیں کہ کوئی کیتھولک ان کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ متعدد کیتھولک عہدہ دار جو اب تک بڑی بڑی خدمتوں پر فائز تھے ان سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوئے۔ چھ سال بعد (1678ء) میں اس قانون کو پارلیمنٹ کے ممبروں پر بھی مسلط کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے متعدد اراکین جو درپردہ رومن کیتھولک تھے اپنی رکنیت سے مستعفی ہونے پر مجبور ہوئے۔ جیمز ڈیوک آف یارک کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ رومن کیتھولک ہے۔ چنانچہ اس نے شاہی بیڑے کی سربراہی اور دارالامراء کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔

پاپائی سازش

قصرِ شاہی میں پاپائیت کے اثر و نفوذ کے شبہات کو جیمز کے استعفیٰ سے بہت تقویت پہنچی۔ اس سے ملک کے طول و عرض میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اسی اثناء میں ایک جھوٹے پادری ٹائیٹس اوٹس (TITUS OATES) نے ایک ایسی بے بنیاد سازش کو بے نقاب کرنے کا دعویٰ کیا جس کے ذریعہ سے کیتھولک دوبارہ پاپائیت کا احیاء کرنا چاہتے تھے۔ اس کذب و افتراء کو لوگوں نے آنکھ بند کر کے قبول کر لیا اور بیسیوں معزز اور بے گناہ کیتھولک افراد اس مذہبی جنون کے بھینٹ چڑھائے گئے۔ پروٹسٹنٹ اپنا توازن کھو چکے تھے۔ عدالتیں بھی اس جنون

سے متاثر ہوگئی تھیں۔ کیتھولکوں کے لئے نہ کوئی قانونی تحفظ باقی رہا تھا اور نہ جائے امن۔ عدالتیں ان کو قانون کے نام پر موت کے گھاٹ اُتارتی چلی گئیں۔

پارلیمنٹ اس فضا میں اپنی سابقہ شاہ پرستی پر قائم نہ رہ سکی۔ اس کو چارلس پر اب کیتھولک نوازی کا شبہ نہیں بلکہ یقین تھا۔ وہ اس کی خارجہ پالیسی سے بھی سخت نالاں تھی۔ چارلس نے اس زمانہ میں فرانس سے ایک خفیہ معاہدہ کی کوشش کی۔ پارلیمنٹ کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ اس نے اپنے غم وغصہ کا اظہار ڈینبی (DANBY) کے مواخذہ کی صورت میں کیا۔ یہ شخص اس وقت بادشاہ کا وزیر اور معاملاتِ خارجہ میں اس کا معتمد علیہ تھا۔ چارلس نے اس کو بچانے کے لئے پارلیمنٹ تحلیل کردی۔ یہ پارلیمنٹ 18 سال تک نشست کرتی رہی تھی۔

سیاسی پارٹیوں کی ابتدا

کم وبیش اسی زمانے میں سیاسی فرقہ بندی کا آغاز ہوا۔ یوں تو چارلس اول کے عہد میں بھی سیاسی فرقہ بندی کی واضح مثال سامنے آتی ہے۔ مگر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد سیاسیات سے زیادہ مذہب پر تھی۔ کیویلیرس (شاہ پسند ـ CAVALIERS) اور راونڈ ہیڈس (پیورٹن) کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی چیز سیاسی نہیں بلکہ مذہبی وابستگی تھی مگر چارلس دوم کے عہد میں جو پارٹیاں وجود میں آئیں ان کی بنیاد زیادہ تر سیاسی عقاید پر رکھی گئی۔ قوم دو سیاسی دھاروں میں بٹ گئی۔ ایسے تمام لوگ جو کسی حد تک قدامت پسند تھے اور بادشاہ اور کلیسائے انگلستان کے شدت سے حامی تھے ٹوریز کہلانے لگے۔ خاندانِ شاہی سے وابستگی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے مخالفین نے ان کو ٹوریوں کا نام دیا جس سے ان کی اہانت منظور تھی۔ دوسرا فریق ایک ترقی پسند گروہ تھا۔ اس کی نظر ہمیشہ ماضی کی بجائے مستقبل پر تھی۔ وہ بادشاہ کی بے چوں وچرا اطاعت کے قائل نہیں تھے بلکہ ہمیشہ ان کا رُجحان شاہی اختیارات کی کتر بیونت کی طرف تھا۔ اس جماعت کو ان لوگوں سے بھی تقویت پہنچی جو کلیسائے انگلستان سے نکال باہر کئے گئے تھے۔ ایسی جماعت کا وسیع النظر اور ترقی پسند ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ پارٹی وہگ کہلانے لگی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ پارٹیاں واضح سیاسی عقاید کی حامل بنتی گئیں۔ انگلستان کی دو عظیم سیاسی پارٹیوں کی جو انیسویں صدی میں "لبرل" اور قدامت پسند" کہلانے لگیں، داغ بیل اسی عہد میں ڈالی گئی۔ اس عہد کی ٹوری اور وہگ پارٹیاں

انیسویں صدی میں قدامت پسند اور لبرل کہلانے لگیں۔

مسوّدات قانونِ محرومی EXCLUSION BILLS.

چارلس کے آخری عہد میں سب سے اہم مسئلہ جانشینی کا تھا۔ اس کے کوئی جائز اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اور نہ آئندہ بظاہر اس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس لئے سوال یہ تھا کہ چارلس کے بعد انگلستان کا بادشاہ کون ہوگا؟ چارلس اپنے بھائی جیمز سے والہانہ محبت رکھتا تھا۔ وہ اس کو جانشین کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جیمز کے رومن کیتھولک ہونے کا راز طشت از بام ہو چکا تھا۔ وہگ جیمز کے سخت مخالف تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک رومن کیتھولک تخت و تاج کا مالک ہو جائے۔ اس لئے چارلس کے عہد کی آخری تین پارلیمنٹوں میں وہگ پارٹی مسلسل یہ کوشش کرتی رہی کہ "قانونِ محرومی" پاس کرا کے جیمز کو تخت و تاج سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن کچھ تو دارالامراء کی مخالفت اور کچھ چارلس کی مزاحمت نے اس کارروائی کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ دو مرتبہ چارلس نے اپنی پارلیمنٹوں کو برخواست کر کے اس مسوّدہ کو ناکام بنا دیا۔

قانونِ رہائی از حبسِ بے جا 1679ء

چارلس کی تیسری پارلیمنٹ نے 1679ء میں ایک نہایت ہی اہم قانون پاس کیا۔ اس کو "قانونِ رہائی از حبسِ بے جا (HABEAS CORPUS ACT) کہتے ہیں۔ یہ قانون زیادہ تر حزبِ مخالف کی کوششوں سے پاس ہو سکا۔ انگلستان کے دستور میں "منشورِ اعظم" کے وقت سے "شخصی آزادی" کے تحفظ و احترام کا تصور ہر وقت جاگزیں رہا۔ اس دستاویز کے ذریعہ سے یہ ضمانت حاصل کر لی گئی تھی کہ کسی شخص کو بلا تحقیقات، غیر معینہ مدت تک محبوس نہیں رکھا جائے گا۔ تیرھویں صدی سے شخصی آزادی کے تحفظ کے لئے مختلف قسم کے رٹس (WRITS.) کی اجرائی کا طریقہ جاری تھا۔ ابتداء میں "رہائی از حبسِ بے جا" کی رٹ صرف اس غرض کے لئے استعمال کی جاتی تھی کہ گواہوں کو عدالت میں طلب کیا جا سکے۔ لیکن پندرھویں صدی سے عدالتیں ملزم کو حراستِ بے جا سے بچانے کے لئے اس کا استعمال کرنے لگیں۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے مخصوص سیاسی حالات کی وجہ سے شخصی آزادی عاملہ کے غیر محدود اختیارات حراست سے

زیادہ خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ اس لئے اس رٹ کو اس زمانہ میں زیادہ سے زیادہ کام لیا جانے لگا۔ مگر بعض قانونی اسقام کی وجہ سے عدالتیں اس سے ملزم کو خاطر خواہ مدد بہم نہیں پہنچا سکتی تھیں اور شخصی آزادی محض عاملہ کے رحم و کرم پر مبنی ہو کر رہ گئی تھی۔ غرض یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اگر فرد کو عاملہ کے ہاتھوں حبس بے جا کے خطرہ سے موثر طریقہ پر محفوظ رکھنا ہے تو ایک ایسے قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہوگی جو رٹ کے موجودہ طریقہ کار میں تبدیلی پیدا کر کے اسے زیادہ کارگر بنا سکتا ہے۔ سنہ 1679ء کے قانون کے ذریعہ سے کسی نئے اصول کو منضبط نہیں کیا گیا۔ رٹ کا طریقہ پہلے سے موجود تھا اور اس پر صدیوں سے عمل درآمد بھی ہوتا رہا تھا۔ مگر اختیاراتِ شاہی (عاملہ) کے بے جا استعمال نے اس کو عملاً غیر کارگر بنا دیا تھا۔ یہ قانون ان ہی خامیوں اور اسقام کے دور کرنے کے لئے وضع کیا گیا۔ اس کے ذریعہ سے رٹ کی فی الفور اجرائی کے لئے ججوں کو سختی سے پابند کیا گیا۔ محروس کنندہ عہدہ دار پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ رٹ کی وصولیابی کے ساتھ ہی وہ ملزم کی عدالت میں حاضری کا بعجلتِ ممکنہ انتظام کرے اور اس کی تعمیل میں کسی قسم کے لیت و لعل سے کام نہ لے۔ پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ عدالتوں کو اجرائی رٹ کا مجاز گردانا گیا۔ ناقابلِ ضمانت ملزمین کے مقدمہ کو جلد سے جلد عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس قانون نے شخصی آزادی کے لئے ایک مستحکم دستوری تحفظ عطا کیا۔ اب کسی جج کی یہ مجال نہیں تھی کہ رٹ کی اجرائی سے انکار کرے اور نہ کسی محروس کنندہ عہدہ دار کی یہ ہمت ہو سکتی تھی کہ رٹ کی تعمیل میں پس و پیش کرے۔ دونوں صورتوں میں سخت سزائیں رکھی گئی تھیں۔

کیبنیٹ کی ابتدا

چارلس دوم کے عہد میں غیر ارادی طور پر بعض دستوری ترقیوں کے اسباب پیدا ہوئے۔ کیبنیٹ کے ارتقا کی ابتدائی منزلیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ اس دور میں سیاسی پارٹیوں کا وجود میں آنا اس ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی تشکیل و ترقی نے کیبنیٹ کے آئندہ ارتقا کے لئے راہ ہموار کی۔ نیز یہ کہ پریوی کونسل آہستہ آہستہ اپنا روپ بدل رہی تھی۔ یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ صدیوں سے پریوی کونسل حکومتِ وقت ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس عہد میں کیبنیٹ اس کی جگہ لینے لگی۔ رفتہ رفتہ پریوی کونسل پس پشت ڈال دی گئی اور

کیبنیٹ اس کی جانشین بن گئی ۔ یہ سب ترقی اتفاقی حالات و اسباب کا نتیجہ تھی ۔ اس میں کسی کی دانستہ کوشش کو کوئی دخل نہیں تھا ۔ پریوی کونسل امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اندرونی اور بیرونی تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہی ۔ پندرھویں صدی کے بعد سے اس کی رکنیت میں اضافہ ہوتا رہا ۔ حکومت کا دائرۂ عمل جس قدر بڑھتا گیا اسی قدر اس کی رکنیت میں توسیع کی ضرورت پیش آئی ۔ عہدِ جدید کے تقاضوں نے حکومت کے دائرۂ عمل کو روزافزوں وسعت عطا کی ۔ اس کا اثر قدرتی طور پر پریوی کونسل پر پڑا ۔ ان وسعت پذیر انتظامی اور سیاسی ذمہ داریوں کے پیش نظر پریوی کونسل کا کام محکمہ جاتی اساس پر تقسیم ہونے لگا ۔ مختلف چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں علٰحدہ علٰحدہ کسی مخصوص محکمے یا وزارت کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کی جانے لگیں ۔ ٹیوڈروں کے عہد میں اس قسم کی کم از کم چھ کمیٹیاں تھیں ۔ مگر سترھویں صدی میں کثرتِ رکنیت کی وجہ سے پریوی کونسل حکومتی فیصلوں کے لئے غیر موزوں ادارہ بنتی جا رہی تھی ۔ یوں بھی بادشاہ اپنے حسب مرضی پریوی کونسل کو یکسر نظرانداز کر سکتا تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ پریوی کونسل سے کوئی مشورہ طلب کرنے کا پابند تھا اور نہ اس کو قبول کرنے کا ۔ انفرادی طور پر وہ پریوی کونسل کے کسی بھی ممبر سے مشورہ کر سکتا تھا ۔ وہ ایسے لوگوں سے بھی مشورہ طلب کر سکتا تھا جو سرے سے پریوی کونسل کے ممبر نہ ہوں ۔ اس خصوص میں اس کی آزادی پر کوئی پابندی نہیں تھی ۔ اس لحاظ سے بھی پریوی کونسل حکومتی کاروبار کے لئے غیر موثر ادارہ بنتی جا رہی تھی ۔

چارلس دوم کے عہد میں پریوی کونسل کی تعداد بڑھتے بڑھتے پچاس تک پہنچ گئی تھی ۔ یہ اتنی بڑی جماعت تھی کہ اہم اور فوری فیصلوں کے لئے کسی طرح موزوں ثابت نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس امر کی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ اسے ایک مفید مجلسِ مشاورت میں تبدیل کیا جائے ۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہوتا جبکہ اس کی تعداد میں کاٹ چھانٹ کی جاتی ۔ اس کی مختلف کمیٹیاں نظم و نسق کے عام امور کی نگرانی کا انتظام کرتی رہیں اور چارلس اندرونی اور بیرونی حکمتِ عملی کے تمام فیصلوں کے لئے صرف چند مشیروں پر بھروسہ کرتا تھا ۔ بسا اوقات یہ مشیر کسی مسلمہ کمیٹی کے ممبر نہیں ہوتے تھے ۔ اور کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ کس وقت کس شخص نے بادشاہ کو کیا مشورہ دیا ۔ یہ خفیہ مشورت پارلیمنٹ کے لئے باعثِ تشویش تھی ۔ اس سے طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں ۔ ایسی خفیہ جماعت کو اہانتاً کیبال (CABAL) کا نام دیا جانے لگا ۔ کیبال ایک خفیہ سازشی جماعت کو کہتے ہیں ۔ عام طور پر حکومتی معاملات میں اس قسم کی

رازداری کا طریقہ کار ناپسندیدہ سمجھا جانے لگا۔ اس خیال کی شدت سے حمایت کی جانے لگی کہ تمام حکومتی فیصلے پریوی کونسل کے کھلے اور مکمل اجلاس میں کئے جائیں تاکہ بوقتِ ضرورت ایسے لوگوں کو سزا دی جاسکے جنھوں نے بادشاہ کو غلط مشورہ دیا تھا۔ نیز یہ کہ کونسل کو ایسا روپ دیا جائے کہ وہ بادشاہ اور پارلیمنٹ میں ہم آہنگی پیدا کرسکے۔ اور حکومتی کاروبار میں اسے دونوں کی تائید حاصل رہے۔ چونکہ پریوی کونسل کے اراکین عموماً پارلیمنٹ کے کسی نہ کسی ایوان کے ممبر بھی ہوا کرتے تھے اس لئے یہ خیال تھا کہ اس جماعت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام بخوبی لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسی تصور کے ساتھ سرولیم ٹمپل نے اپنی تجویز پیش کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کونسل میں دونوں سیاسی پارٹیوں کے نمائندے ہوں۔ اس میں بادشاہ کے موافقین بھی ہوں اور حزبِ مخالف کے نمائندے بھی۔ ان کے علاوہ کچھ غیر جانبدار بھی۔ ان تینوں عناصر کی کونسل میں ایک مقررہ نسبت سے مناسب نمائندگی کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ چارلس نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر بطورِ آزمائش اس پر عمل بھی کیا جاتا تو یہ ہرگز قابلِ عمل ثابت نہ ہوتی۔ آئندہ کیبینٹ کی جس راہ سے تشکیل ہونے والی تھی اس میں مختلف و متضاد عناصر کی یکجائی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اہلِ نظر اب اس بات کو سمجھنے لگے تھے کہ عاملہ (بادشاہ) اور مقننہ میں تصادم کے امکانات کو کم سے کم کرکے ان دونوں میں تعاون اور اتحادِ خیال کے پیدا کرنے سے حکومت کی مشینری زیادہ بہتر طریقہ سے چل سکے گی۔ کیبینٹ کا آئندہ ارتقاء اسی ضرورت کی تکمیل تھا۔ چارلس عملاً اپنی خفیہ وزارتوں کی تشکیل سے غیر ارادی طور پر اندھیرے میں اسی راستے کی تلاش میں تھا اگرچہ اس کے لئے اس کو ہدفِ ملامت بننا پڑا۔ یہ بات اب کسی حد تک واضح ہو چلی تھی کہ آئندہ کیبینٹ پریوی کونسل کے بطن سے ہی جنم لے گی۔

تخصیص رقوم اور دیگر دستوری ترقیاں (APPROPRIATIONS.)

پارلیمنٹ نے اس عہد میں عاملہ کو قابو میں رکھنے کا ایک موثر ذریعہ دریافت کیا۔ اس کو "تخصیص رقوم" (APPROPRIATION.) کا طریقہ کہتے ہیں۔ آج کل کی مجالسِ قانون ساز کے لئے تو یہ ایک مسلّمہ اور ناگزیر طریقہ کار ہے جس سے عاملہ کو روپیہ کے خرچ کی حد تک پارلیمنٹ کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ انگلستان میں یوں تو پندرھویں صدی میں بھی اس کی کچھ پیش رفت ہوئی تھی لیکن بعد کی صدیوں میں چونکہ اس پر مسلسل عمل آوری نہیں ہوئی لہٰذا اس کو کوئی مستحکم دستوری

حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ روپیہ کی منظوری دینے کی مجاز تو بہر حال پارلیمنٹ ہے لیکن "تصرف" کے ذریعہ سے وہ خرچ کے مدات بھی مقرر کر دیتی ہے۔ اور ہر مد کے لئے ایک رقم معین اور مختص کر دی جاتی ہے۔ اس قسم کی پابندِ مدات رقومات کو عاملہ کا کوئی عہدہ دار کسی دوسرے پر خرچ نہیں کر سکتا۔ سنہ 1665ء میں پارلیمنٹ نے ہالینڈ کے خلاف جنگ کے اہتمام کے لئے ایک بھاری رقم منظور کی اور یہ رقم بالکلیہ جنگ کے لئے مختص تھی۔ دو سال بعد پارلیمنٹ نے حسابات کی جانچ پڑتال کی۔ اس جانچ پڑتال میں پتہ چلا کہ رقومات کی داد و ستد میں قانونی جواز کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور کچھ رقومات بلا منظوریِ مجاز خرچ کر دی گئی ہیں۔ اس غلطی کی پاداش میں بحریہ کے خزانہ دار کو ایوان سے خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے "تخصیصِ رقوم" کا طریقۂ کار پارلیمنٹ کا ایک اہم دستوری حق بن گیا۔ لیکن اس کو کامل استحکام ولیم سوم کے عہد میں حاصل ہوا۔ زمانۂ حال میں یہ طریقہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے مدات کے لئے علحدہ علحدہ رقم مختص کر دی جاتی ہے۔ اس میں عاملہ دست اندازی نہیں کر سکتی۔ نتیجتاً اب وزراء کوئی ایسی پالیسی یا پروگرام اختیار نہیں کر سکتے جس کے لئے قبل از قبل پارلیمنٹ نے رقمی گنجائش فراہم نہ کر دی ہو۔ اس چیز نے مواخذہ اور وزراء سے باز پرس کے بھونڈے طریقہ کو عملاً از کار رفتہ کر دیا کیونکہ مواخذہ غلطی کے ارتکاب کے بعد ہی ممکن تھا لیکن اب تصرف کے طریقۂ کار نے سرے سے غلطی کے ارتکاب کے امکان کا ہی سدِ باب کر دیا۔ پارلیمنٹ کے سامنے وزراء کی اس بے بسی نے آئندہ کابینی طرزِ حکومت کے استوار کرنے میں بہت مدد دی اور پارلیمنٹ کو وزراء پر ایسا کنٹرول عطا کر دیا جو کابینی طرزِ حکومت کے ارتقاء کے لئے ازبس ضروری تھا۔

اسی سلسلہ میں اس عہد کی بعض اور دستوری ترقیاں اور طریقۂ کار کی تبدیلیاں قابلِ ذکر ہیں۔ دارالامراء بحیثیت عدالت اپنے ابتدائی حقِ سماعت سے دست بردار ہو گیا۔ اور چانسری کی عدالتوں کے لئے عدالتِ مرافعہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ رقمی مسودوں میں اُسے اب ترمیم کرنے کا حق باقی نہیں رہا۔ دارالعوام نے اس طرح رقمی معاملات میں اپنی کامل برتری قائم کر لی۔

خاندانِ شاہی کی ہر دلعزیزی

چارلس اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں عملاً خود مختار اور مطلق العنان بن گیا تھا۔ اس نے سنہ 1681ء کے بعد کوئی پارلیمنٹ طلب نہیں کی۔ حزبِ مخالف تتر بتر ہو چکا تھا۔ ملک میں اس

جماعت کا اثر و رسوخ گھٹ گیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ لوگ کیتھولکوں پر اپنی زیادتیوں کی وجہ سے بدنام ہو چکے تھے۔ قوم پر اب یہ بات منکشف ہو گئی تھی کہ حزبِ مخالف نے کیتھولکوں کے خلاف سازشوں کے الزام کے جس پروپیگنڈہ کو ہوا دی تھی اس کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیتھولکوں کا ناحق خون بہائے جانے پر قوم متأسف تھی اور اب اس ظلم و زیادتی کا سارا الزام حزبِ مخالف پر آ رہا۔ ارل آف شافٹسبری کو تو ملک چھوڑنا پڑا کیونکہ اس شخص نے کیتھولکوں کو بدنام کرنے اور "قانونِ محرومی" کے پاس کروانے کی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ قوم اب یہ سمجھنے لگی تھی کہ نہ صرف کیتھولکوں کے ساتھ ناانصافی کی گئی بلکہ چارلس کے بھائی اور ولی عہد جیمز کو بھی محض اس کے کیتھولک ہونے پر ناحق موردِ ملامت کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بادشاہ اور شاہی خاندان کی تائید کی ایک لہر پیدا ہوئی اور اسی لہر کے بل بوتے پر چارلس نے اپنی زندگی کے آخری چار سال نہ صرف مطلق العنانی کے ساتھ گزارے بلکہ اس دور میں اس کو اور شاہی خاندان کو اتنی ہردلعزیزی حاصل ہو گئی تھی کہ جس کی مثال کم از کم اسٹورٹ دور میں تو نہیں ملتی۔

آٹھواں باب

زرّین انقلاب

جیمز دُوم

جیمز کی تخت نشینی

جیمز کی تخت نشینی کے وقت (1685ء) شاہی خاندان کی ہردلعزیزی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ سب جانتے تھے کہ جیمز رومن کیتھولک ہے لیکن محض اس بنا پر انگلستان کا عام اوسط آدمی اس کو تخت سے محروم کرنے کا خواہشمند نہیں تھا۔ کلیسائے انگلستان کے پیرو جن کی شاید ملک میں اکثریت تھی شاہی ادارے کو اس درجہ مقدس مانتے تھے کہ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے تیار تھے۔ انھیں یہ بھی گوارا تھا کہ ایک رومن کیتھولک سریر آرائے سلطنت ہو۔ جب تک اس کی جانب سے ان کے مذہب کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا وہ اس کی بے چوں وچرا اطاعت کرنے کے لئے تیار تھے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس زمانے میں ایسے لوگوں کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا جو بادشاہ کی مخالفت کو بہر عنوان ناجائز سمجھتے تھے اور اپنے سینوں میں ایسا دل رکھتے تھے جو "حقوقِ آسمانی" کے نظریات سے سرشار تھا۔ جیمز کو ہردلعزیزی کا یہ ورثہ چارلس دوم کی دانائی اور فراست کی وجہ سے مل سکا۔ قوم میں اس کی مخالفت کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ خال خال ایسے لوگ ضرور تھے جو اس کے بادشاہ ہونے سے مشوش اور خائف تھے۔ یا پھر کچھ ایسے تھے جو اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاکر کچھ اودھم مچانا چاہتے تھے۔ بہرحال جیمز کی تخت نشینی نہایت سازگار حالات میں عمل میں آئی۔ ہر طرف وفاداری اور شاہ پرستی کا ایک طوفان تھا کہ اُمڈتا نظر آتا تھا۔ ان حالات میں جب جیمز کی پہلی پارلیمنٹ منتخب ہوکر آئی تو وہ بادشاہ کے لئے کیا کچھ کرنے تیار نہیں تھی۔ اس نے بلا کھٹکے جیمز کو تاحیات

بھاری محاصل کی منظوری دے دی۔ جیمز پر اس کے اعتماد کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ لیکن یہ ساری خوشگواریوں کی فضاء دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ چارلس دوم کا کمال یہ تھا کہ اس کے مخالفین بھی اس کی سیاست و فراست کے آگے عاجز تھے اور جیمز کی حماقت کا یہ عالم کہ مشکل سے تین سال کے اندر اس نے اپنے ہوا خواہوں اور جاں نثاروں کو بھی اپنا بدترین دشمن بنا لیا۔ اصل خرابی مذہبی مسئلہ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ جیمز بہر قیمت کیتھولک مذہب کو پھر سے انگلستان میں رائج کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف اپنے کیتھولک ہونے پر قانع نہیں تھا بلکہ وہ اپنا یہ ایک اہم فریضہ سمجھتا تھا کہ اس مذہب کی پرانی شان و شوکت بحال کرے۔ نیز یہ کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں اسے تاخیر گوارا نہیں تھی۔ اس کی اسی ناعاقبت اندیشانہ عجلت کا نتیجہ تھا کہ بہت جلد اسے اپنے تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑا۔

تخت نشینی کے ساتھ ہی ڈیوک آف مان متھ اور ارل آف آرگائل کی بغاوتیں ہوئیں لیکن ان بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا گیا۔ باغیوں کو وسیع قومی تائید کی جو اُمید تھی پوری نہ ہو سکی۔ شاہ پرستی کی اس فضاء میں مان متھ کی کچھ پیش نہ گئی۔ ہر چند کہ وہ مسلّمہ طور پر چارلس دوم کا بیٹا تھا لیکن ناجائز ہونے کی وجہ سے نہ تو چارلس نے کبھی اپنے حینِ حیات اس کی توقعاتِ باطل کی ہمت افزائی کی اور نہ اب قوم نے اسے درخورِ اعتنا سمجھا۔

جیمز کے خلاف بدگمانیاں

مان متھ اور آرگائل کی بغاوتوں نے اچانک ایک مفاجاتی صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ اس سے نمٹنے کے لئے جیمز کو ایک بھاری فوج تیار کرنی پڑی۔ اس فوج نے بغاوت کا خاتمہ تو کر دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیمز کے دست و بازو بھی مضبوط کر دیئے۔ اور اس میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا کر دی۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ذریعہ سے وہ ہر قسم کی امکانی مخالفت کو کچل سکتا ہے اور اسے یقین تھا کہ جس پالیسی پر وہ کاربند ہوا چاہتا ہے اس سے ایک ملک گیر مخالفت کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ انگلستان میں فوج کی بحالتِ امن برقراری کو ہمیشہ ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جیمز بہت جلد اس فوج کو برخواست کر دے گا۔ لیکن جب دیکھا کہ وہ فوج کو برخواست کرنے تیار نہیں ہے تو ملک میں شکوک و شبہات کی فضاء پیدا ہونے لگی۔ اس فوج میں بہت سے رومن کیتھولکوں کو بھی

بھرتی کر لیا گیا تھا۔ اور فوج کے اعلیٰ عہدے ان کو دیئے گئے تھے۔ یہ " قانونِ آزمائش" کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اس سے جیمز کی نیتوں پر شبہ کیا جانے لگا۔ اسی زمانے میں فرانس میں لوئی چہاردہم نے پروٹسٹنٹوں پر ایسے مظالم توڑنے شروع کئے جن کی نظیر نہیں ملتی اور پروٹسٹنٹوں کے ساتھ مصالحت اور رواداری کی پالیسی کا یک لخت خاتمہ کیا گیا اور قانون نانٹس کو منسوخ کر دیا گیا جو فرانس میں پروٹسٹنٹوں کی مذہبی آزادی کا منشور تھا۔ یہ سب کچھ جیسوئٹس (JESUITS) کی کارگزاری تھی جو سخت متعصب، تنگ نظر اور کیتھولک مذہب کے احیاء کے جنون سے سرشار تھے۔ لوئی چہاردہم پوری طرح ان کے اثر میں تھا۔ فی الحقیقت اس کی مذہبی پالیسی کے معمار یہی لوگ تھے۔ " رود بار" کے اس پار جو کچھ ہو رہا تھا اس سے انگلستان میں بھی خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی۔ اہلِ انگلستان کو پروٹسٹنٹ مذہب خطرہ میں نظر آنے لگا کیونکہ سینٹ جیمز پیالیس بھی لوئی چہاردہم کے دربار کی طرح جیسوئٹس کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ جیمز کے متعلق یہ معلوم تھا کہ وہ خفیہ و علانیہ جیسوئٹس سے ساز باز رکھتا ہے۔ ان بدگمانیوں کی فضا میں پارلیمنٹ نے جیمز کی اس درخواست کو مسترد کر دیا کہ فوج کے اخراجات کے لئے رقمی منظوری دی جائے۔ اور کیتھولک عہدہ داروں کو " قانونِ آزمائش" کے اثر سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ پارلیمنٹ ان مطالبات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ وہ کیسے ان کی منظوری دیتی؟ اُلٹے اس نے فوج کی برخواستگی کا مطالبہ کیا۔ اس پر جیمز نے پارلیمنٹ کچھ دن کے لئے ملتوی کر دی اور بعد میں اُسے تحلیل کر دیا۔

کیتھولک نواز پالیسی

جیمز پر مذہبی جنون سوار تھا۔ اس میں تدبر کا فقدان تو تھا ہی، لیکن اس کی عجلت پسندی اور غیر محتاط رویہ نے اسے اور زیادہ نقصان پہنچایا۔ پارلیمنٹ کے صریح مخالفانہ رجحان کے مدنظر اس نے عدالت سے ایک مقدمہ کے ضمن میں اپنے اختیارِ استثنار کی تائید میں فیصلہ حاصل کر لیا۔ عدالت کے حکام اس کے اپنے مقرر کئے ہوئے تھے۔ اس معرکۃ الآرا فیصلہ نے جیمز کی پوزیشن قدرے مستحکم کر دی۔ اس ہتھیار سے لیس ہو کر اس نے دھڑا دھڑ کیتھولکوں کے اندھا دُھند تقررات شروع کر دیئے۔ پریوی کونسل، فوج اور ملکی نظم و نسق کے شعبوں میں ہر جگہ کیتھولکوں کو مقرر کیا جانے لگا۔ غضب تو یہ کیا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی اور کلیسا کو بھی اس درازدستی

سے محفوظ نہیں رکھا۔ چنانچہ ایک رومن کیتھولک کو میگڈالن کالج آکسفورڈ کا پریسیڈنٹ مقرر کیا۔ یہ صریحاً کالج کے دستور کی خلاف ورزی تھی۔ کوئی رومن کیتھولک اس عہدہ پر فائز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ عہدہ انتخابی تھا۔ کالج کے فیلوز (FELLOWS) اس انتخاب کے مجاز تھے۔ جیمز نے ان کے انتخاب کو کالعدم قرار دے کر بزور اپنے نامزد کردہ شخص کو اس خدمت پر فائز کردیا۔ اس سے کالج اور کلیسا کے حلقوں میں ایک تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اپنی مذہبی پالیسی کے مخالفین کو کچلنے کے لئے اس نے "کورٹ آف ہائی کمیشن" کو کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں دوبارہ قائم کیا۔ حالانکہ طویل پارلیمنٹ نے 1640ء میں اس عدالت کو ختم کردیا تھا۔ اس قانون کی زد سے بچنے کے لئے اس عدالت کی تشکیل میں بہت ہوشیاری سے کام لیا گیا۔ لیکن لوگوں نے محسوس کرلیا کہ جیمز اسٹورٹوں کی قدیم آمرانہ ڈگر پر چلنے پر تُلا ہوا ہے۔ کیتھولکوں کی ہمت افزائی کی جانے لگی کہ وہ کھلے عام اپنی عبادت کا انتظام کریں جو قانوناً ممنوع تھی۔ لندن والوں کو مرعوب کرنے کے لئے فوج کے کچھ دستے شہر کے نواح میں متعین کردیئے گئے۔ ان اقدامات سے قوم کی بدظنی میں اضافہ ہوتا گیا۔

اعلانِ مراعات

جیمز یہ جانتا تھا کہ محض ان اقدامات سے وہ اپنا مقصد حاصل نہ کرسکے گا۔ اس کو دستوری اور قانونی سہاروں کی ضرورت تھی۔ اس بنیاد پر البتہ اس کی مطلق العنانی کی عمارت کھڑی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اس نے 1687ء میں اپنا پہلا "اعلانِ مراعات" (DECLARATION OF INDULGENCE) جاری کیا۔ چارلس دوم نے بھی یہ اقدام کیا تھا مگر اسے ناکامی ہوئی تھی۔ جیمز اسی تجربہ کو دہرانا چاہتا تھا، اور سمجھتا تھا کہ جہاں اس کے بھائی کو ناکامی ہوئی ہے وہاں وہ کامیاب ہوجائے گا۔ اس اعلان کا اصل مقصد کیتھولکوں پر سے قانونی پابندیوں کو ہٹانا تھا۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ صرف کیتھولکوں کے لئے سہولتیں فراہم کرنا قطعاً ناممکن تھا۔ اس لئے اعلانِ مراعات کے ذریعہ سے وہ ایک جامع رواداری کی پالیسی اختیار کرنا چاہتا تھا جس سے نہ صرف کیتھولک بلکہ ڈسنٹرس بھی مستفید ہوسکتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح منحرفین کی اسے کامل تائید حاصل ہوجائے گی۔ اس اعلان سے ان تمام فرقوں کو عبادت کی آزادی حاصل ہوگئی جو کلیسائے انگلستان سے منحرف تھے چاہے وہ کیتھولک ہوں یا پروٹسٹنٹ۔ دوسرے الفاظ میں رومن کیتھولک اور وہ پروٹسٹنٹ

منحرفین جنھیں چارلس دوم کے عہد میں کلیسائے انگلستان سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ دونوں کے لئے یہ اعلان آیۂ رحمت ثابت ہوسکتا تھا۔ منحرفین کے لئے یہ بڑی آزمائش کا موقعہ تھا۔ اگر وہ اس رعایت کو قبول کر لیتے تو ان کی مذہبی دشواریاں دور ہو جاتیں۔ ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ مگر انھیں معلوم تھا کہ اس رعایت کی کیا بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔ وہ کیتھولک مذہب کو ملک میں دوبارہ سرگرم عمل دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کیتھولکوں کے وہ بدترین مخالف تھے۔ کیتھولک مذہب کی آزادی کی قیمت پر اپنی آزادی خریدنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے جیمز کے اس عطیہ کو بلا جھجک مسترد کر دیا۔ جیمز کی امیدوں پر پانی پھرتا نظر آیا۔ اس اعلان کی اجرائی میں ایک دستوری نکتہ بھی مضمر تھا۔ وہ یہ کہ بادشاہ اپنے اختیارِ خصوصی (PREROGATIVE) سے ان قوانین کو معطل کر رہا تھا جو اس وقت منحرفین اور کیتھولکوں کے خلاف نافذ العمل تھے۔ بالفاظِ دیگر وہ اس بات کا مدعی تھا کہ مروجہ قوانین کو وہ اپنے شخصی حکم سے معطل کر سکتا ہے۔ یہ ایسا دعویٰ تھا جس کو اہلِ انگلستان کبھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔ اس قبیل کے دعویٰ کو انھوں نے چارلس دوم کے عہد میں یکلخت مسترد کر دیا تھا۔

سات اساقفہ کا مقدمہ

جیمز ان سابقہ ناکامیوں کے باوجود اپنی سعیِ لاحاصل سے باز نہیں آیا۔ چنانچہ 1688ء میں اس نے دوسرا اعلانِ مراعات جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی اساقفہ کو یہ حکم دیا کہ یہ اعلان تمام کلیساؤں میں پڑھ کر سنایا جائے۔ اساقفہ اس حکم کی وجہ سے ایک عجیب مخمصے میں پڑ گئے۔ اگر اس کی تعمیل سے انکار کریں تو یہ بات "عدم مقاومت" (NON-RESISTANCE) کے کلیسائی نظریہ سے انحراف کے مترادف ہوگی۔ دوسری طرف اس کی تعمیل اس بات کو تسلیم کرنے کے مماثل ہوگی کہ بادشاہ تمام کلیسائی قوانین اور تحفظات کو بہ یک گردشِ قلم منسوخ کرنے کا مجاز ہے اور اس کا ایسا کرنا قانوناً درست بھی ہے۔ اس دوطرفہ مصیبت سے بچنے کی واحد صورت یہ تھی کہ اساقفہ کی جانب سے بادشاہ کی خدمت میں یہ عرضی گزرانی جائے کہ وہ ان کو اس حکم کی بجا آوری اور تعمیل کے لئے مجبور نہ کرے۔ چنانچہ سینکرافٹ، صدر اسقف کنٹربری اور دیگر چھ اساقفہ نے اپنے تمام رفقاء کی ایماء پر اس مضمون کی ایک عرضداشت بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ جیمز اساقفہ کے اس تامل اور درپردہ انکار سے آگ بگولہ ہو گیا۔ ان کی

درخواست کو تاج کی توہین اور اس کے خلاف بغاوت پر محمول کیا۔ چنانچہ "توہین باغیانہ" (SEDITIOUS LIBEL) کے الزام میں ان کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔

جب یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو اس میں متعدد قانونی بحثیں پیدا ہوئیں۔ سوال صرف بادشاہ کے "حق استثنار" کا نہیں تھا۔ اساقفہ کی جانب سے یہ استدلال کیا گیا کہ بادشاہ کو عرضی دینا کوئی جرم نہیں۔ نیز دارالامراء کے ممبروں کی حیثیت سے ان کے امتیازات کا بھی سوال تھا۔ اس بات کا بھی دعویٰ کیا گیا کہ نافذالعمل کلیسائی قوانین کو بادشاہ اپنے "اختیار استثنار" سے معطل نہیں کر سکتا۔ لیکن تاج کی جانب سے یہ کہا گیا کہ عرضی کی پیش کشی کے لئے پارلیمنٹ کا وسیلہ ضروری ہے۔ "اختیار استثنار" سے متعلق ایک اہم بات یہ کہی گئی کہ اس پر کوئی دستوری یا قانونی تحدید نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے بھی تو وہ صرف پارلیمنٹ کی بعض قراردادوں میں پائی جاتی ہے جس کی کوئی قانونی وقعت نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے بادشاہ کے کسی ایسے حکم کے ماننے سے انکار کرنا جو اعلانِ شاہی (PROCLAMATION) کی شکل میں جاری کیا گیا ہو صریحاً قانون کی خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلمہ ہے کہ "اعلانِ شاہی" (PROCLAMATION) کو قانون کا درجہ حاصل ہے۔

نیز یہ استدلال بھی کیا گیا کہ اساقفہ کے تامل اور انکار سے بظاہر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کے اس حکم کو خلافِ قانون تصور کرتے ہیں جس کے صریحاً یہ معنیٰ ہوں گے کہ اساقفہ بادشاہ پر قانون شکنی کا الزام عاید کر رہے ہیں اور یہ کھلی بغاوت ہے۔

یہ قانونی موشگافیاں تو رہیں ایک طرف لیکن جیوری نے ان کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اس وقت ملک کی عام رائے جیمز کے خلاف اور اساقفہ کی تائید میں تھی۔ جیوری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اساقفہ کو بَری کر دیا۔ اساقفہ کی برأت پر ملک کے گوشہ گوشہ میں خوشیاں منائی گئیں۔ اس مقدمہ میں جیمز کی ناکامی اس کی آئندہ تباہیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

مسئلہ وراثت

جیمز نے اپنی حماقتوں سے ملک میں اتنی بددلی پیدا کر دی تھی کہ کسی وقت بھی ایک خطرناک صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی۔ قوم اپنے اندیشہ ہائے دور و دراز میں حق بجانب تھی لیکن

اس کے باوجود یہ خیال تھا کہ جیمز ضعیف ہو چلا ہے۔ یہ ساری مشکلات اور اندیشے اس کے دم واپسیں تک ہیں۔ اس کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ فی الوقت اس کی وارث اس کی بیٹی میری تھی جو پروٹسٹنٹ مذہب رکھتی تھی اور ایک پروٹسٹنٹ (ولیم آف آرنج والیِ ندرلینڈ) سے بیاہی گئی تھی۔ ولیم آف آرنج پروٹسٹنٹ مذہب کا یورپ میں بڑا حامی سمجھا جاتا تھا۔ جیمز کے بعد تخت و تاج میری کو منتقل ہونے والا تھا۔ اس لئے قوم جیمز کو اس عمر میں تخت و تاج سے محروم کر کے ملک میں کوئی بڑا قضیہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسی اثنا میں جیمز کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس سے صورتِ حال ہی بدل گئی۔ اب یہ قوی اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جیمز کے بعد بھی کیتھولک بادشاہوں کا سلسلہ شاید ختم نہ ہوگا کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ نوزائیدہ شاہزادہ کی بحیثیت ایک رومن کیتھولک کے تعلیم و تربیت ہوگی۔ مستقبل کی یہ ایک ایسی بھیانک تصویر تھی جس نے اہلِ انگلستان کو کسی فوری اقدام کی طرف راغب کیا۔ وہ جیمز کو اس کی حیات تک تو کسی نہ کسی طرح برداشت کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن ایک دوامی کیتھولک تسلط جس کا اب قوی امکان پیدا ہو گیا تھا ان کے لئے کسی طرح قابلِ قبول نہ تھا۔

جیمز کی فراری

ان حالات میں قوم کے چند سربرآوردہ اعیان و اکابر نے ولیم آف آرنج کے نام دعوت نامہ روانہ کیا کہ وہ فوراً انگلستان آکر اس خطرہ سے انھیں نجات دلائے۔ ولیم نے ان کی درخواست قبول کرلی۔ ولیم کو بلانے والوں میں وہگ اور ٹوری دونوں پارٹیوں کے لیڈر شریک تھے۔ اس فیصلہ کو قوم کا مشترکہ فیصلہ سمجھنا چاہئے۔ جیمز نے اپنی حماقتوں سے ٹوریوں کو بھی اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو بادشاہ کی بے چوں و چرا اطاعت اور نظریۂ حقوقِ آسمانی کے علمبردار تھے۔

ولیم اِدھر ساحلِ انگلستان پر لنگر انداز ہوا اور اُدھر جیمز کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ولیم اپنے ساتھ اپنی ایک چھوٹی سی فوج بھی لایا تھا مگر فی الحقیقت اس فوج کی اس کو ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ لوگ جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ خواص و عوام نے جیمز کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اس نازک وقت میں کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ اس کی بیٹی این (ANNE) بھی جب ولیم سے جا ملی تو جیمز کو یقین ہو گیا کہ اب بازی اس کے ہاتھ سے

نکل چکی ہے ۔ اس نے راہ فرار اختیار کی ۔ ولیم نے دانستہ ایسے انتظامات کئے تھے کہ جیمز کو نکل بھاگنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے ۔ جیمز کی فراری نے ولیم کی بہت سی مشکلات حل کر دیں ۔

دستوری خلاء

جیمز کی فراری سے ملک میں ایک دستوری خلا پیدا ہو گیا۔ جس وقت یہ واقعات پیش آئے پارلیمنٹ موجود نہیں تھی ۔ واقعہ یہ ہے کہ جیمز نے پارلیمنٹ کی طلبی کے انتظامات مکمل کرلئے تھے ۔ مگر جب اسے اچانک ملک چھوڑنا پڑا تو چلتے چلتے نئی حکومت کے لئے دشواریاں پیدا کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کی طلبی کے لئے جو طلب نامے (.WRITS) تیار کئے گئے تھے وہ جلادیئے اور سلطنت کی بڑی مہر (.GREAT SEAL) دریائے ٹیمز میں پھینک دی ۔ اس سے ایک رسمی دشواری تو پیدا ہوئی لیکن بہر حال اس پر قابو پا لیا گیا ۔

ان حالات سے نمٹنے کے لئے سب سے پہلے ایک "اسمبلی" طلب کی گئی ۔ اس میں دارالامراء کے تمام اراکین اور چارلس دوم کے عہد کی پارلیمنٹوں کے ایسے ممبر جو بقید حیات تھے اور لندن کے ارباب اقتدار کو طلب کیا گیا ۔ اس اسمبلی نے پارلیمنٹ کی فوری طلبی کا مشورہ دیا ۔ اس بنا پر پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے حکم نامے جاری کئے گئے ۔ جو ظاہر ہے کہ بادشاہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے اپنی ٹھیک قانونی صورت میں جاری نہیں کئے جاسکے ۔ بریں ہمہ یہ پارلیمنٹ منتخب ہو کر آئی اور عام طور پر کنونشن پارلیمنٹ کے نام سے موسوم ہے ۔

کنونشن پارلیمنٹ

کنونشن پارلیمنٹ اب کوئی انوکھی چیز نہیں تھی ۔ کیونکہ عود شاہی کے وقت اس قسم کی پارلیمنٹ نے ہی بڑے عظیم اور دور رس فیصلے کئے تھے ۔ کنونشن نے ولیم اور میری کو تخت و تاج پیش کیا ۔ ولیم اب تک صرف ولیم آف آرنج تھا لیکن اس پیش کش کی قبولیت کے بعد وہ انگلستان کا بادشاہ تسلیم کیا گیا ۔ کنونشن نے اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ اب اس کی اپنی حیثیت ایک مکمل پارلیمنٹ کی ہے ۔ اور یہ کہ اس کے پاس کردہ قوانین کا جواز ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے ۔ ولیم نے 1690ء میں جب دوسری پارلیمنٹ طلب کی تو اس نے کنونشن کی پارلیمانی حیثیت اور اس کے قوانین کے جواز کی ازسرنو توثیق کی ۔ یہ سب احتیاطیں اس لئے کی گئیں کہ اس

انقلاب کو زیادہ سے زیادہ قانونی اور دستوری کارروائی کا رنگ دیا جائے کنونشن پارلیمنٹ یہ تاثر پیدا کرنا چاہتی تھی کہ ملک میں قانون اور دستور سے ہٹ کر کوئی تبدیلی عمل میں نہیں لائی گئی ہے۔ اور یہ کہ جو کچھ بھی سیاسی تغیرات ہوئے ہیں ان کے لئے دستور میں گنجائش موجود تھی مگر یہ تصور انقلاب پر دستور کا پردہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ یہ صحیح ہے کہ بہ تقاضائے مصلحت یہ روش کچھ بے جا نہ تھی۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ سرے سے اس تمام کارروائی کو سوائے انقلاب کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ کنونشن پارلیمنٹ جو شاہی طلب ناموں کے بغیر وجود میں آئی تھی قانون کی نگاہ میں کبھی پارلیمنٹ تصور نہیں کی جا سکتی۔ اس کی طلبی ایک ایسے شخص کے ہاتھوں عمل میں آئی جو بادشاہ کا داماد سہی لیکن ایک غیر ملکی تاجدار تھا۔ اس مشتبہ پارلیمنٹ نے ایک حملہ آور کو تخت و تاج کا پیش کش کیا۔ ایسی صورت میں جبکہ حقیقی تاجدار قانون کی نگاہ میں ابھی تاجدار ہی تھا۔ مانا کہ پارلیمنٹ کو بادشاہ کے معزول کرنے کا اختیار ہے لیکن پارلیمنٹ نے جیمز کو معزول نہیں کیا۔ مانا کہ پارلیمنٹ کو بادشاہ کے انتخاب کا حق حاصل ہے لیکن پارلیمنٹ نے ولیم کو منتخب نہیں کیا۔ کنونشن نے جو استدلال اختیار کیا وہ یہ تھا کہ جیمز تخت سے دست بردار ہو گیا ہے۔ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ جیمز کو اس بات پر اصرار رہا کہ اس نے تخت سے دست برداری حاصل نہیں کی ہے۔ غرض یہ سارے مفروضات غلط تھے۔ حق بات یہ ہے کہ ایک عظیم انقلاب رونما ہوا تھا۔ اور انقلاب کسی دستور یا قانون کا پابند نہیں۔ اس بحث کا یہ مطلب نہیں کہ قوم کو اس انقلاب کے لانے کا حق نہیں تھا یہ انقلاب قوم کے کامل اتفاق آراء سے لایا گیا۔ رائے عامہ کی یکجہتی نے اس انقلاب کو جنم دیا تھا۔ اور اس خوبی سے اس کی صورت گری کی گئی کہ ایک قطرۂ خون بھی نہیں بہایا گیا۔ قوم سے اس حق کو کوئی نہیں چھین سکتا کہ وہ تمام امکانی قانونی صورتوں کی ناکامی کے بعد اپنی صلاح وفلاح کے لئے اور اپنے عزیز ورثہ آزادی و حریت کے تحفظ کے لئے انقلاب کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرے۔ انگلستان میں اس وقت جو کچھ ہوا وہ یہی تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس انقلاب کا مقصد قوم کو دستوری ترقی کے صدیوں پرانے جادہ سے ہٹانا نہیں بلکہ اس راستے میں جو رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کرنا تھا۔

---

۱. CONSTITUTIONAL HISTORY OF ENGLAND BY MAITLAND_P. 285.

کنونشن کے سامنے جب ولیم کو تاج و تخت پیش کرنے کا مسئلہ آیا تو وہگوں اور ٹوریوں میں طریقۂ کار پر سخت اختلاف پیدا ہوا۔ ٹوری اب بھی یہ چاہتے تھے کہ جیمز رہے یا نہ رہے مگر "ادارۂ شاہی" کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ وہ اب بھی تاج کی منتقلی کی بنیاد قدرتی حقِ وراثت (LEGITIMACY) پر رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کا استدلال یہ تھا کہ جیمز کی فراری سے میری خود بخود اس کی جانشین اور ملکہ قرار پاتی ہے۔ مگر وہگ اس "حقِ وراثت" کے تصور کو مٹانا چاہتے تھے۔ وہ میری کو کسی بالاتر حق کی بنا پر (جو پارلیمنٹ کے اختیار سے باہر ہو) ملکہ تسلیم کرنے تیار نہیں تھے۔ اس لئے انھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ جیمز کی فراری کے بعد "تخت خالی" ہے اور قوم کو اس کے پُر کرنے کا حق حاصل ہے۔ ویسے "قدرتی حقِ وراثت" کو ماننے میں ٹوریوں کو بھی ایک دغدغہ تھا۔ اگر اس حق کو تسلیم کیا جائے تو تخت اصولاً میری کو نہیں بلکہ جیمز کے نوزائیدہ لڑکے کو ملنا چاہئے۔ ولیم بھی اس تاویل کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ ایسی صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ اپنی بیوی کے نائب کی حیثیت سے بادشاہت کر سکتا تھا۔ اس نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کسی ایسے انتظام کو قبول کرنے تیار نہ ہوگا جس میں اس کی اپنی شاہی پوزیشن مسلّمہ نہ ہو۔ غرض ان مختلف اور متضاد تقاضوں کے دباؤ کے تحت کنونشن نے یہ بات تسلیم کرلی کہ جیمز کی فراری سے تخت خالی ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ قانون کی نگاہ میں تخت کے خالی ہونے کا تصور بے معنی اور مہمل ہے۔ قانوناً تخت ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہیں رہ سکتا مگر عملی مشکلات کے مدنظر قانون کی نزاکتوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔

کنونشن نے اس تاویل کو قبول کرنے کے بعد ولیم اور میری کو "مشترکہ" طور پر تخت کا پیش کش کیا۔ دونوں بیک وقت مشترکہ طور پر تاجدار قرار پائے۔ اس تاویل کے نقطۂ نظر سے انگلستان کا تخت ۱۱ر دسمبر 1688ء سے جبکہ جیمز نے سلطنت کی بڑی مُہر دریائے ٹیمز میں پھینک کر فراری اختیار کی تھی 13 فروری 1689ء تک جبکہ ولیم اور میری نے تاج کے پیش کش کو قبول کیا، تاجدار سے خالی رہا۔ انقلاب کا شاید یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کیونکہ دو مہینے کے اس خلاء نے قوم کے اس حق کو مستحکم کر دیا کہ وہ جس کو چاہے اپنی مرضی سے بادشاہ تسلیم کر سکتی ہے۔ اس سے "قدرتی حقِ وراثت (LEGITIMACY.)" کا تو بالکل خاتمہ ہوگیا۔ اور اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر "حقوقِ آسمانی" کے تمام دعوے باطل اور بے بنیاد ہوکر رہ گئے۔ اب انگلستان کا کوئی بادشاہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کسی

بالاتر حقِ آسمانی کی بناء پر حکومت کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کا دو مہینے تک بے تاج وتخت رہنا کچھ بے سود ثابت نہیں ہوا۔

کنونشن نے نئے انتظام کے ضمن میں اپنی یہ مشہور قرارداد منظور کی کہ "جیمز نے دستور کو درہم برہم کر کے عوام اور بادشاہ کے درمیان جو ازلی معاہدہ ہے اس کی بیخ کنی کی۔ اور جیسوئٹس اور دیگر مفسدہ پرداز مشیروں کی ہمنوائی سے ملک کے اساسی قوانین کی خلاف ورزی کر کے بالآخر راہِ فرار اختیار کی اور تخت سے دست برداری حاصل کرلی ہے۔ بدیں وجہ تخت اس وقت خالی ہے: نیز یہ اعلان بھی کیا گیا کہ "تجربہ شاہد ہے کہ اس پروٹسٹنٹ مملکت کے تخت پر کسی کیتھولک فرد کا متمکن ہونا اس کی فلاح وبہبود کے منافی ہے"۔

قانونِ حقوق ۱۶۸۹ء

ــ ولیم اور میری کی خدمت میں تاج کی پیش کشی کے ساتھ ساتھ کنونشن نے ایک "اعلانِ حقوق" (DECLARATION OF RIGHTS) بھی پیش کیا تھا۔ اس میں جیمز کی تمام دستوری خلاف ورزیاں فرداً فرداً گنوائی گئی تھیں اور انھیں خلافِ قانون ٹھیرایا گیا تھا۔ ولیم نے اس کو قبول کرلیا لیکن اس پر قناعت نہیں کی گئی۔ کنونشن نے اپنے دوسرے اجلاس میں اس اعلانِ حقوق کو مسودۂ قانونِ حقوق (BILL OF RIGHTS.) کی شکل میں منظور کر کے اسے قانون موضوعہ (STATUTE LAW.) کی حیثیت دے دی۔ اس طرح ۱۶۶۰ء میں جو کمی رہ گئی تھی اس کا اس قانون کے ذریعہ سے تکملہ کردیا گیا۔

• قانونِ حقوق کے ذریعہ یہ طے پایا کہ بادشاہ کا قوانین کو معطل (SUSPENDING POWERS.) کرنے یا ان کے اثر سے کسی کو مستثنیٰ کرنے (DISPENSING POWERS.) کی نسبت اپنے اختیار کا ادعا کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ کہ پارلیمنٹ کی بلا رضامندی محصول عائد کرنا زمانۂ امن میں مستقل فوج رکھنا، کورٹ آف ہائی کمیشن یا اسی قسم کی دیگر عدالتوں کا قائم کرنا ناجائز ہے۔ دادرسی میں بادشاہ کا خلل انداز ہونا اور پارلیمنٹ کے اختیارات وامتیازات (مثل آزادئ انتخاب، آزادئ تقریر وغیرہ) میں دست اندازی کو خلافِ قانون ٹھیرایا گیا۔ یہ کہ بادشاہ کو عرضی دینے کا حق رعایا کو حاصل ہے۔ اور یہ کہ ازالۂ شکایات کے لئے پارلیمنٹیں بار بار اور جلد جلد طلب کی جایا کریں۔

"اعلانِ حقوق" میں جس سلسلۂ وراثت کو تسلیم کیا گیا تھا اس کی توثیق کی گئی۔ اس کی رو سے تخت وتاج کے مالک ولیم اور میری قرار پائے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی وفات کی صورت میں جو بھی بقیدِ حیات رہے وہ بدستور بادشاہ رہے گا۔ ان دونوں کے بعد ان کی اولاد، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ولیم کی اولاد جو کسی اور بیوی سے ہو۔ اور اس کے بعد جیمز کی دوسری بیٹی این اور اس کی اولاد کو حقِ وراثت عطا کیا گیا۔ قانون حقوق کی منظوری کے وقت اس میں یہ اضافہ کیا گیا کہ کوئی ایسا شخص جو کیتھولک مذہب کا پیرو ہو یا کسی کیتھولک سے شادی کی ہو کبھی انگلستان کا بادشاہ نہ بن سکے گا۔

قانونِ حقوق کی دستوری اہمیت

قانون حقوق بلاشبہ ایک نہایت ہی اہم دستوری دستاویز ہے۔ اس کی اہمیت "منشورِ اعظم" "توثیق مناشیر" (CONFIRMATION OF CHARTERS) اور "عرضداشتِ حقوق" سے کچھ کم نہیں۔ اس نے اس عظیم دستوری کشمکش کا خاتمہ کر دیا جو اسٹورٹ دَور کے آغاز سے شروع ہوئی تھی۔ اس میں ایک ایک کر کے جیمز کی وہ سب کارروائیاں گنوائی گئیں جو دستور کے منافی سمجھی جاتی تھیں۔ اور اب واضح طور پر ان کو خلافِ قانون ٹھیرایا گیا۔ جیمز اور اس کے پیش رووں نے اپنی مطلق العنان حکومت کے قائم کرنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے تھے ان کا سدِباب کیا گیا۔ اس دستاویز میں بین السطور یہ واضح کیا گیا تھا کہ بادشاہ کو مملکت کے بنیادی قوانین کا بہرحال احترام کرنا چاہئے۔ وہ اس کا مجاز نہیں ہے کہ ان اساسی قوانین کو اپنی مرضی سے توڑ مروڑ کر رکھ دے۔ چنانچہ تمہید میں جیمز کے خودسرانہ افعال کا تفصیل ذکر کرنے کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ یہ سب کارروائیاں صریحاً مملکت کے "مسلّمہ قوانین اور اس کی حُرّیت" کے منافی ہیں۔ "قانونِ حقوق" کو تحریری دستور تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے ذریعہ سے نہ کسی نظامِ حکومت کی تشکیل کی گئی تھی اور نہ مختلف اعضائے حکومت کے درمیان اختیارات کو تقسیم کیا گیا تھا۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دفعات کے ذریعہ سے بعض اہم دستوری قوانین کو قلم بند کر دیا گیا تھا۔ قانونِ حقوق کھلے طور پر بادشاہ اور رعایا کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی اس بنیاد کو ہی خاک میں ملا دے گی جس پر محدود ادارۂ شاہی کی تعمیر عمل میں لائی جا رہی تھی۔ یہ تصور کہ شاہی اختیارات فی الحقیقت عوام کی

سونپی ہوئی امانت ہیں" اور یہ امانت ایک معاہدہ کی شکل میں بادشاہ کو سپرد کی گئی ہے، سترھویں صدی کے سیاسی فلسفہ کا سنگ بنیاد تھا۔ اس عہد کے مشہور فلسفی لاک (LOCKE) نے اس نظریہ کی بڑی کامیابی سے اشاعت کی تھی۔ لاک کے فلسفے اور سیاسی تصورات نے اس کے ہم عصروں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود حیرت کی بات ہے کہ قانونِ حقوق میں سیاسی فلسفہ و افکار کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ "اقتدارِ اعلیٰ کے نظریات" یا ناقابلِ تنسیخ انسانی حقوق کے بارے میں یہ دستاویز بالکل خاموش ہے۔ اس میں صرف ٹھوس اور عملی بدعنوانیوں کا ذکر ہے۔ اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ ان بدعنوانیوں کو خلافِ قانون ٹھیرا کر ان کے اعادہ کو ناممکن بنا دیا جائے۔ یہ بات اینگلوسیکسن قوموں کے سیاسی مزاج کے عین مطابق ہے۔ انھوں نے اپنے سیاسی اور دستوری اداروں کی پرداخت میں نظری فلسفہ کا کبھی کوئی سہارا نہیں لیا۔ البتہ ان کے ارتقار میں جب کبھی رکاوٹ پیش آئی تو ان دشواریوں پر عملی طور پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ قانونِ حقوق بھی انگریز قوم کے اسی طبعی میلان کا مظہر ہے۔

اس دستاویز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پرانی طرز کی "مطلق العنان شاہی" کے احیار کے امکانات کو بالکل مٹا دیا۔ اب کسی بادشاہ کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ حقوقِ آسمانی کا دعویٰ کر سکے۔ کیونکہ اس قانون نے سرے سے بادشاہت کی بنیاد ہی بدل دی تھی۔ ولیم سوم یا این یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ کسی موروثی حق کی بنار پر بادشاہ ہیں۔ قانونِ حقوق نے جائز ورثار کو نظر انداز کر کے جو سلسلۂ وراثت منظور کیا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انگلستان کی بادشاہت کسی بالاتر موروثی حق پر نہیں بلکہ محض پارلیمنٹ کے عطیہ پر منحصر ہے۔ تخت و تاج کی بنیاد میں اس عظیم تبدیلی نے حقوقِ آسمانی پر مبنی بادشاہت کے تصور کو کھوکھلا کر دیا۔ اب کسی بادشاہ کی مجال نہیں تھی کہ اس قسم کے دعووں کی تجدید کرے۔ انقلاب کا یہ ایک ایسا دُوررس نتیجہ تھا کہ جس نے قانون کی سیادت اور قوم کے اقتدارِ اعلیٰ کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر کر دیا۔

سابق کی طرح اب بادشاہ اور پارلیمنٹ ~~مملکت میں اقتدار~~ کے لئے ایک دوسرے کے حریف اور مدِمقابل نہیں رہے، بلکہ اول الذکر آخرالذکر کا تابع اور محکوم ہو کر رہ گیا۔ ان حالات میں اس نوع کی دستوری نزاع اور کشمکش جو پچھلے دور میں نظر آتی ہے اب قصۂ ماضی بن کر رہ گئی۔

نواں باب

پارلیمانی شاہی کا آغاز

ولیم سوم اور میری

ولیم کی دستوری پوزیشن

میری اور ولیم کو جب تاج پیش کیا گیا تو یہ بات بھی طے کردی گئی تھی کہ زمام حکومت ولیم کے ہاتھ میں رہے گی۔ ولیم ایک زیرک مدبر اور دانا سیاستداں تھا۔ وہ اس بات سے ناواقف نہیں تھا کہ جو تاج اس کے سر پر رکھا گیا ہے اس میں نہ وہ پہلی سی آب و تاب ہے اور نہ وہ پہلی سی چمک دمک۔ انقلاب نے شاہی اختیارات کی کچھ حدیں مقرر کردی تھیں۔ بادشاہ سے اب ایسے بہت سے اختیارات چھین لئے گئے تھے جن کا وہ سابق میں مدعی تھا۔ اب وہ کلیتہً قانون کا تابع تھا۔ وہ قوانین کو معطل کرسکتا اور نہ ان کے اثر سے کسی کو مستثنیٰ کرسکتا تھا۔ وہ اعلانِ شاہی (PROCLAMATION) کے ذریعہ سے کوئی جدید جرم قائم نہیں کرسکتا تھا۔ زمانۂ امن میں بلا منظوری پارلیمنٹ مستقل فوج نہیں رکھ سکتا تھا۔ پارلیمنٹ نے "تخصیصِ رقوم" کا حق حاصل کرلیا تھا۔ بادشاہ کے جاگیری حقوق ختم ہوچکے تھے۔ وہ جبری خدمت اور حق رسد (PREMPTION & PURVEYANCE) کا مطالبہ نہیں کرسکتا تھا اور نہ کسی پر مارشل لا (فوجی قانون) کے تحت مقدمہ چلا سکتا تھا۔ نظمائے عدالت کی برطرفی اب اس کی مرضی پر منحصر نہیں تھی۔ ایسی طاقتور انتظامی عدالتیں ختم ہوچکی تھیں جن پر ٹیوڈروں اور پہلے دو اسٹورٹ بادشاہوں نے اپنی مطلق العنانی کی بنیاد رکھی تھی۔ اب نہ عدالت اسٹار چیمبر تھی اور نہ کورٹ آف ہائی کمیشن لہ۔ یہ سب باتیں اب قصۂ ماضی بن گئیں۔

CONSTITUTIONAL HISTORY OF ENGLAND - MAITLAND. P, 388 — لہ

ولیم ان تمام پابندیوں سے واقف تھا اور ان کو اس نے قبول بھی کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پارلیمنٹ نے اس تمام قطع و برید میں بادشاہ کے عاملانہ اختیارات کو چھوا تک نہیں ہے۔ اسے اب بھی وسیع عاملانہ اختیارات حاصل تھے۔ وہ پارلیمنٹ کے ہاتھ میں کٹ پتلی نہیں تھا۔ انقلاب نے ایک حد تک وہی صورت پیدا کر دی تھی جو لنکسٹریوں کے زمانہ میں تھی۔ یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ انقلاب بھی ایک "عودِ شاہی" ہے۔ لیکن وہ شاہی، جو لنکسٹریوں کے عہد میں پائی جاتی ہے۔ بادشاہ عاملانہ میدان میں اب بھی مختارِ کُل تھا۔ اندرون و بیرونِ ملک وہ کسی بھی حکمتِ عملی کے اختیار کرنے میں آزاد تھا۔ خصوصیت کے ساتھ بیرونی حکمتِ عملی بالکلیہ اس کے اختیارِ تمیزی پر منحصر تھی۔ وہ اس ضمن میں جو چاہے فیصلہ کر سکتا تھا۔ اور عموماً پارلیمنٹ کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی تھی کہ حکومت اس خصوص میں کب کیا رویہ اختیار کرنے والی ہے۔ اس تعلق سے جب کوئی بات سامنے آتی تو ایک امرِ منفصلہ کی شکل میں سامنے آتی تھی۔ اور پارلیمنٹ اس مرحلہ پر بے بس ہو کر رہ جاتی۔ اسے اس فیصلے کے بدلنے کا نہ موقع ہوتا اور نہ اختیار۔ غرض ایگزیکیٹیو اختیارات کی حد تک بادشاہ اب بھی بادشاہ تھا۔ حکومت کی پالیسی ساز مشینری اس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر کام کرتی اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادشاہ نے کسی قانون یا دستور کی خلاف ورزی کی ہے۔ پارلیمنٹ نے بعض مخصوص سمتوں میں بادشاہ کو بے بس ضرور کر دیا تھا لیکن "حکومت" پر راست کنٹرول حاصل کرنے کا طریقہ ابھی تک اسے سُوجھا نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کسی مخصوص فیصلے پر چیخ و پُکار کر سکتی تھی یا پھر بادشاہ نے اس ضمن میں جس وزیر سے کام لیا تھا اسے مواخذہ کے ذریعہ سے وار پر کھینچ سکتی تھی۔ مگر بادشاہ کی قوتِ عمل کے چشمہ کو خشک کرنے سے قاصر تھی۔ حکومت کی مشینری پر قابض ہونے کے لیے ابھی اس دن کا انتظار کرنا تھا جبکہ وہ کیبنٹ کی ترقی کے ذریعہ سے عاملانہ اختیارات کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتی تھی۔ لیکن یہ دن ابھی دُور تھا۔ انقلاب کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ ادارۂ شاہی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا جائے۔ یا یہ کہ بادشاہ کو جمہوریہ کے ایک اعزازی صدر کی حیثیت دے دی جائے۔ قوم اس وقت ہرگز ایسا کوئی تصور نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ وہ یہ چاہتی تھی کہ بادشاہ ضرور رہے۔ اور بادشاہ بھی ایسا کہ حقیقی معنیٰ میں اس لقب کا اہل ہو۔ "وہ اپنے دائرہ میں مختار، کارکرد، اور واقعی فرماں روا ہو اور اپنی حکمتِ عملی کے اختیار کرنے میں آزاد" (میٹ لینڈ صفحہ 388)۔

ولیم اور سیاسی پارٹیاں

ولیم کو تخت کے ساتھ ساتھ بعض مشکلات بھی ورثہ میں ملیں. ملک میں اس وقت وہگوں اور ٹوریوں کی دو بڑی سیاسی پارٹیاں تھیں. ان دونوں کے عارضی اتحاد نے انقلاب کو ممکن بنایا تھا. قدرتی طور پر انقلاب کے بعد وہگ زیادہ قوت سے اُبھرنے لگے. ولیم ان دونوں کے تعاون واشتراک سے ہی اس نئے ملک پر حکومت کرسکتا تھا. ورنہ ویسے تو وہ ایک باہر کا آدمی تھا اور تعجب نہیں کہ ان حالات میں اسے یہاں کی دستوری اور سیاسی نزاکتوں کے سمجھنے میں کافی دشواری پیش آتی رہی. قدرتی طور پر وہ وہگوں کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتا تھا، کیونکہ وہگ اپنے سیاسی نظریات کی بنا پر اس "انقلابی انتظام" کے بڑے شدت کے ساتھ مویّد تھے. لیکن ٹوری باوجود انقلاب کے ساتھ اپنی وابستگی کے ولیم سے کسی شخصی وفاداری کا جذبہ نہیں رکھتے تھے. بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، اسٹورٹوں کی محرومی کا اپنے دل میں ایک دردِ پنہاں لئے ہوئے تھے. ان کی نظریں اب بھی سُمندر پار کے اس پار پڑتی رہتی تھیں جہاں فرانس میں جیمز دوم نے پناہ حاصل کی تھی. اسٹورٹ خاندان سے ٹوریوں کی اس جذباتی وابستگی نے ان کو ولیم سے بیگانہ رکھا. بلکہ ان میں جو انتہا پسند تھے وہ ولیم اور میری کو غاصب سمجھتے تھے. ٹوری تو اس طرح ولیم سے کچھ دُور دُور اور کورے کورے سے رہے مگر وہگ جن پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا وہ بھی ولیم کے لئے کچھ زیادہ مفیدِ مطلب ثابت نہیں ہوسکے. یہ لوگ اپنے سیاسی عقاید کی بنا پر ہر وقت اس بات کے خواہاں تھے کہ ادارۂ شاہی کی جہاں تک ہوسکے اور جب موقعہ ملے کتر بیونت کی جائے. ولیم اس لحاظ سے ان کو بھی شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا. غرض ولیم کو ان دونوں پارٹیوں سے ایک عجیب سابقہ تھا. ٹوری شخصی طور پر اس سے بیگانہ لیکن ادارۂ شاہی کے محافظ و پاسباں تھے اور وہگ گو اس کی بادشاہت کے پاسباں تھے مگر ادارۂ شاہی کو کمزور کرنے کے دَرپَے ـــ ان حالات میں تعجب نہیں کہ ولیم کو دونوں پارٹیوں سے حسبِ دلخواہ مدد اور تعاون حاصل نہ ہوسکا.

قانونِ رواداری سنہ 1689ء

ولیم کی تخت نشینی کے بعد ایک اہم مسئلہ مذہبی پالیسی کا تھا. "کلیرنڈن کوڈ" کے پاس ہونے

کے بعد سے منحرفین (DISSENTERS.) کے خلاف سخت تعزیری قوانین نافذ تھے۔ چارلس دوم اور جیمز دوم اپنے مقاصد کے لئے ان قوانین کو منسوخ کرکے "منحرفین" کے وسیع طبقے کی تائید و اعانت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ تدبیریں کچھ کارگر ثابت نہیں ہوئیں۔ "انقلاب" کے بعد پارلیمنٹ پر برابر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ کم از کم مذہبی آزادی کی حد تک اس طبقہ کی حالت کو کچھ بہتر بنایا جائے۔ ولیم خود کالوینی عقاید رکھتا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر اس کو "منحرفین" سے بہت ہمدردی تھی۔ اس کی اور دیگوں کی خواہش تھی کہ پروٹسٹنٹ "منحرفین" کے لئے سرکاری کلیسا کے دروازے پھر سے کھول دیئے جائیں اور ان کے لئے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں دوبارہ شمولیت (COMPREHENSION) کا موقعہ مل جائے۔ مگر کنونشن پارلیمنٹ میں ٹوریوں کی اکثریت تھی۔ اس لئے اس مطالبہ کی کچھ شنوائی نہ ہو سکی۔ البتہ ایک "قانونِ رواداری" (TOLERATION ACT) پاس کیا گیا۔ اس قانون کی رُو سے یہ طے کیا گیا کہ ایسے پروٹسٹنٹ جو حلفِ سیادت و اطاعت (OATH OF ALLEGIANCE & SUPREMACY) لینے تیار ہوں اور عقیدۂ لحم و دم (TRANSUBSTANTIATION) سے انکار کریں اپنی علٰحدہ عبادت گاہیں قائم کر سکتے ہیں جہاں انھیں ان کے عقاید کے مطابق عبادت کی اجازت ہوگی۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اینگلیکن اب بھی اس بات کے لئے تیار نہیں تھے کہ "منحرفین" کے خلاف جو قوانین موجود تھے وہ سب کے سب منسوخ کر دیئے جائیں۔ چنانچہ کلیرنڈن کوڈ کو منسوخ نہیں کیا گیا۔ چند شرائط کے ساتھ صرف عبادت کی حد تک آزادی عطا کی گئی لیکن اب بھی یہ لوگ قانوناً کسی عہدہ پر فائز نہیں ہو سکتے تھے۔ کلیرنڈن کوڈ نے قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک اینگلیکن، دوسرے منحرفین۔ قانونِ رواداری نے عملاً اس تقسیم کو برقرار رکھا۔ البتہ سابق میں سوائے اینگلیکن مذہب کے کسی اور مکتبِ خیال کو قانون تسلیم نہیں کرتا تھا۔ مگر اب پہلی مرتبہ اس قانون کے ذریعہ سے مذہب کے معاملہ میں انحراف اور اختلاف کو ایک حد تک تسلیم کیا گیا۔ اب اینگلیکن کلیسا کے برابر برابر ڈسنٹرز (DISSENTERS.) کی عبادت گاہیں بھی زندہ اور کارکرد رہ سکتی تھیں۔ ان کو قانوناً کچلا نہیں جا سکتا تھا۔ قانونِ رواداری اس حد تک ایک ترقی پذیر تصوّر کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس رواداری کو بہت محدود رکھا گیا۔ پروٹسٹنٹوں میں فرقہ یونی ٹیرین (UNITARIANS —) کو یہ رعایت نہیں دی گئی اور رومن کیتھولکوں کو بھی اس سے محروم رکھا گیا۔ ان طبقات کے خلاف تعزیری قوانین بدستور نافذ رہے۔ اس طرح

قانونِ رواداری ایک نیم دِلانہ اقدام تھا۔ کامل مذہبی آزادی اور مساوات کے لئے قوم کو ابھی کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے زاید انتظار کرنا تھا۔

پارلیمنٹ کے سالانہ اجلاس

ولیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی انگلستان فرانس کے ساتھ ایک طویل جنگ میں اُلجھ گیا جو 1689ء سے 1697ء تک جاری رہی۔ جنگ کی مجبوریوں نے تاج کو پارلیمنٹ کا زیادہ دست نگر بنا دیا۔ جنگ کے جاری رکھنے کے لئے ولیم کو دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک فوج، دوسرے روپیہ۔ انگلستان میں مستقل فوج کی برقراری کو ہمیشہ بدظنی سے دیکھا گیا۔ حالیہ واقعات نے اس بدظنی میں اضافہ کر دیا تھا۔ ٹوری، فوج کے اس لئے مخالف تھے کہ ان کی نظر میں اسی نے چارلس کو سولی پر چڑھایا اور ملک میں جمہوری حکومت قائم کی۔ وہگ، فوج سے اس لئے خائف تھے کہ کہیں بادشاہ جیمز دوم کی طرح اس سے کام لے کر قومی حرّیت اور آزادی کو پامال کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مگر لوئی چہاردہم سے مقابلہ درپیش تھا۔ انگریز قوم اس خطرہ سے بخوبی واقف تھی۔ اس لئے ولیم کو اس خصوص میں ہر ممکنہ مدد بہم پہنچانے کے لئے تیار تھی۔ چنانچہ فوج کی برقراری کی یہ صورت نکالی گئی کہ 1689ء میں "قانونِ غدر" پاس کیا گیا۔ اس سے حکومت کو فوج کے انتظام و انصرام اور اس میں نظم و ضبط قائم رکھنے کا اختیار دیا گیا لیکن پارلیمنٹ نے یہ اختیار صرف چھ مہینے کے لئے دیا۔ تاکہ فوج کی برقراری کی کنجی اس کے ہاتھ میں رہے۔ حکومت مجبور تھی کہ ہر چھ ماہ کے بعد اس قانون کی تجدید کے لئے پارلیمنٹ کے سامنے آئے۔ بعد میں اس قانون کی مدّت ایک سال کر دی گئی۔ غرض قانون غدر کا عملاً نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ ہر سال پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح اس قانون نے بالواسطہ پارلیمنٹ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کو ناگزیر کر دیا۔

پارلیمنٹ کا مالیاتی کنٹرول

دوسرا مسئلہ روپیہ کی فراہمی کا تھا۔ پارلیمنٹ اس جنگ کے لئے دل کھول کر روپیہ دینے تیار تھی۔ مگر روپیہ کی منظوری کے طریقہ میں ضمناً ایک اہم دستوری ترقی کی راہ نکل آئی۔ اس طریقۂ کار کو عام طور پر تخصیص رقوم (APPROPRIATION OF SUPPLIES.) کا نام دیا

جاتا ہے۔ ولیم سوم کے عہد سے اس کو دستوری ضابطہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اگرچہ پچھلے ادوار میں بھی کہیں کہیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن وہ شاید غیر معمولی حالات کا نتیجہ تھیں۔ اس لئے اس کی کوئی دستوری نظیر پیدا نہ ہو سکی۔ لنکسٹریوں کے عہد میں بعض اوقات پارلیمنٹ مخصوص مدات کے لئے مخصوص رقمیں منظور کرتی تھی۔ اور بعد میں بادشاہ اور اس کے وزیروں سے اس کا حساب بھی پوچھا جاتا تھا۔ اور یہ جانچ کی جاتی تھی کہ پارلیمنٹ نے جن ابواب کے لئے رقم مختص کی تھی اس کی کہاں تک پابندی کی گئی۔ لیکن یارک اور ٹیوڈر خاندانوں کے زمانے میں یہ عملدرآمد قائم نہ رہ سکا۔ سترھویں صدی سے پھر اس کی مثالیں ملنے لگتی ہیں۔ چنانچہ چارلس دوم کے عہد کی ایک مثال نظر سے گزر چکی ہے۔ ولیم کے عہد سے تو یہ طریقہ دستور کے ایک ضابطہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جنگ کا ایسا دباؤ تھا کہ سال بہ سال روپیہ کی منظوری لینی پڑتی تھی اور پارلیمنٹ یہ منظوری صرف ایک سال کے لئے دیتی تھی۔ اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمنٹ کا سالانہ اجلاس ناگزیر ہوگیا۔ اس کے قطع نظر تخصیص رقوم کے طریقہ کی وجہ سے رفتہ رفتہ فوجی اور سیول خرچ کی مدات کو بالکل الگ کر دیا گیا۔ 1697ء میں پارلیمنٹ نے ولیم کو سات لاکھ پونڈ سالانہ کی رقم منظور کی لیکن اس رقم پر فوج اور بحریہ کے اخراجات کا بار نہیں تھا۔ یہ رقم حکومت کی صرف سیول ضروریات کے لئے مختص کی گئی تھی۔ اس میں البتہ بادشاہ کے خانگی مصارف کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ انگلستان میں سیول لسٹ (CIVIL LIST.) کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ فوج کے لئے پارلیمنٹ جو رقم منظور کرتی ہے وہ کافی نہیں تھی۔ البتہ بادشاہ کو اس نے مجاز گردانا تھا کہ اس کمی کی پابجائی کے لئے وہ قرضہ حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ ولیم نے قوم سے قرض لینا شروع کیا۔ اور یہ قرض اتنا بڑھ گیا کہ بالآخر اسے "قومی قرضے (NATIONAL DEBT) کی صورت دے دی گئی اور اسی کے انتظام و انصرام کے ضمن میں انگلستان کا وہ مشہور مالیاتی ادارہ وجود میں آیا جس کو بینک آف انگلینڈ کہتے ہیں۔

قانونِ سہ سالہ

ان حالات میں یہ خوف تو باقی نہیں رہا تھا کہ پادشاہ پارلیمنٹ کے بغیر حکومت کرنے کی کوشش کرے گا۔ البتہ اگر خوف تھا تو یہ تھا کہ کسی پارلیمنٹ کو اپنا موافق اور ہمنوا

پاکر بادشاہ اسے برخواست کرنے سے کہیں گریز نہ کرنے لگے۔ پچھلے قوانین کی رُو سے صرف یہ پابندی تھی کہ پارلیمنٹ کم سے کم تین سال میں ایک مرتبہ ضرور طلب کی جائے۔ لیکن اس کے دَوران یا مدّتِ حیات کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ چارلس دوم نے اپنی دوسری پارلیمنٹ کو کم وبیش اٹھارہ سال برقرار رکھا۔ پارلیمنٹ اس خامی کو دُور کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ 1692ء میں اس نے ایک مسودۂ قانون منظور کرکے بادشاہ کی دستخط کے لئے بھیجا۔ مگر ولیم نے اسے نامنظور کر دیا۔ وہ اسے اختیاراتِ شاہی میں پارلیمنٹ کی بے جا مداخلت تصور کرتا تھا۔ اگلے سال دارالعوام نے اسی قسم کے ایک دوسرے مسودہ کو مسترد کر دیا کیونکہ اولاً دارالامراء میں اس کی پیش کشی عمل میں آئی تھی۔ دارالعوام اس طریقۂ کار کو اپنے امتیازات میں دارالامراء کی بیجا دست اندازی سمجھتا تھا۔ 1694ء میں بالآخر دارالعوام کی تحریک پر یہ قانون پاس ہوگیا۔ ولیم اپنی مخالفت سے دست کش ہوگیا۔ اس قانون کی رُو سے یہ طے کیا گیا کہ کوئی پارلیمنٹ تین سال سے زاید عرصہ کے لئے برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس کی مدّتِ حیات تین سال قرار پائی۔

آزادیٔ صحافت

انقلابِ سلطنت نے جہاں مختلف سمتوں میں دستور کی ترقی کی گنجائش پیدا کی تھی وہیں صحافت کی آزادی کے لئے ایک سازگار فضا پیدا کردی۔ بدلے ہوئے حالات میں صحافت کا سابق کی طرح پابندِ قیود ہونا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹیوڈروں کے زمانہ سے پریس پر سخت پابندیاں عاید تھیں۔ اسٹورٹوں نے ان پابندیوں کو برقرار رکھا بلکہ جیمز اول، اور چارلس اول نے اس میں زیادہ سختیاں پیدا کردیں۔ دولتِ عامّہ کے دَور میں بھی صحافت کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ عودِ شاہی کے بعد صحافت کے احتساب کا جدید قانون پاس کیا گیا۔ یہ میعادی قانون تھا جو انقضائے میعاد کے بعد محتاجِ تجدید رہتا تھا۔ ولیم کے عہد میں 1695ء میں جب اس کی تجدید کا مسئلہ سامنے آیا تو پارلیمنٹ نے اس کی تجدید نہیں کی۔ اس طرح صحافت پر جو پابندیاں تھیں وہ یکلخت برخواست ہوگئیں۔ اس بند کا ٹوٹنا تھا کہ صحافت کی دنیا میں اک سیلاب آگیا۔ سیاسی پارٹیوں نے اخبار اور پمفلٹ کے ذریعہ سے وہ رزم آرائیاں شروع کیں جو اس عہد میں اپنی آپ یادگار ہیں۔ ملک کے مشہور اور نامور ادیبوں نے بھی اس میں حصّہ لینا شروع کیا۔ اس سے ملک میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا ہوا اور

آئندہ جمہوری اقدار و افکار کی ترویج و ترقی کے لئے راہیں کھل گئیں ۔

وزراء کے تقرر کا مسئلہ اور کابینی رجحانات

ولیم کے لئے اپنی حکومت کی تشکیل کا مسئلہ کچھ آسان نہ تھا ۔ ملک میں دو بڑی سیاسی پارٹیاں تھیں ۔ سیاسی قیادت ان دونوں میں بٹی ہوئی تھی ۔ پارلیمنٹ بھی ملک کی اس سیاسی دو رنگی کی عکاسی کرتی تھی ۔ ولیم کو ایک ایسی پارلیمنٹ سے سابقہ تھا جس میں ٹوری اور وہگ، قدرتی طور پر ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے، ان دونوں میں کسی مشترک وفاداری یا باہمی اتفاق و اتحاد کا کوئی سوال نہیں تھا ۔ پارلیمنٹ میں ہر تین سال کے بعد عام انتخابات کی وجہ سے دونوں پارٹیوں کی پوزیشن میں فرق واقع ہو جاتا تھا کبھی ٹوری اکثریت میں ہوتے تو کبھی وہگ ۔ ایسے غیر یقینی حالات میں دونوں پارٹیوں کی شدید رزم آرائی کے مدنظر ولیم کو اپنے وزراء کا منتخب کرنا سخت مشکل تھا ۔ اس وقت ایسا کوئی تصور موجود نہیں تھا کہ دارالعوام میں اکثریت رکھنے والی پارٹی کو وزارت میں نمائندگی ملنی چاہئے ۔ اس زمانے میں اگر ایسی کوئی بات کہی جاتی تو ہم عصروں کے لئے ایک اچنبھا ثابت ہوتی ۔ اس عہد کے لوگ اس تصور سے قطعاً نابلد اور ناآشنا تھے ۔ نیز یہ کہ بادشاہ ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اپنے وزیروں کے چننے میں وہ دارالعوام میں پارٹیوں کی عددی پوزیشن کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہے ۔ ولیم یہ سمجھتا تھا کہ اس کے عاملانہ اختیارات میں پارلیمنٹ کوئی مداخلت نہیں کر سکتی ۔ وزراء کا تقرر اسی اختیار کا ایک اہم جزو تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ وزراء کا تقرر اور ان کی برطرفی کلیتہً اس کے اختیارِ تمیزی پر منحصر ہے ۔ وہ پارلیمنٹ کو اس میں دخیل ہونے کا موقعہ دینا نہیں چاہتا تھا ۔ ولیم سوم نے اپنے آخری زمانے تک یہی کوشش کی کہ اس اہم اختیار کو وہ اپنے ہاتھ سے جانے نہ دے ۔ پریوی کونسل کے تمام تقررات وہ اپنی مرضی سے کرتا تھا ۔ ان میں سے جن کو چاہتا ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز کرتا ۔ ان عہدہ داروں کی یہی چھوٹی سی جماعت، وزارتی کونسل یا کیبنٹ کی حیثیت اختیار کر لیتی ۔ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی مگر وہ خود اپنے طور پر فیصلے کرنے کے مجاز نہیں تھے ۔ وہ صرف بادشاہ کے حکم بردار تھے ۔ ان میں سے وہ جن سے چاہتا مشورہ کرتا، اور جن کو چاہتا نظر انداز کرتا اپنی اس کیبنٹ سے وہ مشورہ لینے پر مجبور نہ تھا، اور نہ ان کے مشوروں کا پابند تھا ۔ وہ ایسے

لوگوں سے بھی مشورہ کرسکتا تھا جن کا وزارتی کونسل سے کوئی تعلق نہیں تھا. لیکن جو اس کی رائے میں ملک کی سیاسی زندگی میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور رائے عامہ کی بہتر طریقہ سے ترجمانی کرسکتے ہیں. غرض وزارت کے بنانے یا اپنی حکمتِ عملی کی تشکیل میں وہ کسی قسم کے بیرونی اثرات کا پابند نہیں تھا. کبھی کبھی یہ ہوسکتا تھا کہ بہ نظرِ مصلحت وہ کسی خاص پارٹی کے لیڈروں کو اپنی وزارت میں زیادہ وسعت سے نمائندگی عطا کرے. مگر یہ بات کسی مجبوری یا دستوری پابندی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اس کی اپنی سہولت اور مصلحت کی بنا پر ہوتی تھی. وہ اہم ترین سیاسی فیصلے اپنی مجلسِ وزرار سے استمزاج کے بغیر بلکہ بعض اوقات اس کے مشوروں کے برخلاف کرسکتا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس پر کوئی گرفت کرے. غرض ولیم کی کیبنٹ وہ کیبنٹ نہیں تھی جسے ہم آج کل کیبنٹ کہتے ہیں. آج کل بادشاہ کیبنٹ کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہے. لیکن ولیم کی کیبنٹ اس کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھی.

پارلیمنٹ میں دو سیاسی فریقوں کی موجودگی ایک ایسی حقیقت تھی کہ یہ نووارد بادشاہ اس کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا. ان حالات میں قدرتی طور پر اس کی یہ خواہش تھی کہ دونوں ہی پارٹیوں سے اس کی بنی رہے. اس لئے عام طور پر اس کی یہ کوشش رہی کہ اپنے وزیروں اور مشیروں کو منتخب کرنے میں دونوں پارٹیوں کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے. کسی ایک سیاسی فریق سے اتحاد ولیم کو نامناسب بلکہ خطرناک نظر آیا. ہر چند وہ یہ جانتا تھا کہ ٹوریوں کے مقابلہ میں وہگوں کی وفاداری زیادہ یقین آور اور قابلِ بھروسہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مشیروں کو صرف وہگ پارٹی سے منتخب کرنے کے لئے تیار نہیں تھا. یہ تہمت وہ اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا کہ وہ پوری قوم کا نہیں بلکہ صرف ایک سیاسی پارٹی کا سرپرست، رہنما اور لیڈر رہے. وہ اپنی بادشاہت کو دونوں فریقوں کی رزم آرائیوں کی سطح سے بلند رکھنا چاہتا تھا. اس لئے قدرتی طور پر وہ ایسی وزارتیں تشکیل دیتا رہا جس میں دونوں فریقوں کی نمائندگی تھی. ولیم کے عہد کی کیبنٹ عموماً مخلوط کیبنٹ ہوا کرتی تھی. دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو وزارت میں یکجا جمع کیا جاتا تھا. مگر مخلوط وزارتیں کبھی کامیاب ثابت نہیں ہوئیں. خیال تو یہ تھا کہ دونوں فریقوں کے لیڈروں کی وزارت میں موجودگی سے یہ لوگ دارالعوام میں اپنی اپنی پارٹی کو عمدگی سے قابو میں رکھ سکیں گے. اس طرح حکومت کو دارالعوام کا کلی تعاون حاصل ہوگا. لیکن عملاً اس سے کچھ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے اور نہ حکومت کی سرانجام دہی میں اس سے کوئی سہولت

پیدا ہوئی بلکہ وہگ اور ٹوری وزرار کا بیسنہ میں ایک دوسرے سے لڑپڑتے تھے۔ اور دوسری طرف دارالعوام میں وہگ اراکین ٹوری وزیروں کو اور ٹوری اراکین وہگ وزیروں کو بیدردی سے نشانِ ملامت بناتے تھے۔ غرض مخلوط وزارتوں کا تجربہ کچھ اُمید افزا ثابت نہیں ہوا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گو کیبنٹ ایک منقسم کنبہ تھی لیکن اس کی اپنی ترقی پذیر منفرد وحدت برابر برقرار رہی۔ قانون کی نگاہ میں زمامِ حکومت پریوی کونسل اور صرف پریوی کونسل کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن عملاً انتظامِ مملکت کا کام ایک چھوٹی سی جماعت کے چند افراد کرتے تھے جن سے بادشاہ رسمی اور غیر رسمی طور پر مشورے کرتا تھا۔ اور جنھیں بعض اوقات مملکت کے اعلیٰ ترین عہدے بھی سپرد کئے جاتے تھے۔ دارالعوام میں اس جماعت پر سخت حملے ہوتے تھے کیونکہ قانوناً اس کا کہیں وجود نہیں تھا، لیکن عملاً وہ ہر وقت موجود تھی۔ اس کے مشوروں اور فیصلوں پر راز کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ اس قسم کی "خفیہ" اور "سازشی" جماعت کو دستور کے مغائر جان کر پارلیمنٹ اس کو مٹانے کے درپے تھی۔ لیکن ان پیہم حملوں کے باوجود یہ چھوٹی سی گم نام جماعت فنا ہونا تو درکنار برابر ترقی کرتی رہی اور پریوی کونسل کے تناور درخت سے ایک "قرضدار" کی طرح پھوٹ کر ایسا نمو پاتی رہی کہ بالآخر اس پر پوری طرح چھا گئی اور اسے نظروں سے اوجھل کر دیا۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ ولیم کے دور میں تو اس کی حیثیت ایک ایسے ناخواندہ مہمان کی تھی جو اپنے میزبانوں سے چھپتے چھپاتے کہیں ان کے دسترخوان تک جا پہنچا ہو اور ندامت و شرمندگی سے ان کے سامنے سر اُٹھانے کے قابل نہ ہو۔

ولیم کی پارلیمنٹیں ہر انتخاب کے بعد اپنا سیاسی رنگ بدلتی رہیں۔ کونشن پارلیمنٹ پر وہگ چھائے ہوئے تھے۔ 1690ء کے انتخاب میں ٹوریوں کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ 1695ء میں پھر سے وہگوں کو اکثریت حاصل ہوئی۔ لیکن 1698ء اور 1701ء کی پارلیمنٹوں نے دوبارہ ٹوریوں کو غلبہ عطا کیا۔ ولیم شروع سے ہی قدرتی طور پر مخلوط وزارتوں کی تشکیل کی طرف مائل تھا، لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ تجربہ کچھ اُمید افزا ثابت نہیں ہوا۔ 1694ء میں میری کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد سے ٹوریوں کی ولیم سے وفاداری کچھ اور متزلزل ہوگئی۔ انھیں ولیم سے ہمدردی اور دلچسپی کم تھی لیکن چونکہ جنگ جاری تھی اس لئے وزارت کے تعلق سے کوئی نازک صورتِ حال پیدا نہ ہوسکی۔ ٹوری با دلِ ناخواستہ ہی سہی ولیم سے

تعاون کرتے رہے۔

اسی زمانہ میں ارل آف سنڈرلینڈ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کیبنٹ صرف کسی ایک فریق کے نمائندوں پرمشتمل ہونا چاہیے۔ اس سے وزراء میں ہم آہنگی اور یکجہتی قائم رہے گی اور کیبنٹ کو اندرونی اختلاف اور کشمکش سے نجات ملے گی۔ 1695ء کے انتخابات میں وہگوں کو دارالعوام میں اکثریت حاصل ہوئی لیکن اس سے پہلے ہی ولیم نے اپنی کیبنٹ کو وہگوں سے بھرنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اس کی جنگ کی پالیسی کے زیادہ مویّد تھے۔ 1696ء تک ٹوریوں کے مکمل اخراج کے بعد ایک ٹھیٹ وہگ کابینہ وجود میں آچکی تھی، اس کو "وہگوں کی ٹولی" (WHIG JUNTO :) کا نام دیا گیا۔ یہ نام خود اس کی عدم مقبولیت کا ثبوت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت کابینہ ان ہی لوگوں پر مشتمل تھی جن کی پارٹی کو دارالعوام میں اکثریت حاصل تھی لیکن اس کو کابینی نظام کی مسلسل تاریخ کا نقطۂ آغاز نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ 1698ء میں جب انتخابات میں وہگوں کو شکست ہوئی تو انھوں نے وزارت سے مستعفی ہونا کوئی ضروری نہیں سمجھا حالانکہ پارلیمنٹ میں اب ٹوریوں کو غلبہ حاصل تھا۔

ٹوری، ولیم کی خارجہ پالیسی سے ناخوش تھے۔ ابھی حال حال میں (1697ء) میں فرانس سے جنگ ختم ہوئی تھی۔ اب یہ ٹوری پارلیمنٹ مزید جنگ آزمائی کو روکنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے فوج پر ہاتھ مارا۔ اس کی تعداد گھٹا کر سات ہزار کر دی۔ ولیم کے محافظ ولندیزی دستہ کو برخواست کر دیا۔ اور اس کی اندرونی و بیرونی پالیسیوں کو شدت سے ہدف ملامت بنایا۔ بلکہ یہاں تک کیا کہ ولیم نے اپنے ولندیزی جنرلوں اور مصاحبوں میں جو زمینات بطورِ عطیہ کے تقسیم کی تھیں اسے بذریعہ قانون منسوخ کر دیا۔ یہ باتیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ پارلیمنٹ اب بادشاہ پر کس حد تک چھا گئی تھی۔ جب وہ کسی بات پر اَڑ جاتی تو کوئی قوت اسے اس کے ارادوں سے باز نہ رکھ سکتی۔ جہاں تک کابینہ کے نشوونما کا سوال ہے، ولیم کے عہد میں کوئی مزید تبدیلیاں یا ترقیاں نظر نہیں آتیں۔ البتہ ایک جدید سیاسی ادارے کی حیثیت سے اس کا وجود ایک حقیقت بن چکا تھا، گو اس کو مٹانے کی ابھی کوششیں جاری تھیں۔

قانونِ وراثت 1701ء ACT OF SETTLEMENT.

ولیم کے آخری زمانے میں وراثت کے مسئلہ کو ایک نئی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ قانونِ حقوق کی رُو سے جو انتظام کیا گیا تھا اس کے موثر رہنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں تھی۔ میری لاولد مرچکی تھی۔ ولیم کے کوئی اور اولاد نہیں تھی۔ اب تخت کی حقدار این تھی۔ لیکن 1700ء میں اس کا لڑکا ڈیوک آف گلاسٹر انتقال کرگیا۔ اس کے انتقال کے بعد این کے کوئی اولاد باقی نہیں رہی، چونکہ وہ کافی معمر ہوچکی تھی اس لئے اس کے سلسلہ کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان حالات میں تخت و تاج کی وراثت کا از سرِ نو تعین کرنا ازحد ضروری تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ این کے بعد" قانون حقوق" کی رُو سے کوئی وارثِ تخت باقی نہیں رہا تھا۔ پارلیمنٹ کی دونوں پارٹیوں میں انتہا پسند موجود تھے۔ ٹوری انتہاپسندوں سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ آئندہ جیمز دوم کی اولاد کے حقوق کی دوبارہ علمبرداری کریں۔ وہگوں میں ایک گروہ ایسا موجود تھا جو ادارہ بادشاہت کو ہی ختم کرنے کا خواہاں تھا۔ اس سے آئندہ خلفشار کا اندیشہ تھا۔ اس لئے پارلیمنٹ کو از سرِنو اس مسئلہ کا جائزہ لینا پڑا۔ ٹوری ہرچند اسٹورٹ خاندان کا بڑا درد رکھتے تھے مگر اینگلیکن مذہب ان کو اس سے سوا پیارا تھا۔ اس کو وہ خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ اس مذہب کی حمایت و حفاظت کے لئے انھوں نے قانونِ وراثت (ACT OF SETTLEMENT) کی پیش کشی اور منظوری میں سرگرم حصہ لیا۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ قانون ایک ٹوری پارلیمنٹ کا منظور کردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہگوں کا معتدل طبقہ بھی یہی چاہتا تھا کہ تخت و تاج کی وراثت کسی پروٹسٹنٹ خاندان کو ہی منتقل کی جائے۔ چنانچہ اس قانون کے ذریعہ سے جیمز دوم اور اس کی اولاد کے " موروثی حقوق" کو یکسر نظر انداز کرکے صوفیا الکٹریس آف ہنوور (SOPHIA ELECTRESS OF HANOVER —) اور اس کی اولاد کو وارثِ تخت و تاج ٹھیرا گیا۔ صوفیاؔ جیمز اول کی نواسی تھی۔ اس کو صرف اس لئے چُنا گیا کہ وہ پروٹسٹنٹ تھی۔ قانون نے یہ وضاحت کردی کہ ایسا کوئی شخص جو کلیسائے انگلستان (اینگلیکن مذہب) کا پیرو نہ ہو، انگلستان کا بادشاہ نہیں بن سکتا۔ اس قانون نے نہ صرف ایک غیرملکی خاندان کو انگلستان کا تاجدار بنادیا بلکہ" موروثی اور آسمانی حقوق" کے نظریات کا ہمیشہ کے لئے جنازہ نکال دیا۔ ان نظریات

کی رُو سے تاج کے جائز حقدار صرف جیمز اور اس کی اولاد قرار پا سکتی، مگر پارلیمنٹ نے ان کو محروم کر کے عملاً یہ اعلان کر دیا کہ انگلستان کا تاج و تخت صرف پارلیمنٹ کا عطیہ ہے۔ وہ جسے چاہے بخش سکتی ہے اور جسے چاہے محروم کر سکتی ہے۔

دستوری نقطۂ نظر سے یہ فیصلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ "مدعیان حقوق آسمانی کے تابوت میں یہ آخری کیل تھی۔ اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس کیل کے ٹھونکنے میں ٹوریوں نے بڑا سرگرم حصّہ لیا۔"

اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پارلیمنٹ نے اس قانون میں بعض خالص دستوری نوعیت کی دفعات بھی شریک کر دیں۔ یہ طے کیا گیا کہ عدلیہ کے حکّام کی مدّتِ ملازمت کا انحصار ان کی خوش روّیگی پر ہوگا نہ کہ بادشاہ کی خوشنودی پر۔ کسی جج کو ہٹانے کے لئے یہ لازم ہوگا کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوان بادشاہ کو اس بارے میں ایڈریس پیش کریں۔ اس دفعہ کو عدلیہ کی آزادی کا منشور سمجھنا چاہئے۔ یوں تو انقلاب کے بعد سے عملاً یہ تحفظ حاصل ہو چکا تھا لیکن اب اس کو قانونی ضمانت حاصل ہوگئی۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی طے کر لی گئی کہ بادشاہ کا حکم معافی، مواخذہ کی کارروائی کو روک نہ سکے گا۔

قانونِ وراثت میں دو دفعات ایسی بھی شریک کر لی گئیں کہ اگر ان پر عمل درآمد شروع ہو جاتا تو کابینی ارتقاء کی تمام راہیں بند ہو جاتیں۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ ہمعصر سیاست دان اور مدبّر اس بات کی کوئی پیش بینی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ فرسودہ اور ناپسندیدہ ادارہ آئندہ کیا سے کیا کچھ بننے والا ہے۔ اور اس سے مقننہ اور عاملہ کے متصادم تعلقات کی پیچیدگیوں کا کیسا خوبصورت اور انوکھا حل نکلنے والا ہے۔ قانون میں اس بات کی صراحت کی گئی کہ "انتظام مملکت کے تمام فیصلے صرف پریوی کونسل کے اجلاس میں کئے جائیں اور جن اراکین کونسل نے ان فیصلوں کی تائید کی ہو وہ ان پر اپنے دستخط ثبت کریں۔" اس دفعہ کا مقصد پریوی کونسل کو پھر سے زندہ کرنا تھا تاکہ حکومت کی زمام پھر سے اس کے ہاتھ میں آجائے اور کیبنٹ جو بظاہر اس کے اختیارات کو غصب کرتی نظر آتی تھی اس کو مٹا دیا جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر یہ دفعہ منسوخ نہ ہو جاتی تو انگلستان کا دستوری ڈھانچہ کس قسم کا ہوتا۔ مگر یہ صاف ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ آگے قدم بڑھانے کی بجائے ماضی کی طرف پلٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اب بھی بادشاہ اور اس کے وزرا کو قابو میں رکھنے کے لئے مواخذہ کے بھونڈے اور

ازکار رفتہ طریقہ کو زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ یہ بات ابھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ عاملہ کو قابو میں رکھنے کا راز کابینی نظام کی ترقی میں مضمر ہے۔ اس کم اندیشی کی وجہ سے ترقی کی اس راہ کو بند کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ دفعہ نافذ ہونے سے پیشتر ہی منسوخ ہوگئی۔

ایک اور مسئلہ پارلیمنٹ میں بادشاہ کے ملازمین اور وظیفہ خواروں کا تھا۔ پارلیمنٹ یہ محسوس کرتی تھی کہ بادشاہ سے تنخواہ پانے والے اَن گنت لوگ ایوان کے ممبر ہو جاتے ہیں۔ اس سے ایوان کی آزادی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس خرابی کو روکنے کے لئے "قانونِ وراثت" میں یہ دفعہ درج کی گئی کہ کوئی ایسا شخص جو بادشاہ سے کسی قسم کا وظیفہ یا تنخواہ پاتا ہو یا اس کے تحت کسی خدمت یا منصب پر فائز ہو تو وہ دارالعوام کا رکن نہیں بن سکتا۔ متذکرہ صدر دفعہ کی طرح اس دفعہ کا نفاذ بھی ہنوورین خاندان کی جانشینی کے بعد سے شروع ہونے والا تھا۔ اس دفعہ پر اگر عمل درآمد ہوتا تو وزراء دارالعوام کے ممبر نہ ہو سکتے۔ اس سے آئندہ کابینی نظام کی ترقی پر جو اثر پڑتا وہ محتاج بیان نہیں۔ لارڈ میکالے نے لکھا ہے کہ "اس کے نتیجہ میں دارالعوام کی حیثیت بہت گر جاتی اور دارالامراء نہایت طاقتور ایوان بن جاتا۔" بہت جلد یہ محسوس کیا گیا کہ یہ تحدید آئندہ بہت سی خرابیوں اور پیچیدگیوں کا باعث ہوگی۔ لہٰذا اس کو بھی سابقہ دفعہ کے ساتھ 1705ء میں منسوخ کر دیا گیا۔ اس طرح کابینی ترقی کے راستے میں جو بڑی بھاری رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں وہ خود بخود دور ہو گئیں۔

ولیم کی آخری پارلیمنٹ میں اگرچہ ٹوری چھائے ہوئے تھے مگر ولیم نے ایک مِلی جُلی وزارت بنائی جس میں دونوں پارٹیوں کے نمائندے موجود تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وزارت میں ٹوریوں کے مقابلہ میں وہگوں کا پلہ بھاری تھا۔ لیکن پارلیمنٹ کو اپنی ٹوری اکثریت کے باوجود اس قسم کی مخلوط وزارت پر کچھ اعتراض نہ ہوا۔ بلکہ ولیم نے اپنے مرنے سے پہلے یورپی طاقتوں کے ساتھ جو "اتحادِ عظیم" (GRAND ALLAINCE) قائم کیا اور وزارت وقت اس ضمن میں جو جنگ کی تیاریاں کر رہی تھی، پارلیمنٹ اس کی مکمل تائید پر کمربستہ نظر آتی تھی۔ سیاسی پارٹیاں اپنی عددی اکثریت سے حکومت پر قبضہ جمانے کا طریقہ ہنوز سیکھ نہ سکی تھیں۔

دسواں باب

پارلیمانی شاہی کا آغاز

این

این اور کابینہ

این کے عہدِ حکومت کو سیاسی اور دستوری دونوں اعتبارات سے ولیم کے دَور کا تتمہ اور تکملہ سمجھنا چاہیے۔ این جب تخت نشین ہوئی تو وہ پچاس سال سے کچھ اُوپر کی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی ذہین عورت نہیں تھی۔ اس کی صلاحیتیں اوسط درجہ کی تھیں۔ لیکن وہ عقلِ سلیم ضرور رکھتی تھی اور اس قابل تھی کہ عملی سیاسیات کے مسائل سے عہدہ برآ ہوسکے۔ وہ اپنے جذبات اور رجحانات کے لحاظ سے ٹوریوں کی ہمدرد اور ہم خیال تھی۔ اسے اپنے اسٹورٹ ہونے پر فخر ضرور تھا لیکن وہ اسٹورٹوں کے نظریہ "حقوقِ آسمانی" کی مویّد یا مدّعی بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ٹوریوں کے اس انتہا پسند گروہ کا آلۂ کار بننا نہیں چاہتی تھی جو اَب بھی اس نظریہ کا حامی تھا اور "انقلاب" کو محض ایک ناجائز بغاوت تصور کرتا تھا۔ مذہب کے اعتبار سے وہ اینگلیکن کلیسا کی پیرو تھی۔ اس کی کلیسائے انگلستان سے وابستگی کسی مصلحت کی بنا پر نہیں تھی بلکہ یہ تعلق ایک شدید جذباتی رشتے کی بنیادوں پر قائم تھا۔

این کو وراثت میں ولیم کی مخلوط کابینہ ملی جس کو وہ بہت جلد اپنے اختیار سے ٹوری رنگ دینے لگی۔ فی الوقت اہم بات یہ نہیں تھی کہ ملکہ ایک وِگ وزارت کو ٹوری وزارت میں تبدیل کر رہی تھی بلکہ یہ حقیقت بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ کابینہ بحیثیت ایک ادارے کے اپنے آپ کو زندہ اور سرگرم رکھنے میں کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ پچھلے دَور میں

اس کا گلا گھوٹنے کی جو کوشش کی گئی تھی وہ بار آور ثابت نہیں ہوئی۔ 1705ء کے ایک ترمیمی قانون کے ذریعہ سے قانونِ وراثت کی اس دفعہ کو منسوخ کر دیا گیا جس کے نتیجہ میں وزراء دارالعوام کے رُکن نہیں بن سکتے تھے۔ اس قانون نے کابینہ کے آئندہ ارتقاء کی راہ میں جو رکاوٹ کھڑی کی گئی تھی اسے دُور کر دیا۔ عام طور پر ہر ہفتہ کابینہ کا اجلاس ملکہ کے کمرۂ خاص میں ہوتا تھا۔ اس میں سلطنت کے اہم محکموں کے سربراہ شرکت کرتے تھے۔ چانسلر، پریوی سیل، لارڈ پریسیڈنٹ، معتمدین (SECRETARIES.) اور امیر خزانہ بالالتزام اس کے اجلاس میں شریک رہا کرتے تھے۔ ملکہ کیبنٹ کونسل کی صدارت کرتی۔ اس مجلس کا کام غیر رسمی نوعیت کا تھا۔ ملکہ کی موجودگی میں وزراء اہم مسائل کا جائزہ لیتے اور ان کے بارے میں کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اراکین کونسل میں کوئی باہمی اتحاد تھا اور نہ یکجہتی۔ بسا اوقات وہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد خیالات کے حامل ہوتے تھے۔ ان مختلف النوع عناصر کو عموماً ملکہ کے فیصلے قبول کرنے پڑتے تھے۔ اراکین کونسل بنیادی طور پر ملکہ کے خادم تھے۔ اس کے علاوہ وہ آپس میں کسی باہمی وفاداری کے تصور سے ناآشنا تھے۔ ملکہ خود چونکہ ٹوری مشرب رکھتی تھی، یہ بات زیادہ پسند کرتی تھی کہ اس کے مشیر اور وزیر ٹوری ہی ہوں۔ وہ اپنے وزیروں کے چننے میں دارالعوام کی پارٹی پوزیشن کو ہرگز خاطر میں لانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اپنے وزیروں کے منتخب کرنے کا اسے بلاشرکتِ غیرے اختیار حاصل ہے اور یہ کہ اس ضمن میں دارالعوام میں دونوں پارٹیوں کے عددی تناسب کو ملحوظ رکھنے پر وہ مجبور نہیں ہے۔ اس عقیدہ پر این تادمِ آخر جمی رہی اور حتی الامکان اس سے انحراف نہیں کیا۔

دارالعوام کا مالیاتی کنٹرول

اس پس منظر میں این کے عہد کو "مکمل" کابینی نظامِ حکومت کا دَور نہیں سمجھ سکتے لیکن یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اس دَور میں پارلیمنٹ اور وزراء میں قریبی تعاون ناگزیر ہو گیا تھا۔ اب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وزراء اپنے آپ کو صرف بادشاہ کی سلکِ ملازمت سے وابستہ سمجھیں اور پارلیمنٹ کو نظر انداز کریں۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ ملکہ کے احکام کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کو بھی خوش رکھیں، بلکہ اس کا

تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ دارالعوام نے ٹیکس اندازی، تصرف و تخصیصِ رقوم اور تنقیحِ حسابات پر جو کنٹرول حاصل کر لیا تھا اس کے نتیجہ میں وزرار اس کے دائرۂ عمل میں خود بخود کھنچے چلے آتے تھے۔ خصوصاً ایک عظیم جنگ کے زمانہ میں (جیسے کہ اس وقت صورتِ حال تھی) یہ قریبی ربط ازبس ضروری تھا۔ وزرار پارلیمنٹ کو اپنی رقمی ضروریات سے آگاہ کرتے اور اس سے ضروری منظوریاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس مسلسل ربط اور تعلق کی وجہ سے رقمی منظوریوں کے بارے میں اس عہد میں ایک نیا ضابطہ وجود میں آیا۔ 17/3ء میں دارالعوام نے یہ ضابطہ مرتب کیا کہ کسی بھی نوع کی رقمی منظوری اسی صورت میں دی جا سکتی ہے جبکہ اس کی تحریک حکومت کے کسی وزیر کی جانب سے کی گئی ہو۔ اس وقت سے آج تک اسی ضابطہ پر عمل ہوتا ہے۔

ایک طرف دارالعوام کا مالیاتی کنٹرول وزرار کو اپنی جانب کھینچتا تھا تو دوسری طرف وزرار اس چیز کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ دارالعوام میں ان کو ہمیشہ اتنی کافی تائید حاصل رہے کہ کسی وقت بھی وہ اپنی کسی پالیسی یا حکمتِ عملی کی اس سے توثیق حاصل کر سکیں۔ اس کے لئے انھوں نے دارالعوام کے ارکین کی ایک کافی تعداد کو "خدمات و مناصب (PATRONAGE)" کے عطیوں کے ذریعہ سے اپنا زر خرید بنا رکھا تھا۔ ان خریدی ہوئی آرار کے بل بوتے پر حکومت وہگوں اور ٹوریوں کی لامتناہی کشمکش سے کسی حد تک بے نیاز ہو کر اس بات کی ضمانت حاصل کر سکتی تھی کہ اس کی پیش کردہ تحریکات کو دارالعوام میں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔

اس دوہرے عمل اور ردِ عمل نے وزارت اور دارالعوام کو اتنا قریب کر دیا کہ عاملہ اور مقننہ کی نظری تفریق رفتہ رفتہ مفقود ہوتی چلی گئی۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو کابینی نظام کے ارتقار کے لئے ازبس ضروری تھی۔

ٹوریوں اور وہگوں کی کشمکش

پارلیمنٹ کے اندر اور باہر دونوں پارٹیوں میں سخت تلخی تھی۔ ان کی رقابتوں اور مناقشوں نے ملک کی سیاسی فضار کو مکدر کر رکھا تھا۔ پارٹی پروپگنڈہ اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ اس پروپگنڈے میں ملک کے نامور ادیب اور انشار پرداز بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ سیاسی اغراض کے لئے اخباروں، روزناموں اور پمفلٹوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال

کیا جارہا تھا۔ اخبار اور پمفلٹ سیاسی پارٹیوں کے موثر ہتھیار بن گئے تھے۔ ان کے ذریعہ سے دونوں پارٹیاں اپنی اپنی موافقت میں رائے عامہ کی تشکیل کی کوشش کرتے تھے۔ اور بعض اوقات خوب دل کھول کر ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالتے۔ یہ زمانہ سیاسی طنز نگاری کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ ایڈیسن اور اسٹیل کا اسپکٹیٹر (SPECTATOR.) ڈانیل ڈیفو کا ریویو (REVIEW.) اور سوفٹ کا اکزامنر (EXAMINER.) اس عہد کی صحافت کے درخشاں نمونے ہیں۔ ٹوریوں اور وہگوں کی اس قلمی جنگ میں سیاسیات اور مذہب دونوں موضوعات پر خوب خوب رزم آرائی رہا کرتی تھی۔ ٹوریوں کو یہ دکھ تھا کہ جیسے جیسے جنگ (جنگ وراثتِ ہسپانیہ) طویل ہوتی جارہی تھی اس کا بار ان پر زیادہ پڑ رہا تھا۔ جنگ کے لئے مالیہ کی فراہمی کا انتظام زیادہ تر محصول اراضی (LAND TAX.) کے ذریعہ سے کیا جاتا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہگوں کے مقابلہ میں ٹوریوں کی دولت اور جائیداد زیادہ تر اراضی کی شکل میں تھی۔ وہگوں کے چند خاندان بے شک بڑی بڑی زمینات کے مالک اور زمیندارانہ حیثیت کے حامل تھے لیکن ان کی اکثریت زمین سے اتنی وابستہ نہیں تھی جتنی کہ ٹوری تھے۔ وہگ دوسرے ذرائع آمدنی رکھتے تھے اور جنگ ان کے لئے ایک حد تک منفعت بخش ثابت ہو رہی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ حکومت کو روپیہ قرض دے کر اس پر سود اور منافع حاصل کر رہے تھے۔ غرض ٹوری، جنگ سے اگر دبے جارہے تھے تو وہگ اسے ذریعۂ منفعت بنائے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ایک مرحلہ پر یہ کوشش کی گئی کہ انکم ٹیکس نافذ کیا جائے لیکن یہ تحریک فی الوقت کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں کہ ٹوری رفتہ رفتہ جنگ کی شدّت سے مخالفت کرنے لگے۔

مذہب کا مسئلہ بھی دونوں پارٹیوں کے درمیان مخالفت کی آگ بھڑکا رہا تھا۔ ٹوری عام طور پر کلیسائے انگلستان کے پیرو (اینگلیکن) تھے۔ وہگ پارٹی زیادہ تر منحرفین (DISSEN'i EKS) پر مشتمل تھی۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کلیرنڈن کوڈ کی امتناعی دفعات ان کے خلاف ابھی تک برابر قائم تھیں۔ وہ کسی خدمت پر فائز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں وہگوں کا اثر و نفوذ بلدیات اور میونسپلٹیوں پر ختم ہو چکا تھا۔ ان اداروں کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ یہ پارلیمنٹ کا باب الداخلہ تھے۔ جو پارٹی ان پر قابض ہو وہ دارالعوام کو بھی اپنے قبضہ میں رکھ سکتی تھی۔ وہگوں نے کلیرنڈن کوڈ کی ان دفعات سے بچنے کا

ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ موقتی طور پر کلیسائے انگلستان کے طریقہ کے مطابق عشائے ربانی (SACRAMENT.) قبول کر کے عہدوں پر فائز ہونے کی قانوناً اہلیت پیدا کر لیتے۔ اس منزل سے ایک مرتبہ گزر جانے کے بعد پھر وہ اپنے طریق مذہب پر لوٹ آتے۔ اور کھلے طور پر اپنے منحرف (DISSENTER.) ہونے کا اظہار کرتے۔ اس سے بلدیات پر ٹوری کنٹرول میں واضح کمی پیدا ہو رہی تھی۔ اور یہ اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ رفتہ رفتہ اس آنکھ مچولی کے ذریعہ سے ڈسنٹرس دارالعوام کو منتخب کرنے والی بلدیات پر دوبارہ قبضہ جما لیں گے۔ اس صورتِ حال سے ٹوریوں میں بہت بے چینی تھی۔ اس لئے متعدد مرتبہ اس کے خلاف قانون سازی کی کوشش کی گئی مگر دارالامراء نے اس کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔

کیبنٹ سازی

این کے عہد کی وزارت سازی کا مطالعہ ٹوریوں اور وہگوں کی اس کش مکش کے پس منظر میں کرنا چاہئے۔ وزارت کی تشکیل سے متعلق این کا یہ اٹل ایقان تھا کہ وہ اپنے وزیروں کے چننے میں ہر طرح آزاد اور ہر قسم کی پابندیوں سے بالاتر ہے۔ پارلیمنٹ میں وہ کسی پارٹی کی اکثریت یا اقلیت کو خاطر میں لانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس قسم کا کوئی تصور ہی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تخت نشینی کے وقت دارالعوام میں وہگوں کی اکثریت تھی اور کابینہ مخلوط قسم کی پارٹی پوزیشن کا لحاظ کئے بغیر وہ رفتہ رفتہ وزارت کو ٹوریوں سے بھرنے لگی، اور زمام حکومت عملاً اس نے اپنے دو مشیروں اور دوستوں مارلبرا (MARLBOROUGH) اور گڈالفن (. GODOLPHIN) کے حوالے کر دی۔ یہ دونوں ٹوری تھے۔ خصوصاً ملکہ کا سینہ میں مارلبرا کا بہت اثر تھا۔ اس کی بیوی سارہ، این کی بچپن کی دوست اور سہیلی تھی۔ نئی حکومت ٹوری ہونے کے باوجود فرانس کے خلاف جنگ کی مؤید اور حامی تھی۔ وزارت کی تشکیل کے بعد جو انتخابات عمل میں آئے اس میں ٹوریوں کو اکثریت حاصل ہوئی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ٹوری وزارت' ایک ٹوری دارالعوام کے بل بوتے پر نہیں بلکہ وہگ اکثریت کے علی الرغم قائم کی گئی تھی۔ مارلبرا اور گڈالفن کا بنیادی مطمح نظر یہ تھا کہ جنگ بہر قیمت جاری رہے۔ ان کو ٹوریوں اور وہگوں کے درونِ خانہ جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ ٹوری وزارت جو 1702ء میں تشکیل پائی تھی وہ کم از کم اپنی ظاہری شکل میں 1710ء تک برقرار رہی مگر اس عرصہ میں اس میں

اندرونی تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ اصل مسئلہ جنگ اور اس کی تائید کا تھا ۔ مارلبرا ' اور گڈالفن نے محسوس کیا کہ بعض انتہاپسند ٹوری ان کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے ہیں اس لئے ان کو وزارت سے علٰحدہ کر دیا گیا ۔ ان کی بجائے معتدل ٹوریوں کو وزارت میں شریک کیا گیا۔ 1705ء کے انتخابات میں وہگوں کو کافی کامیابی حاصل ہوئی ، گو وہ اکثریت حاصل نہ کر سکے ۔ وہگ جنگ کے معاملہ میں پرجوش تعاون کرنے کے لئے تیار تھے ۔ چنانچہ مارلبرا نے ان کا سہارا لینا شروع کیا ۔ اور یہ محسوس کیا گیا کہ وزارت میں معتدل ٹوری بھی کچھ زیادہ بھروسہ کے قابل نہیں ہیں ۔ ان کی مزاحمت کے آثار دیکھ کر ان کے لیڈر ہارلے کو وزارت سے علٰحدہ کر دیا گیا ۔ اور وزارت عملاً وہگوں پر مشتمل ہوگئی ۔ 1708ء کے انتخابات میں ٹوریوں کو شکست ہوئی اور دارالعوام میں وہگوں کو اکثریت حاصل ہوگئی ۔ لیکن اس سے پہلے ہی وزارت پر وہگ چھا گئے تھے ۔ اگرچہ وزارت کی قیادت مارلبرا اور گڈالفن کے ہاتھ میں تھی جو ٹوری پارٹی سے تعلق رکھتے تھے مگر عملاً ان دو کے سوا وزارت مکمل طور پر وہگوں پر مشتمل تھی ۔ وزارت کی یہ تبدیلی بھی ایسے وقت عمل میں آئی تھی جبکہ وہگوں کو دارالعوام میں اکثریت حاصل نہیں تھی ۔ اس نکتہ کو خاص طور پر ذہن نشین رکھنا چاہئے کیونکہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابھی تک یہ تصور پیدا نہیں ہوا تھا کہ وزارت کی تشکیل پارٹی کی اکثریت پر مبنی ہونی چاہئے ۔

ڈاکٹر سیکویرل کا مقدمہ اور وہگوں کی برطرفی

اس وزارت کی برطرفی بعض غیر معمولی حالات میں عمل میں آئی ۔ 1710ء میں ایک ٹوری پادری ڈاکٹر سیکویرل نے اپنے ایک خطبہ میں انتہاپسند ٹوریوں کے سیاسی عقاید کی ترجمانی کی ۔ اس نے 1688ء کے انقلاب اور 1701ء کے قانونِ وراثت پر سخت حملے کئے اور ان کو ناجائز قرار دیا ۔ بادشاہ کی بے چوں وچرا اطاعت " عدم مقاومت " (NON RESISTENCE) اولادِ اکبر کا حق وراثت اور آسمانی حقوق کے قدیم نظریات کی پرجوش تائید کی ۔ دوسرے الفاظ میں اس نے موجودہ دستوری اور قانونی نظام کے خلاف کھلی بغاوت کی تھی ۔ اس لئے ایک ایسی وزارت جو عملاً وہگوں پر مشتمل تھی ان باغیانہ خیالات کے پرچار کو نظرانداز نہیں کر سکتی تھی ۔ لہٰذا حکومت نے ڈاکٹر سیکویرل کا مواخذہ کیا ۔ مواخذہ کا شروع ہونا تھا کہ ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ۔ ٹوریوں اور اینگلیکنوں نے اس کو کلیسائے انگلستان پر حملے کا

رنگ دے دیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں یہ وزارت بہت غیر مقبول ہوگئی۔ اینؔ نے وزارت کے خلاف اس عوامی جوش و خروش سے فائدہ اٹھاکر اسے برطرف کردیا۔ یہ برطرفی ایسے حالات میں عمل میں آئی جبکہ وزارت کو دارالعوام میں اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ مارلبرا کا شخصی اثر بھی اس وقت کام نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملکہ اُس سے اور اُس کی بیوی سارا سے کچھ متنفر ہوگئی تھی۔ اب این پر سارہ کی بجائے ایک دوسری نوجوان خاتون مسز ماشام کا بہت اثر تھا۔ اور مسز ماشام محل سرا میں ٹوریوں کی آوردہ تھی۔ ہارلے (HARLEY) نے اسی سے ٹوری مقاصد کے لئے خوب کام لیا۔

وہگوں کی برطرفی کے ساتھ ہی ہارلے کی سرکردگی میں ٹوری وزارت برسراقتدار آئی۔ نئی وزارت کے قیام کے بعد انتخابات ہوئے جن میں ٹوریوں کو اکثریت حاصل ہوگئی۔ اینؔ کا آخری زمانہ عملاً ٹوری اقتدار کا زمانہ ہے۔ 1713ء میں جب پھر انتخاب ہوا تو ٹوریوں کو دوبارہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس اقتدار سے فائدہ اٹھاکر انھوں نے جنگ سے نجات حاصل کرنی چاہی۔ صلح نامہ کا بل دارالعوام میں تو پاس ہوگیا لیکن اس کی توثیق دارالامراء میں ہوتی نظر نہیں آتی تھی کیونکہ یہاں وہگوں کی اکثریت تھی اور وہگ جنگ بندی کے مخالف تھے۔ اس دشواری پر عبور حاصل کرنے کے لئے ملکہ نے کیبنٹ کے مشورہ پر بارہ نئے امراء بنادیئے۔ اس طرح وہگوں کی مخالفت کا خاتمہ کرکے 1713ء میں فرانس سے صلح کرلی گئی۔

ٹوریوں نے اسی زمانے میں وہگوں کے سیاسی اثر ورسوخ کو تباہ کرنے کے لئے "قانون متابعتِ موقتی" (OCCASIONAL CONFIRMITY ACT) کی منظوری حاصل کرلی جس کے لئے وہ عرصہ سے کوشاں تھے۔ اب "منحرفین" قانون کو دھوکہ نہیں دے سکتے تھے۔ عہدوں کو حاصل کرنے کے لئے مذہبی شرائط کی موقتی تعمیل وتکمیل کافی نہیں تھی۔ اس موقتی اتباع کو ناجائز قرار دیا گیا۔ نیز قانونِ افتراقِ دینی (SCHISM ACT) کے ذریعہ سے ڈسنٹرس کی قائم کی ہوئی اکیڈمیوں کو بند کردیا گیا۔ حالانکہ ان درسگاہوں نے علوم وفنون کی اشاعت کی بڑی خدمت انجام دی تھی۔ اس سے رواداری کی اسپرٹ کو بڑی ٹھیس لگی۔ پچھلے دور کی روشن خیالی کے مقابلہ میں ان قوانین کو ایک رجعت پسندانہ اقدام سمجھنا چاہئے۔

کیبنٹ کی کمزوریاں

اوپر کیبنٹ سازی کی جو تفصیل دی گئی ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اینؔ کے عہد میں

کابینی نظامِ حکومت کے خدوخال اچھی طرح اُبھر نہ سکے تھے۔ اس نظام کی خصوصیات اور لوازم سے اس عہد کے لوگ ناواقف تھے اور ان پر عمل کرنا نہیں جانتے تھے۔ یہ بات کسی کے سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ حکومت کی پر سہولت اور اطمینان بخش کارکردگی کے لئے وزارت اور دارالعوام کی اکثریت کے درمیان ایک مسلسل ربط اور یکجہتی کی ضرورت ہے اور دونوں کا ایک ہی پارٹی سے ہونا ازبس ضروری ہے۔ این کے عہد میں جتنی کابینی تبدیلیاں ہوئیں ان میں ان امور کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ وزارت کا بننا یا بگڑنا بالکل اقتدارِ شاہی پر مبنی تھا۔ ملکہ اپنے اختیار سے اپنے وزیروں کو چنتی اور ان کو برطرف کرتی رہی۔ چنانچہ ہر وزارتی تبدیلی دارالعوام کی موجودہ اکثریت کے برخلاف کی گئی۔ ابھی "وزیرِ اعظم" کا تصور تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ تمام وزراء ایک ہی حیثیت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی برتری اور دوسروں پر اس کے تفوق کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سب ہی راست ملکہ کے ماتحت اور اس کے خادم تھے۔ ان کی برطرفی اور بحالی محض اس کی خوشنودی پر منحصر تھی۔ "مشترکہ ذمہ داری" اور "یکجہتی" (SOLIDARITY) کے تصوّرات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ ان اعتبارات سے کیبنٹ کو ابھی بہت کچھ ترقی کرنا تھی۔ اور شاید مستقبل ہی یہ بتا سکتا تھا کہ حُسنِ اتفاق سے ترقی کی یہ نئی راہ جو نکل آئی ہے اس کی منزلِ مقصود کیا ہوگی۔ جہاں یہ صحیح ہے کہ کیبنٹ کو ابھی بہت کچھ ترقی کرنا باقی تھا وہیں یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اب اس کا وجود معرضِ خطر میں نہیں تھا۔ سابق کی طرح اب کوئی اسے مٹانے کے دُرپے نہیں تھا۔ اب اسے "سازشی" "ناجائز" اور "غیر قانونی" ادارہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اعلیٰ ترین ادارۂ حکومت کی حیثیت سے ہمعصر رائے عامہ نے اسے قبول کرلیا تھا۔ اس عہد میں کیبنٹ کی یہی بڑی کامیابی تھی کہ اس نے زندہ اور سرگرم کار رہنے کا حق حاصل کرلیا تھا۔

این کا آخری زمانہ ٹوریوں کے غلبہ کا تھا۔ اپنے اس اثر کو حتی الامکان دوامی رنگ دینے کے لئے انھوں نے دارالعوام کی رکنیت کو صرف زمیندار خاندانوں کا اجارہ بنادینا چاہا۔ عموماً یہ خاندان ٹوری ہی تھے۔ چنانچہ بذریعۂ قانون یہ شرط عاید کی گئی کہ صرف ایسے اشخاص ہی دارالعوام کے رُکن بن سکتے ہیں جو ضلع (SHIRE) میں کم از کم چھ سو پونڈ سالانہ یا بلدی شہر (BOROUGH) میں تین سو پونڈ سالانہ مالیت کی اراضی رکھتے ہوں۔ ان دو قوانین کے ذریعہ سے ٹوریوں نے موقتی طور پر دارالعوام پر خاصہ تسلط حاصل کرلیا۔

ٹوری سازش

این جب بسترِ مرگ پر تھی، انتہا پسند ٹوریوں نے معزول اسٹورٹ خاندان کی بحالی کے لئے ایک آخری کوشش کی۔ اس وقت عنانِ حکومت سینٹ جان ارل آف بالنگ بروک (BOLING BROKE.) کے ہاتھ میں تھی۔ ہارلے ارل آف آکسفورڈ برطرف کر دیا گیا تھا سینٹ جان کی سرکردگی میں ٹوریوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اس سازش میں ملوث تھا۔ کہتے ہیں کہ این بھی اپنے آخری لمحات میں اس مقصد سے ہمدردی رکھتی تھی۔ لیکن بالنگ بروک ابھی سب انتظامات مکمل نہ کر سکا تھا کہ این کی طبیعت بگڑ گئی۔ کابینہ ابھی طفلِ نوزائیدہ تھی۔ یہ کام اس سے سنبھل نہ سکا۔ کسی طرح وہگوں کو یہ سن گن لگ گئی تھی کہ درپردہ ٹوری کابینہ کسی خطرناک سازش میں منہمک ہے۔ ایسے میں بعض وہگ پریوی کونسلرز کابینہ کے اجلاس میں گھس آئے کابینہ کا اجلاس معاً پریوی کونسل کی نشست میں تبدیل ہو گیا۔ اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ قانوناً پریوی کونسل ہی تمام حکومتی کاروبار کے انجام دہی کی مجاز تھی۔ وہگوں کی اس بروقت مداخلت نے بالنگ بروک کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اس کو دبنا پڑا۔ پریوی کونسل نے این کے انتقال کے ساتھ ہی ہنوویرین خاندان کی جانشینی کا اعلان کر دیا۔ ٹوریوں کو یہ سازش بہت مہنگی پڑی۔ اس کے نتیجہ میں تقریباً نصف صدی تک ان کو سیاسی اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔

قانونِ اتحاد ۱۷۰۷ء (ACT OF UNION 1707)

آخر میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ این کے عہد میں 1707ء سے پارلیمنٹ کی رکنیت میں اسکاٹ لینڈ کے اتحاد کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ اسکاٹ لینڈ کے اتحاد نے پارلیمنٹ کی حیثیت میں ایک اہم تبدیلی پیدا کر دی۔ اب وہ انگلستان کی پارلیمنٹ نہیں بلکہ برطانیہ عظمیٰ (GREAT BRITAIN) کی پارلیمنٹ کہلانے لگی۔ اب تک اسکاٹ لینڈ ایک علٰحدہ مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔ صرف تاج کی حد تک دونوں مملکتیں باہم متحد تھیں لیکن 1707ء کے قانون کی رو سے بعض تحفظات کے ساتھ اسکاٹ لینڈ کی علٰحدہ وحدت کا خاتمہ عمل میں آیا۔ اسکاٹ لینڈ کی قدیم پارلیمنٹ ہمیشہ کے لئے برخواست ہو گئی۔ یہ طے کیا گیا کہ برطانیہ عظمیٰ کی نئی پارلیمنٹ میں اسکاٹ لینڈ دارالعوام کیلئے 45 ارکین شہروں اور اضلاع سے منتخب کر کے روانہ کریگا۔ اور امراء کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنے طبقہ سے 16 نمائندوں کو دارالامراء کیلئے منتخب کریں۔ یہ انتظام بہت کامیاب ثابت ہوا۔ دونوں مملکتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک شاندار اور تابناک مستقبل کی طرف آگے بڑھنے لگیں۔

گیارھواں باب

ہنوویرین خاندان

کابینہ کا ارتقاء

جارج اول ــــــ جارج دوم
1714ء تا 1760ء

اٹھارویں صدی کے مسائل

اٹھارویں صدی دستوری ترقی کے نقطۂ نظر سے پچھلی دو صدیوں سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ اس صدی کے دستوری مسائل بالکل جداگانہ نوعیت کے تھے۔ دستور کے تحفظ اور ترقی کے لئے سترھویں صدی میں جو پیکار آزمائی اور خونین کشمکش جاری رہی۔ اٹھارویں صدی میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ حق تو یہ ہے کہ انگلستان کو گزشتہ صدی میں بڑی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ نظمِ حکومت کی کوئی کل سیدھی بیٹھتی نظر نہ آتی تھی۔ شخصی راج کی بجائے قانون کی حکمرانی کے لئے اہلِ انگلستان نے کیا کیا نہ کیا۔ جبر و تشدد کے آثار مٹانے کے لئے خانہ جنگی سے گزر کر بادشاہ کو قتل کر ڈالا۔ ادارۂ شاہی کو نیست و نابود کر کے جمہوریہ قائم کیا۔ کہنے کو تو یہ جمہوریہ عوامی اقتدار کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا مگر بعد میں عملاً ایک فوجی آمریت میں تبدیل ہوگیا۔ اس کو کچھ زمانہ نہیں گزرا کہ دوبارہ ادارۂ شاہی کا احیاء عمل میں آیا۔ اور پالیمانی اقتدار کی نیو ڈالی گئی۔ بادشاہت بحال ہوئی لیکن پھر چند دنوں میں بادشاہ کو نکال باہر کیا گیا۔ پہلے ایک ولندیزی کو، بعد میں ایک جرمن کو تاج و تخت پیش کیا گیا اور موروثی اصول سے انحراف کر کے تاج کو پارلیمنٹ کا عطیہ بنا دیا۔ یہ سب گزشتہ ستر پچھتر برس کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ ان عظیم تبدیلیوں اور انقلابات کے باوجود 1714ء تک ملک ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔

خدا خدا کرکے دستور کے ایسے خدوخال اُبھرنے لگے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہوسکتے تھے۔ اقتدار کے لئے پچھلی صدی میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان جو جنگ جاری تھی اب وہ خود بخود ختم ہوتی نظر آنے لگی۔ کیونکہ اس تمام کشمکش میں قوم نے دستوری کل کو ایسا باہم مربوط اور متحد کردیا کہ اس کے اجزا میں ٹکراؤ اور تصادم کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

بادشاہ اب بھی قانوناً تمام اختیارات واقتدارات کا منبع اور سرچشمہ تھا۔ اور حکومت کی پوری کل بظاہر اسی کے حکم پر چلتی تھی مگر اس حکم کو عملاً پارلیمنٹ نافذ کرتی تھی۔ یا زیادہ صحیح طور پر پارلیمنٹ کا ایک چھوٹا سا گروپ جسے کیبنٹ کہتے تھے اس حکم کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔ اور بادشاہ اپنی شخصی حیثیت میں اب یہ کام انجام نہیں دیتا تھا۔ گزشتہ صدی کی کشمکش کا اسی کو ماحصل اور دستوری ترقی کا لُبِ لباب سمجھنا چاہیے۔

جارج اول کی تخت نشینی

۱۷۱۴ء میں این کے انتقال کے ساتھ ہی جارج اول کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا۔ جارج، جرمنی کی ایک چھوٹی سی ریاست ہنور کا حکمران اور صوفیا الکٹریس آف ہنور کا بیٹا تھا۔ صوفیا کا اس وقت انتقال ہوچکا تھا۔ اس لئے جارج "قانونِ وراثت" کے تحت بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ جارج اول کی تخت نشینی بظاہر تاج کی ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقلی کا ایک معمولی سا واقعہ نظر آتی ہے مگر اس وقت بہت کم لوگ یہ اندازہ کرسکتے تھے کہ انگلستان کے دستور پر اس کے کتنے گہرے اور دُوررس اثرات مترتب ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ معمولی تبدیلی دستور میں آئندہ عظیم الشان تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جارج جرمن نژاد تھا اور انگلستان کے لئے محض ایک اجنبی۔ جس وقت وہ انگلستان آیا اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے عہد کے جرمن ماحول کی پیداوار تھا۔ اس کی سیاسی فکر ونظر قدرتی طور پر اسی ماحول کا نتیجہ تھی۔ وہ اب ایسی عمر کو پہنچ چکا تھا کہ اس کے لئے کسی نئے ماحول سے مطابقت یا ہم آہنگی پیدا کرنا بہت دشوار امر تھا۔ وہ اپنی زندگی کے رنگ ڈھنگ کو نہ بدل سکتا تھا اور نہ بدلنے کی اس میں کوئی خواہش تھی۔ وہ انگلستان کا تخت اپنی ذاتی اور خاندانی شان وشکوہ میں اضافہ کے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جرمن ریاست کا حکمران تھا۔ انگلستان کا تاج اس کے ہمعصروں میں اسے ایک ممتاز حیثیت عطا کرسکتا

تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کے وسائل اور فوجی طاقت کی مدد سے جرمنی کی سیاسیات میں زیادہ موثر حصہ لے سکے۔ اس کی زندگی کا محبوب مطمحِ نظر جرمنی کی سیاسیات میں ہنوور کو اُجاگر کرنا، اور جرمنی کے چھوٹے چھوٹے تاجداروں کی کشمکش میں اپنے لئے اور اپنی ریاست کے لئے ایک فخر و مباہات کا مقام حاصل کرنا تھا۔ یہ دلچسپیاں اس کے مرتے دم تک باقی رہیں۔ اس لئے انگلستان کی سیاسیات سے اسے کچھ لگاؤ پیدا ہوا اور نہ اس کو سمجھنے کی اس نے کوشش کی۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ قدرت نے اچانک جو اسے ایک غیر متوقع ورثہ عطا کر دیا ہے وہ اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے بحال رہے۔ جارج کے لئے ایک اور مشکل یہ تھی کہ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتا تھا اور نہ کبھی اس کے سیکھنے کی اس نے کوشش کی۔ انگلستان کے حالات کے سمجھنے یا یہاں کے نظم و نسق میں حصہ لینے کے راستے میں یہ بات ہمیشہ مزاحم رہی۔ ایک تو یوں بھی اس ملک سے اسے دلچسپی کم تھی، دوسرے زبان کی مجبوری نے اسے اپنی رعایا سے دور اور نامانوس ہی رکھا۔ انگلستان سے اجنبیت اور ذہنی بُعد کے اعتبار سے جارج اول کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ بڑی حد تک جارج دوم پر بھی صادق آتی ہیں۔ اسے بھی ہنوور اور اس کے مسائل سے گہرا قلبی لگاؤ تھا۔ گو وہ اپنے باپ کی طرح انگلستان کے لئے بالکل اجنبی نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ جرمن زیادہ اور انگریز کم تھا۔ اس کی پیدائش بھی جرمنی میں ہوئی تھی اور اس کا لڑکپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ وہیں گزرا تھا۔ لیکن انگلستان آنے کے بعد ولیعہد کی حیثیت سے اس نے انگلستان اور اس کی سیاست کو سمجھنے کی کافی کوشش کی لیکن آدمی قدرتی طور پر معمولی صلاحیت کا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دور میں حکمرانِ وقت اور حکومتِ وقت میں کافی فصل اور بُعد رہا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی طرح کاروبارِ سلطنت کو زیادہ تر اپنے وزراء پر ہی چھوڑ رکھا۔ اس لحاظ سے جارج اول اور جارج دوم دونوں کے عہدہائے حکومت مماثل خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں۔

جارج اول اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ تاج و تخت کے لئے وہ صرف وہگوں کا مرہونِ منت ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ٹوریوں نے این کی زندگی کے آخری لمحات میں اسے اس عظیم ورثہ سے محروم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس پس منظر میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جارج اول نے اپنا اعتماد وہگوں کے سپرد کر رکھا اور عملاً مہماتِ ملکی

کی انجام دہی کا کام ان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد جارج دوم کے زمانہ (1727ء تا 1760ء) میں بھی وہگوں کا سیاسی اقتدار بدستور برقرار رہا۔

وہگوں کا اقتدار

انگلستان کے سیاسی حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا تھا کہ سنہ 1714ء سے سنہ 1760ء تک وہگوں کو مسلسل اور غیر منقطع اقتدار حاصل رہا۔ اس دور میں اس پارٹی نے دانستہ اس بات کی کوشش کی کہ ہنوورین خاندان کی جانشینی ایک مضبوط اور مستحکم حقیقت بن جائے۔ اور اسے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ وہگ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ یہ نو وارد خاندان عام طور پر شبہ اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور کٹر ٹوری تو ان کو غاصب سمجھتے ہیں۔ وہگ فی الحقیقت اس خاندان کی پشت پناہی کے ذریعہ سے "انقلاب" (سنہ 1688ء) کی بنیادوں کے تحفظ و استحکام کے لئے کوشاں تھے۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ صرف ہنوورین خاندان کے سلسلہ کی برقراری ہی اس نظامِ حکومت کی ضامن ہو سکتی تھی جو انقلاب کے بعد وجود میں آیا تھا۔ وہگوں کی اس خصوص میں پچاس سالہ جدوجہد دستور کو پروان چڑھانے میں بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر سے وہگ پارٹی کو نئے دستور کا معمار سمجھنا چاہئے۔

وہگوں کو اس وقت سیاسی میدان کھلا اور صاف ملا۔ کوئی رکاوٹ تھی اور نہ مزاحمت۔ ان کا کوئی حریف اور مدِ مقابل نہیں تھا۔ ٹوری میدان سے یکسر غائب تھے۔ یہ اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہے تھے جو انھوں نے این کے انتقال کے وقت کی تھی۔ ان کے لیڈر اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے انگلستان سے فرار ہو چکے تھے۔ بالنگ بروک نے بھاگ کر جیمز دوم کے بیٹے کے دربار سے وابستگی پیدا کر لی تھی، آرمنڈ بھی فرار ہو چکا تھا۔ اس سازش کی ناکامی نے ان لیڈروں کو کہیں کا نہ رکھا بلکہ نئے [illegible] تو وہ غدار سمجھے جانے لگے۔ ٹوری قیادت کو یہ ایسا داغ لگا تھا کہ وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹوری پارٹی کے اجزاء اور عناصر بکھر کر رہ گئے۔ موزوں اور دانشمند قیادت کی عدم موجودگی میں پارٹی تتر بتر ہو گئی۔ اور ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ اس کو اپنے زخموں کے مندمل کرنے اور پھر سے سرگرمِ عمل ہونے کے لئے کم و بیش پچاس سال لگ گئے۔

ان تمام موافق حالات کے باوجود یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہگ یا ان کے اُصول ملک میں اتنے مقبول تھے کہ وہ محض آزاد رائے عامہ کے بل بوتے پر حکومت کی مشینری کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے تھے۔ اگر اس وقت انتخابات یکسر آزادانہ ماحول میں عمل میں آتے تو اس بات میں قوی شبہ ہے کہ وہگ، پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت برقرار رکھ سکتے۔ انگلستان کا قلب اب بھی ٹوری تھا۔ اضلاع اور دیہات میں رہنے والے لوگ، بڑے اور چھوٹے زمیندار، ایسے طبقات جو زمین سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھے، انگلستان کی اینگلیکن کلیسا کا پادری اور اس کے پیرو، غرض یہ سب کے سب بعض مستثنیات کو چھوڑ کر اپنے سینوں میں ٹوری دل رکھتے تھے اور شاید جلاوطن اسٹورٹ خاندان سے درپردہ وفاداری کے مجرمانہ جذبے سے بھی ان کا دل خالی نہیں تھا۔ یہ جذبہ دل کی گہرائیوں میں اتنا چھپا ہوا تھا کہ شاید اس کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے ان کا شعور تیار نہ ہوتا۔ مگر یہ ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پارلیمانی بدعنوانیاں

وہگوں نے اپنے اقتدار کی برقراری کے لئے اس عہد کی انتخابی بدعنوانیوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو خرید کر رکھنے کے طریقے سے خوب خوب فائدہ اُٹھایا۔ اٹھارویں صدی میں دارالعوام کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی تھی اس سے وہگ بخوبی واقف تھے، اور یہ خوب جانتے تھے کہ حکومت کی گدّیوں پر جمے رہنے کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ پارلیمانی مشین پر ان کا بلا شرکتِ غیرے قبضہ رہے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے وہ سب ذرائع اختیار کئے جن سے دارالعوام کی زیادہ سے زیادہ آرا کو وہ کنٹرول کر سکتے تھے۔ دارالعوام کے اراکین کی تعداد اس وقت 558 تھی۔ ان میں سے کوئی 432 بلدی شہروں (BOROUGH.) سے منتخب ہو کر آتے تھے۔ اور صرف 122 اضلاع سے۔ حالانکہ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے باروز کو اضلاع سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ اضلاع، دونوں اعتبارات سے وسیع تر حلقہ ہائے انتخاب تھے۔ باقی 4 یونیورسٹیوں کے نمائندے تھے۔ اضلاع میں اگرچہ رائے دہی کی اہلیت معین تھی لیکن اس کے باوجود رائے دہندوں کی تعداد کسی ضلع میں بہت کم اور کسی میں زیادہ تھی۔ بایں ہمہ مجموعی حیثیت سے اضلاع میں رائے دہندوں

کی اتنی کافی تعداد ہوا کرتی تھی کہ حکومت آسانی سے وہاں اپنے آدمی کو منتخب نہ کرا سکتی ۔ اضلاع میں رائے دہندوں کا اوسط 4 ہزار سے کم نہ تھا ۔ ان سب پر یا ان میں سے بیشتر پر قابو پانا عملاً ناممکن تھا اور یوں بھی اضلاع میں آزاد منش، غیور اور سرپھرے جاگیردار، اور زمیندار کافی تعداد میں تھے ۔ اور ان کو تحریص وتخویف کے ذریعہ سے اپنا ہمنوا بنانا بہت مشکل تھا ۔ لیکن بلدی شہر (BOROUGHS) اس مقصد کے لئے کھلی چراگاہیں تھیں ۔ انتخابی قوانین میں یہاں اتنا تنوع پایا جاتا تھا کہ جگہ جگہ اور شہر شہر رائے دہندوں کی تعداد مختلف تھی ۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ پچھلے زمانہ میں بلدی شہروں کو مختلف صدیوں میں مختلف شرائط کے ساتھ حقِ رائے دہی دیا گیا تھا ۔ کم وبیش 30 بلدی شہر تو ایسے تھے جو بالکلیہ حکومت کے قبضہ میں تھے ۔ ان کو ٹریژری باروز (TREASURY BOROUGHS) کہا جاتا تھا ۔ بعض بلدی شہروں میں حقِ رائے دہی ایک محدود کارپوریشن کو حاصل تھا کہ اس سے باہر کوئی شخص ووٹ کا اہل نہیں تھا ۔ بعض مقامات پر زمینات اور جائیدادوں کے ساتھ ووٹ وابستہ تھا ۔ اور اراضی اور جائیداد کی فروختگی کی صورت میں حقِ رائے دہی بھی نئے خریدار کو منتقل ہو جاتا ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ متعدد بلدی شہر (BOROUGHS) اس خرید وفروخت میں متمول خاندانوں کی شخصی جائیداد اور اثاثہ بن گئے تھے جہاں سے یہ لوگ اپنے نامزد کردہ اراکین کو منتخب کرا سکتے تھے ۔ اس صورتِ حال نے پارلیمنٹ کی رکنیت کو عملاً بڑے جاگیردار اور زمیندار خاندانوں کی ملکیت میں تبدیل کر دیا تھا ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ 51 اُمراء (PEERS) اور 55 اراکین دارالعوام آپس میں ایوان کے 190 اراکین کو منتخب کرا سکتے تھے ۔ لہٰذا ایک موافق دارالعوام کے حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں کو خرید لینا کافی تھا جو اس قدر کثیر تعداد میں اراکین کو نامزد کر سکتے تھے

نوازشاتِ شاہانہ (CROWN PATRONAGE)

اس غرض کے لئے تاج کے ان لامحدود وسائل سے کام لیا جانے لگا جن کو عام طور پر نوازشات (PATRONAGE) یا نوازشاتِ شاہانہ (CROWN PATRONAGE) کا نام دیا جاتا ہے ۔ ہمیشہ سے بادشاہ کو اس بات کا اختیار تھا کہ وہ جس کو چاہے مناصب، عہدوں، اعزاز واکرام اور وظائف سے سرفراز کرے ۔ چنانچہ اب پارلیمنٹ کو قابو میں رکھنے

کے لئے ان نوازشات کو وسیع طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ جو لوگ متذکرہ صدر طریقہ سے دارالعوام کی آرا کو کنٹرول کر سکتے تھے انھیں عہدے اور مناصب دیئے جاتے بلکہ درجۂ امارت (PEERAGE) بھی عطا کیا جاتا۔ یہ عہدے اور مناصب کافی منفعت بخش ہوا کرتے تھے۔ ان سے شخصی اثر و رسوخ میں بھی بے حد اضافہ ہوتا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ کسی نوع کی خدمات یا فرائض وابستہ نہیں تھے۔ ایسے اشخاص اپنے ماتحتین کا تقرر بھی کر سکتے تھے۔ اور مختلف طریقوں سے ان کو فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ ان سیاسی مہاجنوں (POLITICAL [illegible] NATES.) کا کام یہ تھا کہ وہ حکومت کے لئے پارلیمنٹ میں ہر وقت تائید مہیا رکھیں۔ یہ طریقہ پارلیمنٹ کو قابو میں رکھنے کی حد تک نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ اس لئے اٹھارویں صدی میں اس سے وسیع طور پر کام لیا جاتا رہا۔ یہ بلاشبہ نہایت بدترین قسم کی بدعنوانی تھی مگر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کیبنٹ کے ارتقاء میں اس سے بڑی مدد ملی۔ یہ حربہ اس وقت وہگوں کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو شاید وہ نصف صدی تک اپنا اقتدار برقرار نہ رکھ سکتے۔ اور کیبنٹ کی نشوونما مشکل ہو جاتی۔ اس رشوت ستانی اور بدعنوانی کی فضا میں کیبنٹ کا پودا خوب پھلتا پھولتا رہا۔ کیبنٹ کی برقراری کا انحصار اب زیادہ سے زیادہ دارالعوام کے تعاون پر تھا۔ "نوازشاتِ شاہانہ" نے اس تعاون کو حاصل کرنے کا زرالا راستہ مہیا کر دیا۔ وہگوں نے خصوصاً والپول کی سرکردگی میں اس مذموم لیکن فی الوقت مفید طریقۂ کار کو ایک آرٹ میں تبدیل کر دیا تھا۔

بادشاہ اور کیبنٹ

جارج اول نے ابتدا سے ہی انتظامِ مملکت کا کام اپنے منتخب کردہ وزیروں کے سپرد کر دیا تھا۔ قدرتی طور پر اس نے وہگوں کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ سلطنت کے روزمرہ کے کاروبار سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مجلسِ وزراء میں بھی شرکت نہیں کرتا تھا۔ 1717ء سے تو بادشاہ نے کیبنٹ کونسل کی صدارت بالکل ترک کر دی۔ یہ ابتدا میں تو بہت معمولی سی بات معلوم ہوتی تھی کیونکہ بادشاہ کا یہ عمل کسی خارجی اثر یا دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محض اس کی مرضیِ شاہانہ کا نتیجہ تھا۔ اسی لئے اس وقت کوئی شخص یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ کیبنٹ کے طریقۂ کار میں بادشاہ کی عدم موجودگی سے جو تبدیلی ہوئی ہے وہ کن عظیم اور دور رس نتائج

کا باعث ہوگی۔ یہ عمل درآمد جارج اول کے بعد جارج دوم کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔ جارج دوم اتنی صلاحیت نہیں رکھتا تھا کہ اس طریقۂ کار میں جواب ایک دستوری روایت بنتا جا رہا تھا تبدیلی پیدا کرکے کیبنٹ کے جلسوں میں شرکت پر اصرار کرے۔ نیز یہ کہ جارج دوم ہمیشہ ایسے اقدام سے گریز کرتا رہا جو کسی معنیٰ یا مفہوم میں دستوری روایات کی خلاف ورزی سمجھا جاسکے۔ بادشاہ کی اس احتیاط نے کیبنٹ کو بڑی حد تک آزاد کردیا۔ وہ اپنی حکمتِ عملی کے متعین کرنے میں ہر وقت بادشاہ کی نظریں دیکھنے پر مجبور نہیں تھی۔ حکمتِ عملی کو متعین کرنے کے بعد ان فیصلوں کو وہ بادشاہ کے گوش گزار کرسکتی اور اس سے منظوری حاصل کرسکتی تھی۔ عموماً بادشاہ کو اس سے اختلاف نہ ہوتا۔ کیونکہ جارج دوم کو بھی انگلستان کی اندرونی اور بیرونی سیاسیات سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ جب تک اس کی سیول لسٹ کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا وہ کسی معاملہ میں دخیل ہونے کے لئے تیار نہیں تھا، یا پھر کبھی کبھی یورپی سیاسیات کا کوئی ایسا مسئلہ جس سے ہنوور کے مفادات وابستہ ہوں اس کی توجہ کو حرکت میں لاسکتا تھا۔ اس سے ہٹ کر باقی تمام معاملات کو وہ اپنے وزرا پر چھوڑنے کے لئے تیار تھا۔ بادشاہ کی معاملاتِ سلطنت سے دست کشی اور وزرا کو ان اختیارات کی سپردگی کسی دستوری مجبوری کی وجہ سے نہیں تھی۔ نظری طور پر وزرا اب بھی بادشاہ کے نوکر تھے۔ اسے اپنے وزیروں کو اپنے طور پر چننے کا پورا اختیار تھا۔ وہ اس بات پر مجبور نہیں تھا کہ جس پارٹی کو دارالعوام میں اکثریت حاصل ہو صرف اس کے لیڈروں کو وزارتی عہدے عطا کرے۔ وہ صرف ایسے لوگوں کو منتخب کرتا تھا جو اس کی رائے میں اس کام کی اہلیت رکھتے تھے اور جو مہماتِ سلطنت کی انجام دہی میں پارلیمنٹ کو اپنا ہمنوا بناسکتے تھے۔ اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ "نظریۂ تفریقِ اختیارات" کم از کم نظری طور پر اب بھی انگلستان کے دستور کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ پارلیمنٹ کا کام "قانون سازی، حکومت کو روپیہ فراہم کرنا" اور حکومت کے اعمال پر حسبِ موقع تنقید اور زجر و توبیخ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مہماتِ سلطنت کی انجام دہی بادشاہ کا کام تھا۔ عاملانہ اختیارات میں پارلیمنٹ مداخلت کی مجاز نہیں سمجھی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ عاملہ کو خائف رکھنے کے لئے وہ "مواخذہ" کے ہتھیار سے کام لے سکتی تھی۔ دستور کی ظاہری صورت اس وقت یہی تھی۔ اگر اس کے خلاف اس عہد میں کوئی بات کہی جاتی تو وہ مضحکہ خیز سمجھی جاتی مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمعصروں کی نظروں سے اوجھل بعض چھوٹی چھوٹی اور بظاہر

غیر اہم تبدیلیوں کے نمودار ہونے سے انگلستان کا دستور غیر محسوس طریقہ پر اپنا قالب بدل رہا تھا اور اس کے ظاہر و باطن میں بڑا فرق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

سر رابرٹ والپول

دستور کی اس قلب ماہیت میں جہاں وقت کے حالات و اسباب نے ساتھ دیا وہیں اس کی صورت گری خصوصیت کے ساتھ سر رابرٹ والپول کی رہین منت ہے والپول اس عہد کے سرکردہ وگ لیڈروں میں سے تھا۔ این کے زمانہ سے وہ مختلف وزارتوں سے وابستہ رہ چکا تھا۔ والپول نے کیبنٹ کی ترقی کے لئے جو کچھ کیا وہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ کسی خاص سیاسی فلسفے سے متاثر تھا یا نظام حکومت کی کوئی مخصوص منزل اس کے پیش نظر تھی۔ وہ اس امر کا خواہش مند نہیں تھا کہ کسی خاص طرز حکومت کا موجد بنے۔ محض حالات و اتفاقات ایسے تھے کہ خود بخود ایک خاص راستے کی نشان دہی ہوتی چلی گئی۔ والپول بلا ارادہ اور نادانستہ طور پر اس راستہ پر گامزن رہا۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ اس سے اس کے فرائض کی انجام دہی میں سہولت اور آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ والپول کا تعلق وگوں کے ایک زمیندار خاندان سے تھا۔ اس کی صلاحیتیں عملی سیاست دان کی سی تھیں، وہ تیز و طرار نہیں تھا۔ خطیب بھی وہ کچھ اچھا نہیں تھا۔ دارالعوام کو وہ اپنی خطابت کے زور سے نہیں بلکہ مدلل بحث اور حقائق پر مبنی تقاریر سے اپنا ہمنوا بناتا تھا۔ سحر کار اور جذباتی خطابت کو وہ پارلیمنٹ میں ووٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا نہیں جانتا تھا۔ یوں تو جارج اول کی ابتدائی کیبنٹوں سے بھی وہ وابستہ رہا۔ لیکن 1721ء سے 1742ء تک وہ مسلسل اور بلا وقفہ حکومت پر چھایا ہوا رہا۔ اس طویل عرصہ میں اس نے کیبنٹ سے جو کام لیا اور پارلیمنٹ کو جس طرح قابو میں رکھا، نیز ایک نہیں دو تاجداروں کو یکے بعد دیگرے جس طرح اپنا ہمنوا بنا رکھا، اس کی بنا پر والپول کو کیبنٹ طرز حکومت کا معمار کہا جاتا ہے۔ کیبنٹ اس زمانے میں کچھ اس حال میں تھی کہ وہ بادشاہ کو یکسر نظر انداز کر کے صرف دارالعوام کو ہی اپنا آقا نہیں مان سکتی تھی۔ اسے بیک وقت دو آقاؤں کو خوش رکھنا تھا۔ ایک تو بادشاہ، دوسرے پارلیمنٹ۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی ناراضی اسے متزلزل کر سکتی تھی۔ خصوصیت کے

ساتھ بادشاہ کو راضی نہ رکھنے کی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ۔ والپول نے اس مشکل کام کو اس خوبی سے انجام دیا کہ کیبنٹ کی پوزیشن مضبوط اور مستحکم ہوتی چلی گئی ۔ جارج اول کے بعد جارج دوم کو اس حد تک رام کر لیا تھا کہ عملاً انصرام سلطنت کا تمام اقتدار والپول کے ہاتھ میں آگیا ۔ اور کیبنٹ کے دوسرے اراکین اس کی چھائی ہوئی شخصیت کے مقابلہ میں دب کر رہ گئے ۔ عام طور پر کیبنٹ کے تمام اراکین مرتبہ اور پوزیشن کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہمسر سمجھے جاتے تھے ۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ سب کے سب بادشاہ کے ملازم تھے اس لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کو دوسروں پر تفوق اور برتری کا سوال نہیں تھا ۔ اسی سبب کی بنا پر ان میں آپس میں وفاداری یکجہتی اور پارلیمنٹ کے سامنے مشترکہ ذمہ داری کا بھی سوال نہیں تھا ۔ آپس میں باہم متحد اور شیر وشکر ہونے کی بجائے وہ بادشاہ کے الطاف واکرام کے لئے ایک دوسرے کے حریف تھے ۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ ہر مسئلہ میں متفق الخیال ہوں ۔ کیبنٹ میں ہوتے ہوئے سیاسی پالیسیوں کے بارے میں وہ ایک دوسرے سے سخت اختلاف کر سکتے تھے ۔ والپول کا کمال یہی تھا کہ اس نے ان منتشر اور مختلف اجزائے کیبنٹ کو اس طرح مربوط کرنے کی کوشش کی کہ وہ "ایک جان اور کئی قالب" بن جائیں ۔ یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب بھی رہی لیکن کیبنٹ کے ارتقا میں والپول نے جو کچھ کیا اس کو ارتقا کا لفظِ آخر نہیں سمجھنا چاہئے ۔

وزارتِ عظمیٰ اور والپول

جارج اول اور جارج دوم کی کیبنٹ کے جلسوں سے مسلسل غیر حاضری بلکہ اس روش کا طویل عمل درآمد کی وجہ سے وسـ ری روایت کی شکل اختیار کرتا جانا قدرتی طور پر کیبنٹ کے طریقۂ کار میں ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا ۔ کیبنٹ کے اجلاس اس سے پہلے بادشاہ کی صدارت میں منعقد ہوتے تھے ۔ اس سے اندرونی نظم وضبط بھی برقرار رہتا اور مسائل زیر بحث کو خوش اسلوبی سے طے کیا جا سکتا تھا ۔ مگر اچانک بادشاہ کی ان جلسوں سے غیر حاضری نے ایک خلا کی سی کیفیت پیدا کر دی ۔ اس خلا کو پُر کرنا از بس ضروری تھا ۔ وزرا میں کسی ایسے شخص کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جو دوسروں کو کسی حد تک اپنے قابو میں رکھ سکے ۔ کسی مسلمہ لیڈر کی عدم موجودگی میں کیبنٹ میں انتشار اور بے ربطگی کا امکان پیدا

ہو چلا تھا۔ کیبنٹ میں کسی جدید قیادت کے اُبھرنے کے لئے حالات خود متقاضی تھے۔ بے سری کیبنٹ نہ صرف اندرونی انتشار کا شکار ہو جاتی بلکہ ملک کے نظم و نسق کے لئے بھی ایک خطرہ بن جاتی۔ ویسے بھی یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ والپول نے اس موقعہ پر اپنی شخصیت کے زور سے اس خلا کو پر کر دیا جو اس وقت کیبنٹ میں پیدا ہو گیا تھا اور قدرتی طور پر اس کی رہبری اور رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ عمل کسی دانستہ اور سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ حالات نے جو ایک نیا تقاضہ پیدا کیا تھا یہ اس کا قدرتی جواب اور تکملہ تھا۔ والپول کی بلند شخصیت اپنے دوسرے ساتھیوں پر ان حالات میں غالب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ہرچند کہ والپول کا بلا ارادہ اس طرح کیبنٹ کے لیڈر کی حیثیت سے اُبھر ناسب ہی کو شاق گزرا۔ لیکن اس کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ کیبنٹ اپنے ارتقار کی ایک نئی منزل میں داخل ہو رہی تھی۔ اس تغییر پذیر حالت میں اس کی ترقی کے لئے شاید ایک نئے عہدہ کا وجود میں آنا ناگزیر تھا۔ یہ عہدہ وزارتِ عظمیٰ کا ہے۔ وزارتِ عظمیٰ کو والپول نے جنم نہیں دیا بلکہ تاریخی ارتقار کی پوشیدہ قوتیں اس کو جنم دے رہی تھیں والپول نے صرف اتنا کیا کہ بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ مخالف طاقتیں اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کا گلا گھونٹ دیتیں۔

" وزارتِ عظمیٰ کے وجود کی مخالف قوتیں ملک میں کچھ کم نہیں تھیں۔ جب لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اس قسم کا کوئی عہدہ در پردہ پرورش پا رہا ہے تو ہر طرف سے اس پر طعن و تشنیع کے تیر برسنے لگے۔ بلکہ یہ کوشش کی جانے لگی کہ اس کو مٹا کر رکھ دیا جائے۔ پارلیمنٹ میں والپول پر حملے ہونے لگے کہ قانون اور دستور کے برخلاف وہ اپنے آپ کو " وزیر اعظم " بنائے ہوئے ہے۔ اس کے مخالفین کہتے تھے کہ ملک کا دستور اس قسم کے کسی عہدہ سے واقف نہیں ہے۔ اور یہ کہ والپول نے محض اپنے آپ کو طاقت ور بنانے اور ہمسر وزرار پر حکومت جتانے کے لئے یہ پوزیشن اپنے لئے پیدا کر لی ہے۔ دستور اور قانون میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ والپول ان حملوں کے جواب میں بڑی شدت سے یہ اعلان کرتا تھا کہ نہ وہ وزیر اعظم ہے اور نہ مجلسِ وزرار میں اس قسم کا کوئی عہدہ موجود ہے، اور یہ کہ یہ سب اس کے مخالفین کی " بہتان تراشی " ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ والپول نے تقریباً 21 سال تک کیبنٹ کو اس طرح قابو میں

رکھنے کی کوشش کی کہ اس کو پہلا وزیرِ اعظم کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وزارتِ عظمیٰ کا آہستہ آہستہ اس طرح وجود میں آنا کیبنٹ کے ارتقار کی ایک اہم منزل ہے۔ لیکن جس زمانہ میں یہ عہدہ نمو پذیر تھا اس وقت اس کے خلاف ملک میں مخالفت کے وہی جذبات پائے جاتے تھے جو کیبنٹ کے ابتدائی ارتقا کے مرحلوں میں دیکھے گئے ہیں۔ ہم عصر رائے عامہ کا اس طرح اس کا مخالف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اس کی آئندہ افادیت سے ناواقف تھی، اور یہ نہیں جان سکتی تھی کہ کیبنٹ کے پودے سے یہ نئی کونپل جو پھوٹ رہی ہے وہ اسے آئندہ کس حد تک سرسبز و شاداب کر دے گی۔ رائے عامہ کی شدتِ مخالفت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نہ صرف والپول کو اس بات سے انکار رہا کہ وہ وزیرِ اعظم ہے بلکہ اس کے بعد بھی کئی پیڑیوں تک جو اشخاص اس عہدہ کے حامل رہے وہ وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہونے کی حقیقت سے دانستہ انکار کرتے تھے تاکہ وہ ملک میں مطعون نہ ہوں۔ چنانچہ گرینول نے (GRENVILLE نے) ۱761ء میں کہا تھا کہ "وزیرِ اعظم ایک نفرت انگیز لقب ہے"۔ لارڈ نا تھ کی تو کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی منع کرتا تھا کہ اس کو وزیرِ اعظم کے لقب سے پکاریں۔ اور یہ بات بھی بھولنے کے قابل نہیں کہ جب وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ کو عام رائے نے قبول کر لیا اور اس کے خلاف عناد اور مخالفت کے جذبات رفتہ رفتہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ تب بھی قانون میں اس عہدہ کے لئے کوئی جگہ نہیں نکالی گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک انگلستان میں قانوناً وزیرِ اعظم کا کوئی عہدہ نہیں تھا۔ اس کا وجود صرف دستوری عمل درآمد (CONVENTION) میں پایا جاتا تھا۔

کیبنٹ کا اِرتقاء

والپول نے کیبنٹ میں اپنے لئے جو مقام پیدا کر لیا تھا اور حکومت کی قیادت جس طرح اپنے قبضے میں کر لی تھی اس کے بارے میں پارلیمنٹ کے اندر اور باہر عام ناراضگی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ 1741ء میں دارالامرا نے ایک قرارداد میں اس عہدے کے خلاف احتجاج کیا مگر والپول نے ان مخالفتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ دارالعوام میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے وہ تمام جائز و ناجائز ذرائع اختیار کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ اس نے ایک طرف بادشاہ کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تو دوسری طرف رشوت ستانی اور بدعنوانی سے

کام لے کر پارلیمنٹ میں ہمیشہ اپنی اکثریت برقرار رکھی ۔ اس طریقۂ کار کی وجہ سے والپول کا دامن کسی حد تک داغ دار ضرور ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بدعنوانیوں کی گرم بازاری اٹھارویں صدی کی سیاسی زندگی کا جزو لاینفک تھی ۔ والپول ہی تنہا سیاست دان نہیں تھا جس نے اس مذموم طریقہ سے کام لیا ہو ۔ اور پھر یہ کہ والپول نے جو کچھ کیا وہ ذاتی اغراض کے لئے نہیں بلکہ اس کی اپنی دانست میں قومی مفاد کی خاطر تھا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کیبنٹ اس وقت ارتقار کے جس مرحلے میں تھی اس کے لئے یہ طریقۂ کار بجائے خود کیسا ہی مذموم سہی نہایت مفید ثابت ہوا ۔

والپول نے اپنے اکیس سالہ اقتدار کے زمانہ میں اس امر کی کوشش کی کہ کیبنٹ کے ارکین باہم اتحاد اور یگانگت کے رشتے میں جُڑے رہیں۔ اور وہ مشترکہ مقاصد کے لئے کام کریں ۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کیبنٹ صرف مختلف افراد کے مجموعہ کا نام ہو جن میں آپس میں کوئی مشترکہ نصب العین نہ پایا جاتا ہو ۔ وہ کیبنٹ کو ایسا جسد بنانا چاہتا تھا جس میں ہم آہنگی کی رُوح پھونکی گئی ہو ۔ چنانچہ وہ اپنی وزارت سے ایسے لوگوں کو علحٰدہ کرتا رہا جو اس سے سیاسی مسائل یا قومی پالیسیوں کے بارے میں اختلاف رکھتے تھے ۔ 1725ء میں راکس بارو، اور 1729ء میں ٹاونشنڈ کی کیبنٹ سے علحٰدگی والپول کی اسی دانستہ کوشش کا نتیجہ تھا ۔ والپول کا یہ رجحان واضح طریقہ سے 1733ء میں سامنے آیا ۔ محصول چنگی کے سلسلہ میں ایک مسودہ قانون (EXCISE BILL.) کیبنٹ کے بیشتر ارکین کی رضامندی کے ساتھ دارالعوام میں پیش کیا گیا ۔ اگرچہ یہ مجوزہ قانون فی نفسہٖ بہت اچھا تھا لیکن پارلیمنٹ میں اس کی پیش کشی کے ساتھ ہی ملک میں ہر گوشہ سے اس کی مخالفت ہونے لگی ۔ یہ بات یہاں تک بڑھی کہ مختلف مقامات پر اس کے ضمن میں فسادات برپا ہو گئے ۔ ایسے موقعہ پر والپول نے دیکھا کہ اس بل کی مخالفت میں اور تو اور بعض اس کے ساتھی وزرا بھی پیش پیش ہیں، والپول اپنے ساتھیوں کے اس انحراف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ اس خصوص میں کیبنٹ میں ایک سخت ڈسپلن پیدا کرنے کا خواہاں تھا ۔ چنانچہ ان مخالف وزرار کو کیبنٹ سے علحٰدہ کر دیا ۔ ان نے اپنے اس عمل سے کیبنٹ کے ایک بنیادی اصول کی حمایت کی ۔ یعنی یہ کہ کیبنٹ کے فیصلوں کے تمام

CONSTITUTIONAL HISTORY OF MODERN BRITAIN, KEIR. P. .332 لہ

وزرار پابند ہیں، اور ان سے وہ انحراف نہیں کرسکتے۔ اختلاف کی صورت میں ان کا واحد چارۂ کار کیبنٹ سے علٰحدگی ہے۔ یہ مسودہ دارالعوام میں آسانی سے پاس ہوگیا لیکن دارالامراء میں حکومت کو شکست ہوگئی۔ اس پر والپول نے وزارت سے مستعفی ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی کیبنٹ کو ایک موروثی ایوان کے سامنے ذمہ دار نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی دُور بین نگاہیں یہ تاڑ گئیں تھیں کہ اب اور آئندہ اگر کیبنٹ کو زندہ رہنا ہے تو اس کو دارالعوام کی خوشنودی پر زندہ رہنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں وہ عوام کے نمائندوں کے سامنے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ غرض والپول اپنے طرزِ عمل سے ایسی روایات کا بانی ہوا کہ جن کی بنیاد پر آئندہ کابینی نظامِ حکومت کو ترقی کا موقعہ ملا۔

یہ بات والپول کی جمہوریت پسندی کی دلیل ہے کہ اس نے اس مسودّہ سے دست برداری حاصل کرلی۔ اگر وہ چاہتا تو پارلیمنٹ سے اسے پاس کرا سکتا تھا مگر رائے عامہ کی مخالفت کا واضح اظہار ہوچکا تھا۔ رائے عامہ کے مقابلے میں والپول کی سپر اندازی مستقبل کے ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہے۔ جمہوریت کی توسیع اور ترقی کا یہ تقاضا تھا کہ حکومت اپنے آپ کو بدرجۂ اولیٰ رائے عامہ کی خادم اور محکوم سمجھے۔ حکومت پر رائے عامہ کے دباؤ کا یہ پہلا اہم واقعہ ہے۔ اس دباؤ کے آگے بادشاہ، کیبنٹ اور پارلیمنٹ سب ہی سر تسلیم خم کرنے پر مجبور تھے۔ پارلیمنٹ کے باہر رائے عامہ کی ایک نئی قوت معرضِ وجود میں آرہی تھی۔ کوئی حکومت اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتی تھی کیونکہ آخری تجزیہ میں پارلیمنٹ یا دارالعوام نہیں بلکہ یہی رائے عامہ مقتدرِ اعلیٰ تھی۔ والپول اس راز سے بخوبی واقف تھا۔ اسی لئے اس نے اپنے اس مسودّہ کو قانون کی شکل دینے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کی یہی سیاسی نبض شناسی اس کی عظمت کی نشانی ہے۔

والپول 1742ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ملک کی عام رائے اس کے خلاف ہوگئی ہے۔ 1741ء کے انتخابات میں اس کی اکثریت بہت گھٹ گئی تھی۔ وہ اس سے بہت پہلے ہی مستعفی ہونا چاہتا تھا مگر جارج دوم کے اصرار پر اس نے دو مرتبہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ اب جبکہ دارالعوام میں بھی اس کی تائید گھٹتی نظر آرہی تھی اور ایک مختصر وقفہ میں اسے دو مرتبہ ایوان میں شکست اُٹھانی پڑی تو اس نے خدمت سے علٰحدگی کا تہیّہ کرلیا۔ جارج دوم کو چاروناچار اس کا استعفیٰ قبول کرنا پڑا۔

والپول کی خدمت سے علٰحدگی بھی جن اسباب کی بنا پر عمل میں آئی تھی وہ کابینی نظام کی ترقی اور استحکام کا باعث ہوئی ۔ بادشاہ کی غیر متزلزل تائید کے بل بوتے پر اگر وہ چاہتا تو برابر اپنی خدمت پر برقرار رہ سکتا تھا ۔ دارالعوام میں اکثریت یا عدم اکثریت کو نظر انداز کر سکتا تھا مگر والپول نے اس کو گوارا نہیں کیا ۔ وہ جانتا تھا کہ دارالعوام کی تائید کھونے کے بعد اسے برسر اقتدار رہنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اور شاید یہ احساس بھی تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں بادشاہ کی تائید کے باوجود اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ یہ خیال اس بات کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا کہ وزارت کی برقراری کا انحصار اب زیادہ تر دارالعوام کی تائید اور خوشنودی پر ہے ۔ اس کے لئے محض بادشاہ کی تائید کافی نہیں ۔ ایک مشہور اسکالر اور محقق پروفیسر ہرن (PROF, HEARN.) نے کیبنٹ کی تعمیر و ترقی میں والپول کی خدمات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :

"والپول پہلا آدمی تھا جس نے حکومت کی ایسی نیو ڈالی جو ہماری قومی ضروریات کے مطابق تھی اور جس کو وہ اپنی رائے میں بہتر سمجھتا تھا ۔ اسی کے زمانے میں دارالعوام قومی کام کی انجام دہی کا مرکز بن گیا ۔ اس نے اس بات پر سختی سے اصرار کیا کہ اس کے رفقائے کار (وزرار) پارلیمنٹ میں اس کی تجاویز کی بھرپور تائید کریں ۔ یہ اس کی رہنمائی اور قیادت کا نتیجہ تھا کہ دارالعوام نہ صرف امورِ مملکت میں نہایت طاقتور ہوگیا بلکہ اثر و نفوذ اور اختیارات کے لحاظ سے اس کو دارالامراء پر فیصلہ کن برتری حاصل ہوگئی ۔ والپول نے ہی یہ روایت قائم کی کہ بادشاہ کی تائید اور اعتماد حاصل ہونے کے باوجود اگر وزرار دارالعوام کے اعتماد سے محروم ہو جائیں تو انھیں فوراً مستعفی ہو جانا چاہئے ۔" [۱]

ان جامع الفاظ میں والپول کے عہد کے کابینی ارتقاء کی واضح تصویر کھینچ دی گئی ہے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ والپول کا نام اسی لئے اب تک "پہلے" وزیر اعظم کی حیثیت سے لیا جاتا ہے ۔

GOVERNMENT OF ENGLAND, HEARN. P. 220 ------- [۱]

بادشاہ کی بے اثری اور کیبنٹ سازی کی مشکلات

یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ والپول کے استعفیٰ کے بعد سے جارج دوم کو چین کی نیند سونا نصیب نہ ہوسکا۔ بظاہر یہ بات ایک مبالغہ معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ والپول کے بعد جارج نے جن جن اشخاص کو اپنے اعتماد سے سرفراز کیا اور جتنی وزارتیں اس نے تشکیل دیں وہ اس کو الجھنوں سے دور رکھنے کی بجائے ہمیشہ نت نئی مشکلات اس کے لئے پیدا کرتی رہیں۔ اسی لئے وہ والپول جیسے آزمودہ کار دوست اور ہمدرد کو خدمت سے علیحدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن والپول کے اصرار کے مقابلہ میں وہ بے بس ہوگیا۔ والپول کے بعد کیبنٹ سازی کا کام جارج کے لئے نہ صرف تلخ بلکہ دشوار ہوتا گیا۔ جن لوگوں سے اسے اس ضمن میں سابقہ پڑتا رہا وہ نہ صرف اس سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے بلکہ قابلِ بھروسہ بھی نہیں تھے۔ اسی لئے اس دور میں جلد جلد وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ والپول جیسی کوئی وجیہہ شخصیت اس وقت میدان میں نہیں تھی جو مختلف و متضاد عناصر کو ایک ٹیم کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور کرسکے۔

جارج اس وقت کے بعض لیڈروں سے سخت ذاتی عناد اور بغض بھی رکھتا تھا۔ ان کا وجود اسے ایک نظر نہیں بھاتا تھا۔ مگر حالات ایسے تھے کہ کیبنٹ سازی میں ان کے تعاون کی ضرورت تھی۔ لیکن ان کی بے رخی سے اسے تلخ تجربے ہوتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان تلخیوں سے وہ جھلا اٹھا۔ اور لارڈ ڈیوکاسل سے کہا کہ "میں جب تک ان بدمعاشوں سے نجات حاصل نہ کرلوں اپنے آپ کو بادشاہ نہیں سمجھوں گا۔" یہ اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جو صرف اپنی شرطوں پر کابینی عہدے قبول کرنا چاہتے تھے۔

اصل قصہ یہ تھا کہ جارج کے ہاتھ سے اختیارِ تقرر نکلتا جا رہا تھا۔ نظری طور پر اب بھی وہ یہی سمجھتا تھا کہ وزراء کے تقرر کا اختیار اسے بلا شرکتِ غیرے حاصل ہے مگر عملاً اب یہ بات ناممکن ہوتی جارہی تھی، وزراء پر بادشاہ کا اثر دن بدن کم ہوتا جارہا تھا۔ تقرر اور برطرفی کے دونوں اختیارات اس کے ہاتھ سے جاتے معلوم ہوتے تھے۔ نہ اپنے پسندیدہ آدمیوں کو وہ برسرِ عہدہ رکھ سکتا اور نہ ایسوں کو برطرف کرسکتا تھا جو اسے پسند نہیں تھے۔

والپول کے بعد ولنگٹن کی نام نہاد سرکردگی میں وزارت تشکیل پائی۔ لیکن اس وزارت میں کارٹیرٹ طاقتور آدمی تھا۔ جارج بھی اسے بہت پسند کرتا تھا کیونکہ امور خارجہ کی حکمت عملی میں وہ بادشاہ کا مؤید تھا۔ لیکن دوسرے وزرا اس کے سخت مخالف ہوگئے۔ جارج کو چاروناچار اسے برطرف کرنا پڑا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اس کو بہت شاق گزری۔ مگر دارالعوام میں طاقت کا توازن کارٹیرٹ کے موافق نہیں تھا۔ 1744ء سے 1746ء تک ہنری پلہم (HENRY PELHAM.) وزیرِ اعظم کی حیثیت سے فائز رہا۔ مگر یہ کمزور آدمی تھا۔ کابینہ میں اتحاد سے زیادہ انتشار تھا۔ جارج ان سب کا دشمن تھا کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جو کارٹیرٹ کی برطرفی کے موجب ہوئے تھے۔ اور اب اس کوشش میں تھے کہ ولیم پٹ کو کابینہ میں شریک کریں۔ جارج دوم کو ولیم پٹ سے شخصی عناد تھا۔ یہ شخص بادشاہ کی جرمن دوست پالیسی پر سخت حملے کرتا تھا اور ہنوور کو اس نے اپنی تقریر میں ایک مرتبہ "گداگر جرمن الکٹوریٹ" (ریاست) کہا تھا۔ یہ بات جارج کے دل میں ہمیشہ چبھتی تھی۔ اس نے پٹ کو وزارت میں شریک کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اس پر وزارت مستعفی ہوگئی۔ جارج نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور کارٹیرٹ کو جو اب لارڈ گرینول (GRANVILLE) ہوگیا تھا ارل باتھ کے ساتھ وزارت تشکیل دینے کی دعوت دی مگر دو تین دن میں ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ دونوں وزارت تشکیل دینے کے موقف میں نہیں ہیں کیونکہ دارالعوام میں ان کے لئے کافی تائید مہیا نہیں ہوسکی۔ جارج ان حالات میں اپنے سابقہ وزیروں کو بحال کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اور طوعاً و کرہاً ان کی یہ شرط بھی مان لی کہ پٹ کے لئے کابینہ میں جگہ مہیا کی جائے۔ کیبنٹ سازی کے معاملہ میں بادشاہ کی بے بسی اور مجبوری کی یہ ایک واضح مثال ہے اور اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ہوا کا رُخ کس تیزی سے بدل رہا تھا۔

ہنری پلہم کی وفات کے بعد مختلف وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ وہگ لیڈروں کی باہمی رقابتیں مستحکم وزارتوں کے قیام میں حائل رہیں۔ یہ انتشاری کیفیت ایک عرصہ تک جاری رہی۔ لیکن بادشاہ اس کے باوجود وزارت سازی میں بے بس رہا۔ ایک منزل پر جارج کی یہ خواہش تھی کہ فاکس کی سرکردگی میں کوئی وزارت تشکیل پائے۔ مگر اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں جنگ ہفت سالہ کا آغاز ہوا جس نے ایک نازک صورتِ حال پیدا کردی۔ اس وقت ڈیون شائر کی وزارت میں پٹ بھی کارگزار تھا مگر جارج کو اس سے

سخت نفرت تھی ۔ لہٰذا بہت جلد اس نے اس وزارت کو برطرف کر دیا۔ مگر پٹ ملک میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ ایسے نازک موقعہ پر وزارتِ جنگ کا کام اس سے بہتر طریقہ پر کوئی اور سنبھال نہیں سکتا۔ جارج پر رائے عامہ کا سخت دباؤ پڑنے لگا۔ دارالعوام بھی پٹ کی تائید میں تھا۔ ایسے میں بادشاہ نے نیوکاسل کو وزارت بنانے کے لئے کہا۔ اس نے یہ دعوت اس شرط پر قبول کی کہ وہ پٹ کو کیبنٹ میں شامل رکھے گا۔ بادشاہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اُوپر کیبنٹ سازی کی جو تفصیل دی گئی ہے اس سے وزراء کے تقرر اور برطرفی کے معاملے میں بادشاہ کی روز افزوں بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اب یہ اختیار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر دارالعوام کو منتقل ہوتا نظر آتا تھا۔ مگر یہ تبدیلی ایسی تھی جو اب بھی عام نظروں سے پوشیدہ تھی اور اس ڈرامے میں جو ایکٹر کام کر رہے تھے شاید وہ بھی اس کے مضمرات سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ بادشاہ جن لوگوں کو وزارت دینا چاہتا تھا ان کو دارالعوام میں کافی تائید میسر نہیں آتی تھی، لہٰذا اس ذمہ داری کے قبول کرنے سے وہ قاصر تھے اور جن لیڈروں کی دارالعوام میں مستحکم پوزیشن تھی وہ اپنی شرطوں کو منوائے بغیر وزارت سازی کی ذمہ داری لینا نہیں چاہتے تھے۔ اسی کشمکش سے تنگ آکر جارج ہنری دوم کی طرح ایک مرتبہ چلّا اُٹھا تھا کہ "کوئی مجھے ان بدمعاشوں سے بچائے"۔ ہنری دوم ایک پادری سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور جارج وہگ لیڈروں کی ریشہ دوانیوں سے۔ مگر تاریخی ارتقاء کی قوتیں جارج کے خلاف تھیں۔

بارھواں باب

کابینی ارتقاء میں مزاحمت

جارج سوم (1)

گزشتہ پچاس سال میں کینٹ نے جو ترقی کی تھی وہ بعض مخصوص سیاسی اسباب و حالات کا نتیجہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ دستور میں اس زمانے میں ارتقائی اور تخلیقی قوتیں نمو پذیر تھیں۔ اور جسدِ سیاسی ایک نئے عضو کی تخلیق میں مصروف تھا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا کسی دانستہ نصب العین کے تحت نہیں تھا۔ زیادہ تر یہ ترقی غیر شعوری اور بلا تعین منزل تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ارتقاء کے ضمن میں بعض مقامات ایسے بھی آتے رہے جہاں انسانی ذہن نے ان نمو پذیر قوتوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی مگر مجموعی طور پر اس ساری تخلیق کو غیر شعوری اور بلا ارادہ سمجھنا چاہئے۔ انگلستان ایک ایسے نظامِ حکومت کو وجود میں لا رہا تھا جو دنیا کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اس قسم کی طرزِ حکومت کا نہ کہیں تجربہ کیا گیا تھا اور نہ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر یا مثال ملتی ہے۔ لیکن یہ تجربہ جب انگلستان میں کامیاب ثابت ہوا تو دنیا کے دوسرے ممالک نے اپنے دساتیر کو بعد میں اسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کے ذریعہ سے پارلیمنٹ نے عاملہ کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا نرالا ڈھنگ دریافت کیا تھا۔ اس طریقۂ کار سے عاملہ پر پارلیمنٹ کی بالواسطہ سیادت قائم ہو گئی۔ مقننہ اور عاملہ اب ایک دوسرے کے مدِمقابل نہیں رہے بلکہ اختیارات کے

کے استعمال میں باہم شریک کار بن گئے۔ کابینی نظامِ حکومت کی تخلیق و ترقی نے نظریۂ تفریقِ اختیارات کی اساس کو بہت کمزور کر دیا۔ اس بات پر پہلے بہت زور دیا جاتا تھا کہ عاملہ اور مقننہ اپنے اپنے دائرۂ عمل میں بالکل آزاد رہیں۔ ان دونوں طاقتوں کا انضمام جمہوریت کے لئے خطرناک سمجھا جاتا تھا مگر کابینی طرزِ حکومت نے ان دونوں کو ایسا شیر و شکر کر دیا کہ ان میں آپس میں تصادم اور تعطل کے امکانات باقی نہیں رہے۔

اس نظام نے گزشتہ پچاس سال میں بڑی تیزی سے ترقی کی تھی۔ اور جو کچھ ترقی ہوئی تھی وہ "رسوم" اور "روایات" کی بنیاد پر قائم رہی۔ دستوری قانون ان تبدیلیوں سے ناواقف اور ناآشنا رہا۔ کیبنٹ نے نظامِ حکومت میں جو جگہ پیدا کرلی تھی اس کو قانون تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ قانون میں نہ تو کیبنٹ کی کوئی جگہ تھی اور نہ کیبنٹ کے اس اہم ترین فرد کی جس کو "وزیرِ اعظم" کا نام طنزاً دیا جاتا تھا، یہ عہدہ ہرچند کہ کابینی نظام کی جان تھا مگر ملک کی عدالتیں اس سے بالکل بے خبر تھیں۔ کیبنٹ میں یہ بھی مثل اور وزیروں کے تھا۔ اس کو تنخواہ بحیثیتِ وزیرِ اعظم نہیں ملتی تھی بلکہ وہ عموماً فرسٹ لارڈ آف دی ٹریژری (FIRST LORD OF THE TREASURY.) کی حیثیت سے تنخواہ پاتا تھا یا کبھی وہ لارڈ پریسیڈنٹ کے عہدہ کا حامل ہوتا۔ غرض قانوناً اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی معروف عہدے کا حامل ہو۔ ورنہ محض وزیرِ اعظم کی حیثیت سے کیبنٹ میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ انگلستان کے دستور کی یہ بہت دلچسپ خصوصیت ہے کہ اس کے ظاہر و باطن میں کوئی تطابق نہیں پایا جاتا۔

پچھلی نصف صدی کی ترقی نے کابینہ کو حکومت کے ایک عضو کی حیثیت سے متعارف ضرور کر دیا تھا اور یہ بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ موافق حالات میں اس کی ترقی پذیری میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کیبنٹ اب بھی ایک کمزور پودا تھا۔ اس کی جڑیں ابھی کمزور تھیں کہ اسے مزید آبیاری کی ضرورت تھی۔ سیاسی اداروں کی زندگی میں نصف صدی کا بیت جانا کوئی بہت طویل عرصہ نہیں ہے۔ یہ ادارے طویل عمل کے بعد مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔ کیبنٹ کو لوگوں نے قبول تو کر لیا تھا اور عمل کو قابلِ عمل بھی بنا دیا تھا مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دستور کی یہ ایک ایسی متین اور غیر تغیر پذیر شکل ہے کہ اس میں آئندہ کوئی تبدیلی نہ ہو سکے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے وجود کو

لوگ محض عارضی سمجھیں۔ باوجود پچھلی ترقی کے یہ کہنا مشکل تھا کہ کیبنٹ دستور کا ایک جزوِ لاینفک بن گئی ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے قانون میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس عہد کے لوگ اس طرزِ حکومت کے اتنے عادی نہیں تھے کہ اگر اس نظام کو نظر انداز کیا جاتا یا اس کے برخلاف کوئی دوسرا طریقۂ عمل اختیار کیا جاتا تو شاید ہی وہ اس کو دستور کی خلاف ورزی سمجھتے۔

جارج سوم کا تصورِ شاہی

کیبنٹ کے اس ارتقائی دور میں جارج سوم کی تخت نشینی (1760ء) اس ادارے کے لئے کسی قدر ضرر رساں ثابت ہوئی۔ جارج نے شروع سے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ اس طرزِ حکومت کو وہ بدل دے گا۔ اس کے نزدیک اس طرزِ حکومت کے معنیٰ یہ تھے کہ وہ اپنے اختیاراتِ شاہی کا تیاگ کر بیٹھے۔ اس قسم کی "خودکشی" کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کے منصوبے تو کچھ اور ہی تھے۔ وہ اپنے دو پیش رووں کی طرح تاج کو محض تزئین و آرائش کی علامت بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کا ایک مرکزی کردار تصور کرے۔ وہ جارج اول اور جارج دوم کی طرح جرمن نژاد نہیں تھا، وہ اپنے انگریز ہونے پر فخر کرتا تھا۔ اس کے باپ فریڈرک کا انتقال اس کی کم سنی میں ہو گیا تھا۔ فریڈرک جارج دوم کا بیٹا اور ولی عہد تھا۔ ہنوورین خاندان میں یہ بات بطور روایت چلی آ رہی تھی کہ ولی عہد سلطنت کا آستانۂ دولت ہمیشہ حکومتِ وقت کے سیاسی مخالفین کا ملجا و ماویٰ رہا۔ یہ بات جارج سوم کی ولی عہدی کے دور پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کی ماں جس کی آغوش میں جارج کی پرورش ہوئی، شاہی اختیارات کے اس طرح مسلوب ہو جانے کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو ہمیشہ یہی تعلیم دی کہ "جارج دیکھ، بادشاہ بن کر دکھا"۔ جارج کے دل میں یہ تصور اس حد تک گھر کر چکا تھا کہ وہ اس کے شعور کا ایک جزو بن گیا۔

جارج کی ذہنی صلاحیتیں معمولی قسم کی تھیں۔ وہ بہت ضدی بھی تھا۔ جو خیال اس کے ذہن نشین ہو جاتا اسے دور کرنا ایک امرِ محال تھا۔ کوئی حیل و حجت ایسے میں کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ خیال اس کی گھٹی میں پڑا تھا کہ اسے محض نمائشی نہیں بلکہ "کردار" کا بادشاہ

بننا چاہتے ۔ اس کے اس تصور کو اس کے مطالعہ سے بہت تقویت پہنچی ۔ اس نے بلیک سٹن (BLACK STONE.) کی مشہور و مستند کتاب "شرح قوانین انگلستان" کا جو اسی زمانے میں لکھی گئی تھی بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا ۔ بلیک سٹن نے انگلستان کے دستور کی قانونی توجیہہ و تاویل پیش کی تھی، ظاہر ہے کہ اس قانونی توجیہہ میں کینٹ کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی ۔ کیبنٹ نے جو کچھ اب تک حاصل کیا تھا وہ محض روایات اور "رسوم" کے بل بوتے پر تھا ۔ جارج کی ذہنی صلاحیتیں معمولی سہی مگر اتنا تو وہ تاڑ چکا تھا کہ دستور میں بادشاہ مفقود الاثر اور محروم الاختیار نہیں ہے ۔ وہ اب بھی وسیع عاملانہ اختیارات کا حامل تھا بشرطیکہ ان کا دوبارہ احیاء کیا جاسکے ۔ بالنگ بروک کی کتاب "محبِ وطن بادشاہ (THE PATRIOT KING.) کا بھی وہ بہت دلدادہ تھا ۔ اس کتاب میں "ادارۂ شاہی سے متعلق ٹوری نظریہ پیش کیا گیا تھا ۔ ٹوری دستور کے چوکھٹے میں بادشاہ کو مفلوج اور بے اثر نہیں بلکہ سرگرم عمل شخصیت دیکھنا چاہتے تھے ۔ وہ تاج کے ان سب اختیارات کے حامی تھے جن سے بالتصریح اس کو محروم نہیں کیا گیا تھا ۔

جارج سوم نے تخت نشینی کے ساتھ ہی اس امر کی کوشش کی کہ حکومت بالکلیہ اس کے قبضہ میں آجائے ۔ وہ اختیاراتِ شاہی کا دوبارہ احیا چاہتا تھا ۔ لیکن اس سلسلہ میں کسی امکانی غلط فہمی سے بچنے کے لئے جارج کے مقاصد کو واضح طور پر سمجھنا ضروری ہے ۔ وہ شاہی اختیارات کی تجدید ضرور چاہتا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ادارۂ شاہی کے اس نظریہ کی طرف لوٹنا چاہتا جس کے لئے جیمز اول یا چارلس اول نے جدوجہد کی تھی ۔ "موروثی اور آسمانی حقوق" کی باتیں اب قصۂ پارینہ تھیں اور جارج سوم کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان فرسودہ دعووں کا احیاء کرے ۔ وہ 1688ء کے انقلاب کے نتائج کو پوری طرح قبول کرتا تھا ۔ لیکن اس انقلاب نے جو عاملانہ اختیارات باقی رکھ چھوڑے تھے وہ بھی کیبنٹ کی تدریجی ترقی سے بادشاہ کے ہاتھ سے نکل چکے تھے ۔ وہ صرف ان جائز اور کھوئے ہوئے اختیارات کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ محض اس کے اجداد کی بے پروائی اور عدم دلچسپی سے یہ اختیارات اس وقت ناقابلِ عمل ہو گئے ہیں ۔ یہ نہیں کہ دستور کے کسی تقاضہ کے تحت بادشاہ نے ان سے دست برداری حاصل کی ہے ۔

کابینی نظام کو مٹانے کی کوشش

جارج نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کابینی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ واقعہ یہ ہے کہ کابینی ارتقاء پر جارج کا حملہ بہت مہلک قسم کا تھا۔ اگر جارج کو اس میں کامیابی ہو جاتی تو یہ کہنا مشکل ہے کہ انگلستان کے دستور پر آئندہ اس کا کیا اثر پڑتا۔ وہ اس کابینی ترقی کو حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہتا تھا جو انقلاب کے بعد وقوع پذیر ہوئی تھی۔ یہ ترقی انقلاب کے ثانوی نتائج کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ کیبنٹ کا بادشاہ کے اختیارات کا وارث ہونا، وزیر اعظم کے عہدہ کا وجود میں آنا، اور اس کی وجہ سے بادشاہ کے اختیارات کا سلب ہو جانا یہ ایسی چیزیں تھیں جن کو جارج تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ سب سے پہلے وہ وزراء کے تقرر کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ اس اختیار کے آزادانہ استعمال پر اس کی کامیابی کا انحصار تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی سے وزراء کو منتخب اور برطرف کر سکے تو یقیناً کیبنٹ کی حالیہ تعمیر و ترقی کی بنیادوں کو مسمار کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی اس کوشش کو غیر قانونی یا غیر دستوری نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ وہ کیبنٹ کو ایسا نظام سمجھتا تھا جس کے لئے دستور میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جارج کے اس نقطۂ نظر سے اس کے ہم عصروں کو مشکل سے اختلاف ہو سکتا تھا۔ وہ ہر چند جارج کی اس کوشش کو بہ نظر استحسان نہ دیکھ سکیں مگر اس کو دستور کی خلاف ورزی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کیونکہ کیبنٹ کو دستور کا ناقابلِ انفکاک جزو بننے کے لئے ابھی عرصۂ دراز کی ضرورت تھی۔ کیبنٹ ابھی ایک نئی چیز تھی۔ وہ سابق بادشاہوں کی بعض مخصوص مجبوریوں اور کمزوریوں کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ اگر یہ مجبوریاں باقی نہ رہیں تو اس کے وجود کا بھی کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ یہ خیال اس عہد کے لوگوں میں اس حد تک جاگزیں تھا کہ پٹ، لارڈ ناتھ، اور نیوکاسل جیسے چوٹی کے سیاستدانوں اور مدبروں نے جارج پر یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ وہ قانون یا دستور کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے لئے ان میں سے بعض جارج کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار نہیں تھے۔

جارج کو اس سلسلہ میں ایک اور گوشہ سے مدد ملی۔ ٹوری اپنی طویل سیاسی جلاوطنی کے بعد دوبارہ قومی سیاسیات میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر رہے تھے۔ ٹوری پارٹی کی یہ تعمیر جدید

جارج اول کے آخری زمانہ سے شروع ہوگئی تھی ۔ لارڈ بالنگ بروک اسٹورٹوں کی ہوا خواہی سے اب دست بردار ہو چکا تھا۔ نو سال تک وہ جیمز دوم کے بیٹے کے دربار سے وابستہ رہا تھا۔ 1723ء میں جارج اول سے معافی حاصل کرکے وہ دوبارہ انگلستان واپس آیا۔ اور اس کی جائیداد، زمینات وغیرہ اس پر بحال کر دی گئیں ۔ اس نے ٹوری پارٹی کی ازسرِنو شیرازہ بندی کی۔ ٹوری خیالات کے پرچار کے لئے اس نے ایک سیاسی رسالہ کرافٹس مین (CRAFTS MAN) شائع کرنا شروع کیا۔ اس کی کوشش سے ٹوری اب ایک نئی زندگی حاصل کر رہے تھے۔ اب ان کا نقطۂ نظر بھی بدل گیا تھا۔ انھوں نے اپنی وفاداریاں اسٹورٹوں سے ہنوویرین خاندان کی طرف منتقل کر دیں جس کو پہلے وہ غاصب سمجھتے تھے۔ اس وفاداری میں جذبات کو نہیں بلکہ حقیقت پسندی کو دخل تھا۔ ادارۂ شاہی اور اس کے اختیارات کے وہ اب بھی شدت سے مؤید تھے مگر اس میں وہ پہلا سا غلو نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بادشاہ دستور میں ایک باعمل اور فعال کردار کا حامل ہو۔ وہ وہگوں کی ساختہ پرداختہ کیبنٹ کے سخت مخالف تھے اور اس طرزِ حکومت سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے جو اس کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔ اس طرزِ حکومت نے بادشاہ کو عملاً پابندِ سلاسل کر دیا تھا۔ جارج سوم اس کو توڑنا چاہتا تھا۔ ٹوری پارٹی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار تھی۔

ٹوریوں کی تائید کے قطع نظر جارج سوم کو اس کے اپنے مقصد میں وہگوں کے باہمی انتشار سے بھی بہت مدد ملی۔ وہ عرصہ دراز سے اقتدار کی باگیں اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ کوئی ان کا مدِ مقابل نہیں تھا۔ اقتدار کی اس طویل اجارہ داری نے ان میں اخلاقی کمزوریاں پیدا کر دیں۔ قومی خدمت کی بجائے شخصی اور گروپ واری مفادات کے لئے وہ باہم دست و گریباں ہو رہے تھے۔ یوں بھی اس زمانے میں پارٹی بندی کا ڈسپلن کچھ زیادہ موثر نہیں تھا۔ اب اقتدار کی رسہ کشی میں قدرتی طور پر یہ پارٹی زیادہ انتشاری کیفیت سے دوچار ہونے لگی۔ اس کو متحد رکھنے کے لئے کوئی اعلیٰ مقصد بھی اس کے سامنے نہیں تھا۔ سابق میں اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ دستور اور خصوصیت کے ساتھ پروٹسٹنٹ سلسلۂ بادشاہت کی محافظ اور نگہبان ہے۔ اب یہ مسئلہ اس حد تک طے شدہ تھا کہ اس بارے میں کسی امکانی خطرے کا وجود تک نہیں تھا۔ ان حالات میں جارج سوم کو وہگ پارٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کا بہت اچھا موقعہ ملا۔

شاہی اثر و رسوخ کی بحالی

جارج سوم جس شاہی اقتدار کی بحالی کا خواہاں تھا اس میں دارالعوام سے تصادم کا کوئی خیال اس کے پیش نظر نہیں تھا۔ وہ نظامِ حکومت میں دارالعوام کی کامل برتری اور فوقیت کو پوری طرح تسلیم کرتا تھا۔ حکومت کی مشین کو وہ بے شک اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس ایوان کے علی الرغم نہیں بلکہ اس کی تائید سے وگوں نے دارالعوام کو قابو میں رکھنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے تھے بعینہٖ وہی ذرائع جارج سوم ان سے اقتدار کے چھیننے کے لئے استعمال کرنے لگا۔ اس سے پہلے کیبنٹ عملاً تاج کے اثر سے آزاد ہو گئی تھی۔ اور پارلیمانی تائید کے بل بوتے پر کام کرتی تھی۔ اب جارج یہ کوشش کرنے لگا کہ اسی پارلیمانی تائید کی کل کو اپنے قبضہ میں کرکے کیبنٹ کو اپنا ماتحت اور تابع فرمان بنا لے۔ اس کی یہ کوشش تقریباً بائیس سال تک جاری رہی (1760ء تا 1782ء)۔ اس میں عارضی طور پر اسے کامیابی بھی ہوئی۔ اس بائیس سالہ عرصہ میں اس نے کیبنٹ کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا لیا۔ یہ جارج سوم کی شخصی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس دور میں دارالعوام کو اس نے "نوازشاتِ شاہانہ" (CROWN PATRONAGE.) کے ذریعہ سے پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا۔ "نوازشات" کے یہ لامحدود وسائل جو پہلے "وزیر اعظم" یا دوسرے طاقتور وگ لیڈر اپنی اغراض کے لئے استعمال کرتے اور اس طریقہ سے اپنی حکومت برقرار رکھتے تھے اب جارج سوم نے ان پر یکایک اپنا قبضہ جما لیا۔ یہ کام اس نے ایسی پھرتی اور چابک دستی سے انجام دیا کہ وگوں کے خرانٹ اور تجربہ کار لیڈر جنھوں نے اپنی پوری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزاری تھی حیران و ششدر رہ گئے۔ اور لطف یہ ہے کہ انھیں اس میں چون و چرا کی بھی گنجائش نہیں تھی، کیونکہ کسی کو اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا تھا کہ "نوازشات" (PATRONAGE) فی الحقیقت نوازشہائے شاہی ہیں۔ اور بادشاہ کو ان کے استعمال کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ البتہ یہ بات اور ہے کہ جارج اول اور جارج دوم کے زمانہ میں بعض مخصوص اسباب و حالات کی وجہ سے ان وسائل کو بادشاہ کی بجائے اس کے وزراء استعمال کرنے لگے تھے۔

جارج سوم نے اپنے آپ کو حقیقی معنی میں بادشاہ بنانے کے لئے اس حربہ کا بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ اور اس کے ذریعہ سے کیبنٹ کی ترتیب و تشکیل اس کے ہاتھ میں آ گئی۔

وہ اپنی مرضی کی وزارتیں بنانے لگا۔ اور وزرار چونکہ اس کے ساختہ پرداختہ ہوتے تھے، لہٰذا وہ بادشاہ کی معین کردہ پالیسی کے اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ وہ اب اپنی حکمتِ عملی کی تشکیل میں رائے عامہ یا پارلیمنٹ کی آزاد رائے کے ملحوظ رکھنے پر مجبور نہیں تھے۔

جارج نے کابینی نظام کے درہم برہم کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے مگر یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ کیبنٹ کے جلسوں کی صدارت کے مسدود شدہ طریقہ کا دوبارہ احیار کرے۔ کیبنٹ کے جلسوں سے بادشاہ کی غیر حاضری کی روایت کچھ اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ اس کو بدلنے کی جارج نے بھی ہمت نہیں کی۔ لیکن اس سے کیبنٹ پر اپنی مرضی اور اپنی حکمتِ عملی مسلّط کرنے میں اسے کچھ دشواری پیش نہیں آئی۔ کیونکہ کیبنٹ میں اب وہ صرف ایسے لوگوں کو ہی جگہ دیتا تھا جو اس کی چشم و ابرو کے اشاروں پر کام کرنے تیار تھے۔ اس نے کابینہ کی اندرونی یکجہتی کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ وزرار میں سے ہر ایک کو شخصی طور پر وہ اپنا وفادار بنانا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ وزرار صرف اس کے سامنے ذمہ دار رہیں۔ قانوناً اس مطالبہ پر کسی کو کچھ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے اس عہد کے سیاست دان جارج کی اس کوشش کے خلاف احتجاج نہیں کر سکے۔ ذمہ داری کا اس وقت جو تصور تھا وہ لارڈ گرینول کے اس جملہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ اس نے سنہ 1761ء میں پٹ سے متعلق کہا تھا کہ "اسے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ اس مجلس (کیبنٹ) میں صرف بادشاہ کے سامنے ذمہ دار ہے۔"

جارج نے تخت نشینی کے ساتھ ہی کابینہ میں ردو بدل کا کام شروع کر دیا۔ اور اس معاملہ میں وزیرِ اعظم سے استمزاج کو بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اس وقت نیوکاسل اور پٹ کی وزارت کارگزار تھی۔ نیوکاسل برائے نام وزیرِ اعظم تھا اور دارالعوام میں حکومت کی اکثریت برقرار رکھنا اس کا کام تھا۔ وہ اس فن میں خوب طاق تھا۔ حقیقی اقتدار پٹ کے ہاتھ میں تھا جس نے جنگ ہفت سالہ میں انگلستان کو نہایت شاندار کامیابیوں سے ہمکنار کیا تھا۔ جارج اس جنگ کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان طاقتور وزرار کی بے دخلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جنگ جاری رہے۔ اس نے ایسے حالات پیدا کئے کہ چند مہینوں میں پٹ کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا، کیونکہ کیبنٹ نے جنگ کے بارے میں اس موقعہ پر اس کی حکمتِ عملی کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس کے قطع نظر بادشاہ نے کیبنٹ میں اپنے ہواخواہوں کو بھرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے لارڈ بیوٹ (LORD BUTE)

کا تقرر عمل میں آیا۔ یہ تقررات اہلیت اور صلاحیتِ کار کی بنا پر نہیں تھے بلکہ ان کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ کیبنٹ کی آزادی کا خاتمہ کر کے اسے بادشاہ کا آلۂ کار بنا دیا جائے۔

غیر مستحکم وزارتیں

بادشاہ کی مداخلت سے مختلف وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ ان میں سے کسی کو ثبات نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پٹ کی علٰحدگی کے چند مہینوں بعد نیوکاسل کو بھی گدی چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد 1770ء تک مختلف وزارتیں تشکیل پاتی رہیں۔ بیوٹ، گرینول، راکنگھم، پٹ ارل آف چیتھم، گرافٹن یکے بعد دیگرے سیاسی افق پر اُٹھے، چمکے اور شہابِ ثاقب کی طرح غائب ہوتے رہے۔ وزارتوں کی اس بے ثباتی کا راز یہ تھا کہ جارج کو ابتداءً کیبنٹ سازی کے کام میں غیر متوقع دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ خدمات، مناصب، عہدے، کنٹراکٹ وظائف، خطابات وغیرہ ان سب ہی چیزوں سے وہ کام لے رہا تھا۔ بعض اوقات تحریص و ترغیب کے ساتھ ساتھ تخویف کے طریقہ کو بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جو لوگ اس کا ساتھ دینے سے گریز کرتے تھے اگر ان پر وار نہ کیا جا سکا تو ان کے ماتحتین اور متوسلین کو نقصان پہنچایا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جارج کو اپنی من بھاتی وزارتیں اور کیبنٹیں نہیں ملتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جارج جن کو کیبنٹ میں لینا چاہتا تھا وہ اس کو قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ انکار دستوری مصالح یا دستوری مجبوریوں کی بنا پر نہیں تھا بلکہ گروپ واری رقابتوں اور مخالفتوں کا نتیجہ ہوا کرتا تھا۔ وہگ لیڈر اس زمانہ میں پھوٹ اور نفاق کا شکار تھے۔ ان کی یہ مخالفتیں شخصی پرخاش اور خود غرضیوں کا نتیجہ تھیں۔ یہ آپس میں مل کر کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں جارج کو کسی ایسی ٹیم کا دستیاب ہونا جس کا ہر فرد اس کا وفادار بھی ہو اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی سخت مشکل تھا۔ بعض اوقات حالات کی مجبوری سے جارج ایسے لوگوں کو بھی کیبنٹ میں شریک کرنے پر مجبور ہوا جن کا وجود اسے سخت ناگوار تھا۔ گرینول اور راکنگھم کی وزارتیں کبھی اس کا اعتماد حاصل نہیں کر سکیں۔ وہ پٹ ارل آف چیتھم کو بار بار وزارت بنانے کی دعوت دیتا تھا مگر متذکرہ بالا مجبوریوں کی وجہ سے 1666ء تک وہ اپنی وزارت نہیں بنا سکا۔ اور جب وزارت بنی تو وہ بھی بے ثبات ثابت ہوئی۔

لارڈ نارتھ کی وزارت

ان غیر مستحکم اور بے ثبات وزارتوں کا سلسلہ 1770ء تک جاری رہا جبکہ لارڈ نارتھ کی سرکردگی میں ایسی کیبنٹ تشکیل پاسکی جو آئندہ بارہ سال تک برابر برسر اقتدار رہی۔ یہ دَور جارج سوم کی شخصی حکومت کا نقطۂ عروج ہے۔ لارڈ نارتھ کی ذات میں جارج کو ایک ایسا آدمی ہاتھ آیا جس کی اسے عرصہ سے تلاش تھی۔ نارتھ بہت معمولی قابلیت کا آدمی تھا۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بادشاہ کا آلۂ کار بننے کے لئے تیار تھا یہ نہیں کہ اسے وزارت یا اقتدار کی ہوس تھی۔ اس کی دیانت داری بھی ہر شبہ سے بالاتر تھی۔ اس اطاعت و فرماں برداری کا راز یہ تھا کہ وہ بادشاہ کو اپنے منصوبوں میں بالکل حق بجانب سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک جارج کی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں سمیٹنے کی کوششیں دستور کے مغائر نہیں تھیں۔ اسی مخلصانہ ایقان نے اسے بارہ سال تک جارج سے وابستہ رکھا۔ پالیسی کا متعین کرنا جارج کا کام تھا۔ نارتھ صرف اس کی عملی آوری کا انتظام کرتا تھا۔ اور دارالعوام میں بادشاہ کے مفادات کا محافظ اور نگہبان تھا۔ پارلیمنٹ کو کنٹرول کرنے کے آرٹ میں وہ یکتا تھا۔ جارج کو ایک اچھا ایجنٹ ہاتھ آیا تھا جو اس کی پالیسیوں کی پارلیمنٹ میں معقول توجیہہ و تشریح کرسکتا تھا۔ وہ ایوان کا لیڈر بھی تھا وہ اس بات کا نگران تھا کہ بادشاہ کے وظیفہ خوار اور نوازے ہوئے ممبر ہر وقت شاہی پالیسیوں کی تائید کے لئے تیار رہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں دارالعوام میں 192 اراکین ایسے تھے جنھیں کسی نہ کسی طریقہ پر خرید لیا گیا تھا۔ غرض جارج نے دارالعوام پر اپنی گرفت سخت کر رکھی تھی۔ ایوان میں حزبِ مخالف موجود ضرور تھا مگر اس میں انتشار کی کیفیت تھی۔ یہ انتشار خصوصاً نیو کاسل کی وزارت کے ٹوٹنے کے بعد سے تیز تر ہوگیا تھا۔ جارج نے اس موقعہ پر بعض سرکردہ وہگ لیڈروں کو ان کے عہدوں سے برطرف کردیا۔ چنانچہ راکنگھم کو لارڈ لفٹینٹ کے عہدہ سے ہٹادیا گیا۔ یہی سلوک بعض اور امراء سے بھی کیا گیا۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے متوسلین کو بھی جنھیں وہگوں نے نوازا تھا ان کی خدمات سے علٰحدہ کردیا گیا۔ جارج کی اس دست بُرد نے وہگوں کے جتھے کو پارلیمنٹ میں بہت کمزور کردیا۔ ان کے خلاف اس کی ریشہ دوانیاں مسلسل جاری رہیں۔ غرض 1770ء تک وہگ اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ وہ جارج کی موثر

مخالفت کے موقف میں نہیں تھے۔ ادھر "نوازشاتِ شاہانہ" سے "بادشاہ کے دوستوں" کی ایک بڑی تعداد دارالعوام میں مہیا ہوگئی تھی۔ ان حالات کے نتیجہ میں لارڈ ناتھ کی وزارت قائم ہوسکی۔ اس وزارت کے قیام سے جارج کو اپنے مقاصد میں یہاں تک کامیابی حاصل ہوئی کہ عملاً وہ اب اپنا آپ وزیرِ اعظم تھا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ اسے اس کے خوابوں کی تعبیر مل چکی تھی۔ پارلیمنٹ بالکلیہ اس کے قبضے میں تھی۔ کیبنٹ اس کے اشاروں پر کام کرتی تھی۔ اور حکومت کی پالیسیوں کا وہ تنہا خالق تھا۔ تقریباً بارہ سال تک یہ صورتِ حال رہی اور اس کے اقتدار کو کوئی دھکا نہیں لگا۔ لیکن اس طرزِ حکومت کا عروج ہی اس کے زوال کا باعث ہوا۔

جارج کی ناکامی

جارج جیسے کمزور صلاحیتوں کے آدمی کا حکومت پر چھا جانا ملک کے لئے کوئی شگونِ نیک ثابت نہیں ہوا۔ اس نے اپنی کم نظری، ناعاقبت اندیشی اور ضد سے قوم کو ایک عظیم مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ امریکی نوآبادیات کی بغاوت نے انگلستان کو ایک طویل اور تباہ کن جنگ کی لپیٹ میں لے لیا۔ 1780ء تک سب پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس جنگ میں انگلستان کے لئے قومی نقصان اور رسوائی کے سوائے کچھ اور حاصل نہ ہوگا۔ اور یہ سب کچھ جارج کی ضد اور احمقانہ پالیسیوں کا نتیجہ تھا، اور یہ بات بھی عیاں ہو چکی تھی کہ جب تک جارج حکومت پر چھایا ہوا رہے گا اس مسئلہ کی کوئی ایسی یکسوئی ممکن نہیں جو قومی وقار کے تحفظ کی ضمانت دے سکے۔ ان حالات نے ملک میں جارج کے خلاف بددلی پیدا کر دی۔ پارلیمنٹ میں بھی مخالفت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ رشوت اور بدعنوانی کی بنیادوں پر قائم کی ہوئی مصنوعی تائید متزلزل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ قوم نے "بادشاہ کی حکومت" کے نتائج دیکھ لئے تھے۔ اور یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ جب تک حکومت کو رائے عامہ کا تابع نہ کیا جائے اس قومی ذلت اور تباہی سے نجات نہیں ملے گی۔ رائے عامہ کے دباؤ کے تحت دارالعوام میں بادشاہ کا اثر کم ہوتا نظر آتا تھا۔ حزبِ مخالف میں دوبارہ زندگی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ امریکی جنگ میں انگلستان کی پیہم ناکامیوں سے جارج کے مخالفین کو خوشی بھی ہوتی تھی اگرچہ یہ شکستیں ایک قومی سانحہ سے کم نہیں تھیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ امریکی پالیسی کی ناکامی

سے ہی جارج کی شخصی حکومت کا جنازہ نکل سکے گا اور قوم کو دوبارہ کابینی نظامِ حکومت کے احیار کا موقعہ ملے گا۔ جس کو جارج کی مزاحمت نے بے جان اور بے اثر کر دیا تھا۔

جارج کی پالیسیوں کی ناکامی کا احساس اور تو اور، خود لارڈ نارتھ کو بھی ہو چکا تھا۔ وہ سنہ 1779ء سے اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ اپنے عہدہ سے دست برداری حاصل کرے۔ مگر جارج کے لئے نارتھ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ادھر پارلیمنٹ میں بادشاہ کے مخالفین اس کی پالیسیوں پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے اور اس کے اثر و نفوذ کو کم کرنے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ سنہ 1780ء میں جان ڈننگ (JOHN DUNNING) نے دارالعوام میں یہ قرارداد پیش کی کہ "تاج کے اثر میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یہ اثر بڑھتا ہی جا رہا ہے اور اس کو ختم کرنا ضروری ہے۔" جارج کے خلاف جو بددلی پیدا ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے یہ قرارداد دارالعوام میں آسانی سے پاس ہو گئی۔ بادشاہ پر حزبِ مخالف کا یہ کھلا حملہ تھا۔ اس قرارداد کی کامیابی جارج پر ایوان کے عدمِ اعتماد کی واضح دلیل تھی۔ ان آثار و علائم کے باوجود جارج سوم ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُدھر دارالعوام میں لارڈ نارتھ کی پوزیشن متزلزل ہوتی جا رہی تھی۔ بادشاہ کی تائید بھی اس کے کچھ کام نہ آئی۔ غرض رفتہ رفتہ حالات ایسے ابتر اور ناسازگار ہو گئے کہ لارڈ نارتھ نے سنہ 1782ء میں استعفیٰ دے دیا۔ بادشاہ نے بادلِ ناخواستہ اسے سبکدوش کیا۔ لارڈ نارتھ کے استعفیٰ کے ساتھ ہی یہ سمجھنا چاہئے کہ جارج کے عہد کا ایک اہم باب ختم ہوا۔ اور اس کی شخصی حکومت کی کوششیں خاک میں مل گئیں۔ جارج کی ناکامی دستوری ترقی کے لئے فالِ نیک ثابت ہوئی۔

لارڈ نارتھ کے استعفیٰ کے بعد حالات ہی بدل گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جس اقتدار کو اس نے بیس بائیس سالہ کوششوں سے اپنی ذات میں مرکوز کر لیا تھا وہ یکایک اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ کوئی تدبیر اس کے بعد کارگر نہیں ہوئی۔ وزارتوں کے بنانے میں اب وہ آزاد نہیں تھا۔ دارالعوام کسی عنوان قابو میں آتا نظر نہ آتا تھا۔ ان حالات میں اسے ایسی کیبنٹیں قبول کرنی پڑیں جن سے وہ سخت متنفر تھا۔ پہلے راکنگھم، بعد میں شیل برن (SHEL BURNE.) نے اپنی وزارت بنائی۔ اگر جارج کا بس چلتا تو انھیں وہ کبھی اقتدار سپرد نہ کرتا۔ مگر وہ بے بس تھا۔ دارالعوام دوبارہ جی اُٹھا تھا۔ یہ وزارتیں اندرونی اختلافات کی وجہ سے دیرپا ثابت نہیں ہوئیں۔ شیل برن کے بعد فاکس اور نارتھ نے اپنی کیبنٹ

بنائی۔ جارج نے ان ناپسندیدہ وزارتوں کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا وہ اب بھی اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کوئی ایسی وزارت بن سکے جو اس کے لئے زیادہ قابلِ قبول ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے دشمنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس وقت حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ وزارت میں فاکس کی شمولیت اسے سخت ناگوار تھی کیونکہ وہ اسی کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

پٹ اصغر

اسی پریشانی کے زمانے میں جارج کی نظریں پٹ (اصغر) پر پڑنے لگیں۔ شیل برن کی کیبنٹ میں وہ وزیر خزانہ رہ چکا تھا۔ لیکن فاکس کی وزارت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا پٹ اگرچہ کم عمر تھا لیکن اس نوعمری ہی میں اُس نے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ وہ پٹ اول آف چیتھم کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اس کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی لی تھی۔ اس اعلیٰ تربیت نے اس کی قدرتی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے۔ وہ مشکل سے اکیس سال کا ہوگا کہ دارالعوام کا رکن بن گیا۔ دارالعوام میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے بہت جلد صفِ اول کے سیاست دانوں میں شمار کیا جانے لگا۔ وہ اپنے باپ کی طرح آتش نوا مقرر نہیں تھا۔ مگر اس کی تقریریں نہایت پُرمغز، معقول اور سلجھی ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ بعد میں اپنے زمانے کا بہترین ماہر مالیات بھی ثابت ہوا۔ غرض اس کم عمری سے ہی اس نے اپنی پختہ کاری کا ثبوت دینا شروع کیا۔ جارج کسی نہ کسی طرح اس کی طرف زیادہ راغب تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دشمنوں سے اسے اگر کوئی نجات دلا سکتا ہے تو وہ صرف پٹ ہے۔ اسی لئے وہ شیل برن کے استعفیٰ کے وقت سے پٹ پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ خود اپنی وزارت تشکیل دے لیکن پٹ اس بات کو ٹالتا رہا۔ وہ کسی مناسب موقعہ کا منتظر تھا۔ نیز یہ کہ ایک دُور اندیش سیاستداں کی طرح وہ رائے عامہ پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وگ لیڈروں کی ہوائیوں ہی بندھی رہے گی۔ قوم اگر ایک طرف جارج کی شخصی حکومت سے متنفر تھی تو دوسری طرف وگوں کی خود غرضیوں مفاد پرستیوں اور گروپ بندیوں سے بھی نالاں تھی۔ ایک صحت مند رائے عامہ ملک میں تشکیل پاتی نظر آتی تھی۔ پٹ کی نظریں ہوا کے بدلتے ہوئے رُخ کو تاڑ چکی تھیں اور وقت کے کسی واضح اشارے کی منتظر تھیں۔

فاکس کی وزارت کی برطرفی

جارج اس انتشار میں فاکس کی وزارت کو برطرف کرنے کے لئے بے چین تھا۔ فاکس کا ایک مسودۂ قانون "فاکس انڈیا بل" (FOX INDIA BILL) دارالعوام میں پاس ہوگیا۔ جارج نے یہ تہیہ کرلیا کہ اس مسودہ کو وہ قانون بننے نہ دے گا۔ دارالامرا میں اس کو ناکام کرانے کے لئے اس نے لارڈ ٹمپل (LORD TEMPLE) کو اپنی طرف سے یہ کہنے کا مجاز گردانا کہ "اس بل کی موافقت میں جو شخص بھی رائے دے گا اعلیٰحضرت اس کو اپنا دوست نہیں بلکہ بدترین دشمن تصور کریں گے"۔ نیز لارڈ ٹمپل کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ اگر وہ ضرورت سمجھے تو اس سے زیادہ سخت اور موثر الفاظ میں بادشاہ کے ان احساسات کی ایوان میں ترجمانی کرے۔ جارج کی اس مداخلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالامرا میں یہ بل مسترد کر دیا گیا۔ بلاشبہ بادشاہ کی قانون سازی میں یہ مداخلت ایک انوکھی چیز تھی۔ اس نوع کی نظیر 1688ء کے بعد مشکل سے ملتی ہے۔ اس کی اس مداخلت کو اس وقت بھی قطعاً غیر دستوری تصور کیا گیا۔ چنانچہ دارالعوام میں اس پر برہمی کا اظہار کیا گیا۔ اور یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ "کسی مسودۂ قانون کی منظوری کو متاثر کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے کسی ایوان میں بھی اس مسودہ سے متعلق بادشاہ کی موافق یا مخالف رائے کی ترجمانی نہ صرف ایک جرم ہے بلکہ تاج کے وقار کے منافی ہے"۔ اس کے دو روز بعد ایک اور قرارداد اس سلسلہ میں منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ "یہ ایوان ہر ایسے شخص کو جو اس مسودہ کی پیش رفت یا منظوری میں رکاوٹ ڈالنے کی بابت اعلیٰحضرت کو مشورہ دے ملک کا دشمن تصور کرے گا"۔ واضح رہے کہ یہ دونوں قراردادیں دارالامرا میں رائے دہی سے پہلے منظور کی گئیں مگر اس کے باوجود دارالامرا نے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اس کو مسترد کر دیا۔ جارج نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور دارالعوام میں اکثریت یا اقلیت کا لحاظ کئے بغیر فاکس اور نارتھ کی وزارت کو برطرف کر دیا اور پٹ اصغر کو دعوت دی کہ وہ اپنی کابینہ بنائے۔ پٹ نے جارج کی یہ درخواست قبول کرلی۔

تیرھواں باب

پٹ کی وزارت اور کابینی ارتقا

جارج سوم (2)

پٹ اصغر کی وزارت

دسمبر 1783ء میں پٹ نے جارج کی دعوت پر اپنی حکومت تشکیل دی۔ اس وقت وہ مشکل سے پچیس سال کا تھا۔ اس کم عمری میں اس کا وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہونا اس کے ہمعصروں کے لیے حیرتناک ثابت ہوا۔ کیسے کیسے خرانٹ اور تجربہ کار سیاست دان اس وقت موجود نہ تھے۔ ان سب کو نظر انداز کرکے جارج کا پٹ کو اقتدار سونپنا اس کے دشمنوں کے لیے سرمایۂ تفریح و تضحیک بن گیا۔ پارلیمنٹ تضحیک و استہزا کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ طرح طرح کے آوازے کسے گئے۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ یہ وزارت زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گی عام طور پر لوگ اسے ایک محیر العقول تماشا تصور کرتے، لطف اٹھاتے اور ہنستے تھے "جارج نے سلطنت بچوں کے سپرد کردی ہے۔ یہ کھیل کتنے دن چلے گا؟" "کرسمس کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا" "کم سن بچے وزارت سازی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ انھیں اسکول کیوں نہ بھیج دیا جائے" غرض یہ اور اس قسم کے ہزاروں تضحیک آمیز لطائف کے ساتھ پٹ کی وزارت کا خیر مقدم کیا گیا۔ مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ "طفلِ ناپختہ کار" جس پر آج وہ ہنس رہے تھے ایک مردِ آہن ثابت ہوگا۔

پٹ نے وہگ ماحول میں آنکھ کھولی تھی مگر وہ ٹوری مسلک کا پیرو تھا۔ اس کے

برسر اقتدار آنے سے انگلستان میں دوبارہ ٹوریوں کو عروج حاصل ہوا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ ٹوری جو 1714ء سے عملاً حکومت سے بے دخل ہوگئے تھے اب پھر زمام حکومت ان کے ہاتھ میں آئی۔ پٹ نے ٹوری پارٹی کو ایک ترقی پسند رنگ دینے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کی سرکردگی میں جو ٹوری پارٹی وجود میں آرہی تھی اس کا رنگ ڈھنگ بالکل جداگانہ تھا۔ ایک لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ اگرچہ پٹ، بالنگ بروگ جیسے سیاست دانوں کا جانشین تھا مگر اس نے ٹوری طرز فکر میں بہت تبدیلی پیدا کردی۔ ٹوری اب کیبنٹ طرز حکومت کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ حالانکہ کیبنٹ جو کچھ بھی تھی وہ تمام تر وہگوں کا عطیہ تھی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ پٹ کے زمانے میں پھر سے کیبنٹ غیر محسوس طریقہ پر ترقی کرنے لگی۔ جارج کے اچانک حملے سے اس کی ترقی میں جو رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی، وہ اب دور ہوتی نظر آتی تھی ٹوری اب اس بات کے خواہش مند نہیں تھے کہ حکومت کی کل بالکلیہ بادشاہ کے قبضہ میں ہو۔ کیبنٹ کو پہلے کی طرح وہ اب غاصب ادارہ نہیں سمجھتے تھے۔ ٹوری مسلک کی یہ تبدیلی پٹ کی کوششوں کی رہین منت ہے۔

پٹ کی مشکلات اور کامیابی

پٹ نے وزارت تو بنائی مگر آئندہ تین چار مہینوں تک اسے نہایت ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ دارالعوام میں اسے قدم قدم پر شکستیں ہوئیں۔ اس کے مخالفین اس وقت بھاری اکثریت میں تھے۔ مگر پٹ یہ جانتا تھا کہ دارالعوام اس وقت قوم کی صحیح نمائندگی سے قاصر ہے۔ اس لیے اس نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ وہ رائے عامہ کا اچھا نباض تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد رائے عامہ کے سیلاب کے مقابلہ میں دارالعوام کی خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ مخالفتیں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔ وہ قوم کے سامنے پروانۂ حکومت حاصل کرنے کے لیے جانا ضرور چاہتا تھا مگر مناسب اور موزوں وقت کا منتظر تھا۔ چنانچہ مارچ 1784ء میں اس نے بالآخر پارلیمنٹ برخواست کرادی اور نئے انتخابات منعقد کرائے۔ پچھلے چند مہینوں میں جارج نے پٹ کی کامل تائید کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عرصہ میں پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود محض شاہی تائید کے بل بوتے پر پٹ نے اپنے آپ کو برسراقتدار رکھا۔ مگر پٹ کا یہ منشا نہیں تھا کہ وہ محض بادشاہ کی حمایت اور تائید کو

اپنی سپر بنا رکھے ۔ وہ دوسرا لارڈ نارتھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ دشواریاں محض عارضی ہیں۔ اور یہ کہ جب وہ قوم کے سامنے جائے گا تو اسے بھرپور قومی تائید ملے گی اور وہگ کہیں کے نہ رہیں گے۔

پٹ کا یہ تجزیہ بالکل درست ثابت ہوا۔ متعدد سرکردہ وہگ لیڈروں کی چیخ و پکار کے باوجود 1784ء کا انتخاب پٹ کے لئے ایک عظیم الشان کامیابی کا باعث ہوا۔ فاکس کے متبعین اور پیرو اس سیاسی جنگ میں بڑی تعداد میں کھیت رہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ "فاکس کے شہیدوں" کی تعداد اس انتخاب میں ایک سو ساٹھ سے زیادہ تھی۔ غرض اس انتخاب نے پٹ کے مخالفین کا قلع قمع کر دیا۔ اور دارالعوام میں اسے بھاری اکثریت حاصل ہو گئی۔

اس کامیابی میں بلاشبہ شاہی اثر و نفوذ اور "نوازشات" کے پرانے طریقے کو بھی دخل تھا۔ مگر پٹ کی کامیابی کو محض "شاہی اثرات" کا نتیجہ سمجھنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔ وہگوں نے اپنے زمانے میں الکشن بازی کی جو مشین تیار کی تھی، اس سے اس وقت بلا دریغ کام لیا گیا۔ مگر صرف یہی چیز اتنی بھاری اکثریت کی ضامن نہیں ہو سکتی تھی۔ پٹ نے اپنی دیانت داری، خلوص اور سنجیدگی کا ایک مختصر عرصہ میں ہی قوم پر ایسا سکہ بٹھایا تھا کہ وہگوں پر اس کی کامیابی یقینی ہو گئی تھی۔ پٹ اس کے بعد سے ایک طرف پارلیمنٹ پر اور دوسری طرف پارلیمنٹ کے باہر رائے عامہ پر ایسا چھا گیا کہ یہ دونوں اس کا ساتھ دینے کے لئے ہر وقت تیار تھے۔ اور تقریباً سترہ سال تک ان دونوں گوشوں نے اسے ایسی تائید اور قوت ملتی رہی کہ وہ بلا کسی دشواری کے اس عرصہ میں حکومت پر قابض رہا۔ اس نکتہ کو جارج سوم نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے عملاً اس نے بھی اس کے آگے اپنی سپر ڈال دی۔ یہ نہیں کہ جارج خوشی سے اپنا اقتدار اب اپنے وزیر اعظم کو سپرد کرنے تیار تھا۔ ہرگز نہیں۔ وہ اب بھی یہی سمجھتا تھا کہ حکومت کا حقیقی اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ پٹ کی دانشمندی اور پُرکاری کا کمال یہ تھا کہ جارج کو کبھی یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ وہ اقتدار سے محروم کر دیا گیا ہے۔ پٹ اس کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نازبرداریاں سہہ لیتا اور اس کی ضد اور ہٹ کے مقابلے میں اکثر نرم رویہ اختیار کرتا۔ ادھر جارج کو یہ بھی احساس تھا کہ پٹ اس کے لئے ایک آیۂ رحمت ہے۔ اگر اس سے مخالفت ہو جائے تو پھر وہ جائے کہاں۔ دوسری متبادل صورت صرف فاکس کی وزارت تھی لیکن اس کا تصور بھی اس کو گوارا نہ تھا۔

کابینہ کی غیر مسلّمہ حیثیت

بلاشبہ 1784ء میں پٹ کی شاندار کامیابی سے کابینی ترقی کی شاہراہ دوبارہ کھل گئی۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں 1760ء سے حایل ہو گئی تھیں وہ رفتہ رفتہ دور ہونے لگیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کابینی حکومت تمام و کمال اس دور میں رائج ہو گئی۔ یا یہ کہ اس عہد کے لوگ اس نظام سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی یہ ارتقا پذیر حالت میں تھا، اگرچہ انگلستان میں اس پر عمل درآمد کا سلسلہ ضرور قائم تھا۔ لیکن اس بات کے ماننے میں کسی قدر تامل ہوگا کہ خود انگلستان کے لوگ اس کو دستور کا ایک لازمی جزو تصور کرنے لگے تھے۔ یا دستوری حکومت کی ایک نئی شق یا صنف کی حیثیت سے اسے تسلیم کر چکے تھے۔ اس طرزِ حکومت پر عملاً کاربند ہونے کے باوجود اس کو انگلستان کے مدبر اور سیاست دان کوئی ایسا ممیز اور مسلّمہ نظام نہیں سمجھتے تھے کہ اسے کسی نئے دستور کی تدوین کے سلسلہ میں کام میں لائیں۔ اس حقیقت کی جانچ کا موقعہ 1791ء میں پیش آیا۔ کینیڈا کی نو آبادی کے لئے ایک نئے دستور کی تشکیل و تدوین کا مسئلہ درپیش تھا۔ پارلیمنٹ میں اس سلسلہ میں جو بحثیں ہوئیں ان سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ لوگ کینیڈا کو کم و بیش اسی قسم کا نظامِ حکومت عطا کرنا چاہتے تھے جو اس وقت انگلستان میں مروج تھا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ اس نئے دستور کے بنانے میں کابینی نظام کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ نہ تو یہاں کوئی "ذمہ دارانہ وزارت" قائم کی گئی اور نہ کابینی نظام کے دیگر بنیادی خد و خال کا اس میں کوئی لحاظ رکھا گیا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کابینی نظامِ حکومت کو لوگ ابھی سمجھ نہیں پائے تھے۔ اور اسے دستور کی ایک نئی شق کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا تھا۔

کیبنٹ طرزِ حکومت کے غیر متعارف ہونے کی ایک اور مثال امریکی دستور سے ملتی ہے۔ اس کی تدوین 1787ء میں عمل میں آئی۔ انگلستان میں پٹ کی وزارت کو قائم ہوئے تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ امریکہ کے جو مدبر اور سیاست دان اس دستور سازی میں منہمک تھے وہ انگلستان کے آئینِ حکومت سے ناواقف نہیں تھے۔ یہی نہیں بلکہ بڑی حد تک وہ اپنے سیاسی ادارات کو انگلستان کے طرز پر ہی ڈھالنا چاہتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ امریکی دستور پر ان ادارات کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن جس چیز پر ان کی نظر

نہیں پڑ سکی وہ انگریزی طرز کی کابینہ ہے جو اس وقت پٹ کی سرکردگی میں خاموشی سے تمام حکومتی اختیارات کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھی۔ اور جارج کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ برخلاف اس کے انھوں نے یہی دیکھا کہ عاملانہ اختیارات بادشاہ کے ہاتھ میں ہیں، اور پارلیمنٹ قانون سازی کا کام انجام دیتی ہے۔ اسی دھوکہ میں انھوں نے اپنے دستور کی بنیاد مانٹسکیو (MONTESQUIE) کے "نظریۂ تفریق اختیارات" پر رکھی جس کو غلطی سے وہ انگلستان میں بھی جاری وساری سمجھتے تھے۔ کابینی طرز حکومت کے غیر متعارف ہونے کا یہ بین ثبوت ہے ورنہ اغلب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امریکی دستور اس کو اپنانے کی کوشش ضرور کرتا کیونکہ اس سے عاملہ کو مقننہ کے تابع اور اس کے سامنے ذمہ دار رکھنے کا بہترین حل ہاتھ آیا تھا۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کے حل کرنے کے لئے امریکی دستور سازوں نے بہت سوچ بچار کیا مگر ان کی رسائی کابینی طرز حکومت تک نہیں ہوئی۔ اسی لئے "ذمہ داری" کے نافذ کرنے کے لئے انھوں نے "مواخذہ" کے طریقے کو جزو دستور بنالیا۔ مواخذہ کا تصور راست انگلستان سے لیا گیا تھا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ کابینی ترقی نے خود انگلستان میں اس کو غیر ضروری اور از کار رفتہ بنا دیا تھا۔

کیبنٹ کا تدریجی ارتقاء

اُوپر کی مثالیں کیبنٹ کے غیر معروف اور غیر متعارف ہونے کا ثبوت ضرور ہیں مگر اس سے اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا کہ یہ ادارہ پٹ کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے روز افزوں طاقت اور توانائی حاصل کرتا جا رہا تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ ان کے منجملہ پٹ کی طویل سترہ سالہ رہنمائی اور قیادت اس ادارہ کی مسلسل اور تدریجی ترقی کی ضامن ثابت ہوئی۔ جارج سوم کو رام کرنا آسان نہیں تھا لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا معاملات سلطنت سے اس کو دست کشی اختیار کرنی پڑی۔ 1783ء سے پہلے کے طرز حکومت کی طرف لوٹنا اب ناممکن تھا۔ وہ اب بھی کبھی کبھی ضد اور ہٹ سے کام لیتا، تقررات میں مداخلت کی کوشش کرتا یا کسی مخصوص پالیسی کے بارے میں اپنے وزراء سے سخت اختلاف کرتا اور انھیں تشنیع و تعریض کا مورد بناتا تھا۔ مگر یہ سب باتیں روزمرہ کا عمل درآمد نہیں بلکہ استثنائی حیثیت کی حامل تھیں۔ پٹ اپنے مذاق اخلاق اور شخصی وجاہت

سے ان موقتی مشکلات پر قابو پالیتا تھا۔ اِدھر جارج کو مطمئن بھی کرلیتا اور اُدھر اقتدار کی باگ اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ پٹ کی اسی صلاحیت کو اس کی کامیابی اور کیبنٹ کی ترقی کا راز سمجھنا چاہئے۔ جارج جیسے جیسے عمر لیتا گیا خرابیٔ صحت کی وجہ سے قابلِ رحم ہوتا گیا۔ اس کو شروع سے دماغی کمزوری کا عارضہ لاحق تھا۔ بعد میں تو اس پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ اور کبھی کبھی تو یہ اتنے طویل عرصہ تک بادشاہ کو نکما کر دیتے تھے کہ حکومت کے تمام معاملات وزیرِ اعظم اور کیبنٹ کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتے چلے گئے۔

پٹ نے اپنے ساتھی وزراء کو بھی پوری طرح اپنے قابو میں رکھا۔ اس نے "محکمہ واری وزارت" کے تصور کو مٹانے کی کوشش کی جو لارڈ نارتھ کے زمانہ تک بھی قائم تھا۔ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ ہر وزیر اپنے محکمہ کا مالک و مختار ہے اور اپنے افعال کے لئے صرف بادشاہ کے سامنے ذمہ دار ہے۔ اس سے کیبنٹ کی یکجہتی اور وزراء کی وزیرِ اعظم سے وفاداری کے تصور کو نقصان پہنچتا تھا۔ پٹ نے اس بات پر اصرار کیا کہ تمام وزراء اسے اپنا قائد تصور کریں۔ اور ان کی پہلی ذمہ داری وزیرِ اعظم کے سامنے ہو۔ کوئی وزیر راست بادشاہ سے ربط پیدا نہ کرے۔ بادشاہ اور کیبنٹ کے ارکین کے درمیان واحد رابطہ وزیرِ اعظم کی ذات ہو۔ بعض اوقات کیبنٹ کی یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لئے اسے سختی سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ لارڈ تھرلو (LORD THURLOW.) کو 1792ء میں اس نے کیبنٹ سے برطرف کرانے میں کامیابی حاصل کی کیونکہ وہ کیبنٹ میں ہوتے ہوئے پارلیمنٹ میں پٹ کی مخالفت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سابق وزراء اکثر علحدگی کے بعد بھی اپنے آپ کو کیبنٹ کا رکن تصور کرتے تھے۔ اور کیبنٹ کے جلسوں میں شرکت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں اس بات پر اصرار کیا گیا کہ صرف ایسے اشخاص کیبنٹ کے جلسوں میں شرکت کرسکتے ہیں جو کسی نہ کسی کابینی عہدے پر فائز ہوں۔ کوئی دوسرا شخص اس کی پچھلی حیثیت کچھ بھی سہی اس قسم کی رکنیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

غرض ان مختلف اور متعدد تدبیروں سے پٹ نے کابینی نظام کو ۔ ہ زندگی بخشی اور ایسی مستحکم روایتیں قائم کرگیا جنھیں توڑنا آسان نہ تھا۔ مسلسل عمل درآمد سے اب یہ بات دستوری روایت بنتی جارہی تھی کہ بادشاہ کیبنٹ کی اختیار کردہ پالیسی سے اختلاف نہیں کرے گا۔ اس معاملہ میں تضاد یا تصادم کے امکان کو موہوم کردیا گیا تھا لیکن

الحاق آئرلینڈ کے بعد کیتھولکوں کو آزادی عطا کرنے کے مسئلہ پر جارج کو پٹ سے شدید اختلاف پیدا ہوگیا۔ یہ پٹ کی وزارت میں پہلا موقعہ تھا کہ وہ جارج کی نیم مجنونانہ ضد پر قابو نہ پاسکا۔ اور اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ وہ اپنا استعفیٰ پیش کردے۔

پارلیمانی اصلاح کا مسئلہ

پٹ اگرچہ ٹوری تھا مگر اس کی دوربین نگاہیں اس بات کو تاڑ چکی تھیں کہ جدید جمہوری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی اصلاح ازبس ضروری ہے۔ پارلیمنٹ نے گزشتہ ایک سو سال میں نظام حکومت میں جو مقام پیدا کرلیا تھا اس کو اب کسی گوشہ سے بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی برتری اور سیادت مسلّم تھی۔ مملکت میں اس کے اقتدار کا کوئی دوسرا ادارہ حریف نہیں تھا۔ جہاں پارلیمنٹ نے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں سمیٹا تھا وہیں یہ بات اب سب کو کھٹکنے لگی تھی کہ وہ قوم کی صحیح معنوں میں نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ دارالعوام میں جو لوگ نشست رکھتے تھے ان میں سے اکثر نہ تو آزادانہ طریقہ سے منتخب ہوتے تھے اور نہ ایوان میں اپنی آزاد رائے کا استعمال کرسکتے تھے۔ تنخواہوں وظیفوں اور مشاہروں کے ذریعہ سے ان کا ضمیر خرید لیا جاتا اور ان کا منہ بند کردیا جاتا تھا۔ پٹ نے سب سے پہلے ایسے بہت سے عہدوں کا صفایا کردیا جو صرف اراکین کو خریدنے کے لئے وجود میں لائے گئے تھے۔ اسی ضمن میں اس نے محکمۂ مالگزاری کے عمّال کو حق رائے دہی سے محروم کردیا۔ یہ ایک انبوہِ کثیر تھا۔ ہر آٹھ رائے دہندوں میں ایک رائے دہندہ مالگزاری کے عملہ سے متعلق تھا۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کے موقعہ پر وہ حکومت کے نامزد کردہ امیدواروں کو منتخب کرتے تھے۔ ان اصلاحات سے حالت کچھ سُدھرتی ضرور معلوم ہوتی تھی مگر پارلیمانی بدعنوانیوں کا مسئلہ ایسا ہمہ گیر، پیچیدہ اور کٹھن تھا کہ پٹ کی ان کوششوں کو اس دشوار گزار راہ پر صرف پہلا قدم سمجھا جاسکتا ہے۔

اس سے زیادہ اہم مسئلہ پارلیمنٹ کو صحیح معنوں میں نمائندہ حیثیت کے عطا کرنے کا تھا۔ طاقتور مفادات کی جانب سے اراکین کی نامزدگی سیاسی زندگی کی سب سے بڑی لعنت تھی۔ اور ملک میں نشستوں کی تقسیم ہر معقولیت پسند اصول کی نفی کرتی تھی۔ جیبی شہر

(POCKET BOROUGH) اور "ویران شہر" (ROTTEN BOROUGH) انتخابات کو مضحکہ خیز بنائے ہوئے تھے۔ ان خرابیوں کی طرف ایک عرصہ سے قوم کی توجہ مبذول ہوچکی تھی اور بعض ترقی پسند سیاسی لیڈر، پارلیمانی اصلاح کو ناگزیر سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ پٹ ارل آف چیتھم نے 1770ء میں اور ڈیوک آف رچمنڈ نے 1780ء میں اس تعلق سے اپنی اپنی تجویزیں پیش کیں مگر انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پٹ وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہونے سے پیشتر کم از کم دو مرتبہ اس مسئلہ کو پارلیمنٹ کے سامنے لایا۔ اور 1785ء میں کچھ اور تجویزیں پیش کیں مگر اس کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ بظاہر پارلیمنٹ اپنی اصلاح کے لئے تیار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ جب کبھی یہ مسئلہ سامنے آیا پارلیمنٹ میں اس کے تعلق سے سرد مہری اور مخالفت پائی گئی۔ گو ملک میں عام طور پر اصلاح کے تعلق سے کافی گرمجوشی پائی جاتی تھی مگر پارلیمنٹ اس سے متاثر ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ پارلیمنٹ اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ وہ اپنی ترتیب و تنظیم میں کسی اصلاح کی محتاج ہے یا یہ کہ اس کی موجودہ ہیئتِ ترکیبی استقام اور کمزوریوں سے پُر ہے۔ غرض پارلیمنٹ کچھ تو مفاداتِ حاصلہ کے زیرِ اثر، اور کچھ انتہائی نیک نیتی کے ساتھ اصلاح کے تصوّر کو قبول کرنے تیار نظر نہ آتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں اپنے موجودہ وجود کو اصلاح کی چتا کے سپرد کرنے کے لئے تیار نہیں تھی اور نہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار تھی کہ ان خامیوں سے پاک ہونے کے لئے اسے کوئی نیا جنم لینا پڑے گا۔

انقلابِ فرانس کے اثرات

یہ مسئلہ ابھی لیت و لعل میں تھا کہ فرانسیسی انقلاب نے تمام ترقی پسند تحریکوں کو کچل کر رکھ دیا۔ انقلابِ فرانس کا سب سے بُرا اثر پارلیمانی اصلاح کے مسئلہ پر پڑا۔ رُود بار کے اس پار اصلاحی تحریک نے جو تباہیاں مچائیں اس سے انگلستان میں اصلاح کے نام سے ہی لوگ خوف زدہ ہونے لگے۔ اور تو اور پٹ جیسا ترقی پسند مدبّر بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ اس نے پارلیمانی اصلاح کے مسئلہ کو پسِ پشت ڈالنے کی کوشش کی۔ ملک میں ترقی پسند اور اصلاحی تحریکوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ اس شک و شبہ کی فضا میں بعض جرأت مند سیاست داں اب بھی ایسے موجود تھے، جو اس مسئلہ کی تائید سے باز آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پارلیمانی اصلاح

ان حالات میں اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ اصلاح کے دروازے بند کرنے سے ہی انقلابی قوتوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ انقلاب کو روکنے کا بہترین طریقہ اصلاح ہے نہ کہ اس سے روگردانی۔ چنانچہ گرے اور اس کے ساتھی پارلیمنٹ میں برابر اصلاح کے لئے تجاویز اور تحریکات پیش کرتے رہے۔ اٹھارویں صدی کے آخری دہے میں کم از کم تین مرتبہ گرے نے اس قسم کی تحریکات پیش کیں مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ خود پٹ نے سخت مخالفت کی اور صاف کہہ دیا کہ "ان حالات میں ان مسائل پر غور کرنا خطرے سے خالی نہیں"۔

انقلاب فرانس کم وبیش ربع صدی کے لئے دستوری ترقی کی راہ میں حائل رہا۔ انگلستان میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ انقلاب کے خلاف نفرت اور بیزارگی کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ حالانکہ اس کی ابتدائی منزلوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ ملک بھر میں اس کے مقاصد کے لئے ایک گرم جوشانہ تائید پائی جاتی تھی اور اسے فرانس کے عوام کی ایک جائز جدوجہد قرار دیا گیا۔ یہ امید بھی کی جانے لگی کہ اس کے نتیجہ میں فرانس ایک شاندار مستقبل کی طرف گامزن ہوگا۔ شاہی آمریت اور مطلق العنانی کی لعنتیں ختم ہوجائیں گی اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جو انسانی مساوات اور قانون کی حکمرانی کا علمبردار ہوگا۔ مگر بہت جلد یہ تائید اور گرمجوشی کے جذبات خوف وہراس میں تبدیل ہونے لگے۔ کیونکہ انقلاب نے رفتہ رفتہ ایک خونین روپ دھارنا شروع کیا۔ صبح وشام وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ اقتدار ایسے انتہاپسند گروہوں کے ہاتھ میں آگیا جو تعمیر سے زیادہ تخریب کی طرف مائل تھے اور جن کی خون آشامی نے فرانس میں ایک قیامت صغریٰ بپا کر رکھی تھی۔ ہمسایہ قوموں کو یہ تباہ کاریاں خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھیں۔ لیکن جب فرانس کے انقلابیوں نے اعلان کیا کہ وہ دوسرے ممالک میں بھی انقلاب کے برپا کرنے کے لئے وہاں کے عوام کی ممکنہ تائید کریں گے تو قدرتی طور پر انگلستان میں اور دوسرے ممالک میں بھی خوف وتشویش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ برک (BURKE) نے بہت پہلے ہی انقلاب کے خطرناک امکانات کو اپنی مشہور کتاب "انقلاب فرانس" میں واضح طریقہ سے بیان کیا تھا۔ اس نے اس کے گھناؤنے نتائج کی جتنی پیش گوئیاں کی تھیں وہ ایک ایک کرکے صحیح ثابت ہورہی تھیں۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ پہلی ہی اشاعت میں ہزاروں کاپیاں بک گئیں، لیکن مانگ میں کمی نہیں ہوئی۔ برک کے خیالات سے اہل انگلستان

بہت متاثر ہوئے اور عام طور پر ان حالات میں ترقی پسندی مشکوک اور رجعت پسندی حُبّ الوطنی کے مترادف سمجھی جانے لگی۔

1793ء میں فرانس نے انگلستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ حکومت اس زمانے میں بیرونی دشمن سے زیادہ اندرونی خلفشار کے امکانات سے بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسی گھبراہٹ کے عالم میں قومی سلامتی کے لئے متعدد قوانین پاس کئے گئے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جن سے انگلستان کے صدیوں پرانے سماج کی روایتی آزادیاں مجروح ہوگئیں۔ غیر ملکیوں اور اجنبیوں کی نگرانی کے لئے "قانون اجانب" (ALIEN ACT.) پاس کیا گیا۔ "قانون رہائی از حبسِ بے جا" (HABEAS CORPUS ACT) معطّل کر دیا گیا۔ ایک نیا "قانونِ غداری" پاس کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ملزمین کو سزا دینے میں ججوں کو زیادہ دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مختلف قسم کی انجمنیں اور سوسائٹیاں خلافِ قانون ٹھیرائی گئیں۔ حالانکہ ان سے امنِ عامہ کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جلسوں اور جلوسوں پر امتناع اور صحافت پر پابندیاں عاید کی گئیں۔ اہلِ قلم کی نگارشات اور تحقیقات کی سختی سے جانچ پڑتال کی جانے لگی۔ غرض بغاوت اور بدامنی کا ہوّا قومی ذہن پر اتنا چھایا ہوا تھا کہ اگر ایک طرف حکومت سراسیمہ اور خوف زدہ تھی تو دوسری طرف عوام ہر پتّے کی آڑ میں ایک باغی اور ایک غدّار کو چھپا ہوا پاتے تھے۔ اس دہشت زدگی کی حالت میں نہ جانے کتنے ناکردہ گناہ لوگ، انصاف کے نام پر جیلوں میں ٹھونسے گئے اور کتنے موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ عدالتیں اس قومی جنون کے آگے بے بس تھیں۔ اور قضاۃ انتہائی کمزور شہادتوں پر سخت ترین سزائیں کے نافذ کرنے پر مجبور تھے۔ غرض موقتی طور پر انگلستان کے حق میں انقلاب کے نتائج نہایت مضرت رساں ثابت ہوئے۔

اس کے قطع نظر پارلیمنٹ بھی خوف و ہراس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اس میں حکومت کی مخالفت کو بُری نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ عام تاثّر یہ تھا کہ قوم اس وقت انتہائی خطرناک دَور سے گزر رہی ہے۔ اس عظیم قومی آزمائش کے موقعہ پر اتحاد اور یکجہتی میں کسی قسم کا بھی رخنہ پیدا کرنا غدّاری کے مترادف ہوگا۔ اس ذہنی کیفیت نے قدرتی طور پر پارلیمنٹ میں حزبِ اختلاف کی پوزیشن بہت نازک کر دی۔ حکومت کی پالیسیوں پر ایماندارانہ تنقید و تعریض بھی قوم دشمنی پر محمول کی جانے لگی۔ یوں تو 1784ء

کے بعد سے پٹ کو دارالعوام میں کافی اکثریت حاصل رہی، مگر انقلاب فرانس کی دہشت آفرینیوں نے پارلیمنٹ میں حکومت کے سیاسی مخالفین کی آواز کو بہت کمزور کردیا۔ یہی نہیں بلکہ اعتدال پسند وہگوں کی ایک بڑی تعداد اپنی پارٹی سے روگرداں ہوکر عملاً ٹوریوں سے جا ملی۔ اس سے حکومت کے دست و بازو اور بھی مضبوط ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مشترکہ قومی خطرہ کے خوف نے سیاسی پارٹیوں کے باہمی امتیاز اور اختلاف کو بڑی حد تک مٹا دیا تھا۔ بظاہر سیاسی پارٹیاں عملاً مفقود ہوگئی تھیں، سب ہی ایک رنگ میں رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے سیاسی پارٹی بندی کے اس تعطل نے فاکس (.FOX) جیسے بے باک اور آزاد خیال لیڈر اور اس کے مٹھی بھر پیرووں کے لئے ان مخالف حالات میں سرگرم عمل رہنا مشکل کردیا۔ مگر فاکس بڑا جانباز مجاہد تھا۔۔ وہ مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اس وقت بھی حکومت پر حسب ضرورت کڑی تنقید سے باز نہیں آتا تھا۔ اظہار خیال کی آزادی کا وہ ہمیشہ بڑی بے باکی سے استعمال کرتا رہا۔ دارالعوام میں مشکل سے پچاس ارکین اب اس کی پارٹی سے وابستہ تھے۔ انقلاب فرانس کی سب سے بڑی زد وہگ پارٹی پر پڑی، یہ پارٹی بجا طور پر ترقی پسندی اور لبرل خیالات کی علمبردار سمجھی جاتی تھی اور قدامت پرستی اور رجعت پسندی کی مخالف۔ مگر اس وقت حالات ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ " اصلاح " اور " تغیر " کا نام لینا بھی ملک دشمنی کے اتہام کو اپنے سر لینے کے برابر تھا۔ اس ناموافق ماحول میں یہ فاکس کی ہی شخصیت تھی جو وہگوں کو پارہ پارہ ہونے سے بچا سکی۔ اس لحاظ سے فاکس نے ایک طرف وہگ پارٹی کی تنظیم جدید کرکے اسے آئندہ لبرل تحریکات کی علمبرداری کے لئے تیار کیا تو دوسری طرف پارلیمنٹ میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھ کر " پارٹی گورنمنٹ " کا انگلستان میں جو نظام ترویج پا رہا تھا اس کو مٹنے سے بچا لیا۔ فاکس کا یہ کارنامہ بے مثل ہے۔ یہ اسی کی ہمت اور بے جگری کا نتیجہ تھا کہ ترقی پسندی کی ناؤ غرقاب ہونے سے بچ گئی اور ملک میں آزادئ خیال کی شمع برابر روشن رہی۔ یہ نہیں کہ پٹ یا اس کی پارٹی کی جانب سے اس عظیم ورثہ کو کوئی خطرہ تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ فاکس کی جدوجہد کے بغیر وہگوں کی ترقی پسندی کی روایات کو نقصان پہنچ جاتا۔ اور جو شمع ان کے پیش رووں نے روشن کر رکھی تھی اس کی لو کچھ ماند پڑ جاتی۔

جمہوری رجحانات

پٹ کے زمانے میں اگرچہ پارلیمنٹ کی کوئی اصلاح نہ ہوسکی لیکن ملک میں جمہوری قوتیں برابر متحرک اور سرگرم عمل رہیں۔

حکومت ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں بھول سکتی تھی کہ وہ صرف پارلیمنٹ کے سامنے ہی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اس کی وسیع تر ذمہ داری عوام کے سامنے بھی ہے۔ عوام نہ صرف اس کی کارکردگی کا ہر وقت احتساب کر سکتے تھے، بلکہ اپنے فیصلوں کو اس پر مسلّط کر سکتے اور ان کی عمل آوری کے لئے اس کو مجبور کر سکتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ رائے عامّہ کی طاقت اور اثر پذیری میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جارج دوم کے زمانہ سے سیاسی زندگی میں رائے عامّہ ایک نئی جمہوری طاقت کے روپ میں منظرِ عام پر آنے لگی تھی۔ جب کبھی اس کا غیر مبہم طریقہ پر اظہار ہوتا حکومت اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر پارلیمنٹ کو بھی ایک ثانوی حیثیت حاصل ہو جاتی۔ جارج دوم کا 1757ء میں پٹ (اکبر) کو کیبنٹ میں شریک کرنے کے لئے رضامند ہونا اسی طاقت کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا۔ جارج پٹ (اکبر) کا دشمن تھا۔ وہ پٹ کو کیبنٹ میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا مگر رائے عامہ کے دباؤ کے آگے اس کو اپنی مخالفت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اسی حقیقت کو ڈاکٹر جانسن نے ان الفاظ میں ادا کیا تھا کہ "والپول ایک ایسا وزیر تھا جسے بادشاہ نے عوام کو دیا تھا اور پٹ ایسا کہ عوام نے بادشاہ کو عطا کیا"۔ جارج دوم یہ نکتہ پا چکا تھا کہ عوام کی رائے جب کسی مسئلہ کے بارے میں واضح اور غیر مبہم طریقہ سے ظاہر ہو جاتی ہے تو پارلیمنٹ کی رائے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے پٹ سے کہا تھا کہ "یہ بات میں نے تم سے ہی سیکھی ہے کہ مجھے اپنی رعایا کی مرضی کی تلاش پارلیمنٹ کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر کرنا چاہئے"۔ یہ جمہوری رجحانات جو ایک عرصہ پہلے پیدا ہو چکے تھے اور ملک کی سیاسی زندگی میں کارفرما تھے ان میں انقلابِ فرانس کی سراسیمگیوں نے بھی کوئی انحطاط پیدا نہیں کیا۔ پٹ کی حکومت نے بہ حالتِ جنگ قومی نظم و ضبط اور امنِ عامّہ کی برقراری کے لئے جو سخت گیر رویّہ اختیار کیا اور ایسے قوانین نافذ کئے جو بظاہر جمہوری ترقی کے منافی نظر آتے ہیں، ان کی بنیاد بھی عام قومی احساسات اور رجحانات پر رکھی گئی تھی۔ ان اقدامات کے پیچھے قومی تائید کی کامل پشت پناہی تھی۔

صحافت، رائے عامّہ اور پارلیمانی رازداری

اٹھارویں صدی میں جمہوری رجحانات کو صحافت کی ترقی سے بہت مدد ملی۔ رائے

عامہ کی تشکیل میں اخبارات، رسائل اور جرائد نے بڑا حصہ لیا۔ رسائل اور جرائد کی اشاعت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ 1753ء میں جرائد کی تعداد چھتر لاکھ تھی۔ 1774ء تک ان کی اشاعت ایک کروڑ بیس لاکھ سے اُوپر ہو چکی تھی۔ پٹ کے عہدِ وزارت میں اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ انقلابِ فرانس اور اس کے مابعد نتائج سے ہر کس و ناکس کو گہری دلچسپی تھی۔ اخبارات میں تمام اہم سیاسی مسائل کا جائزہ لیا جاتا۔ اور ہر مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی جانچ کی جاتی تھی۔ اس بحث و تمحیص اور تنقید و تبصرہ سے ملک میں رائے عامہ کی تشکیل کا ایک عملِ مسلسل جاری رہتا۔ جرائد اور رسائل سے ہٹ کر عوام اپنی رائے کا اظہار جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ بھی کرتے تھے۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد ذرائع رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے تھے۔ اس پس منظر میں قومی مسائل سے واقفیت اور باخبری مجموعی طور پر قوم میں پختہ سیاسی شعور کے پیدا کرنے کا باعث ہو رہی تھی۔ اسی شعور اور آگہی نے عوام میں یہ خواہش بھی پیدا کی کہ پارلیمنٹ کی سرگرمیوں اور اس کی کارروائیوں سے واقفیت حاصل کرنے کا انھیں موقعہ ملنا چاہیے۔ لیکن اس میں دشواری یہ تھی کہ اب تک پارلیمانی کارروائیاں سخت راز میں رکھی جاتی تھیں، اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو منظرِ عام پر لانے کی ہمت کرے۔

ان حالات میں پارلیمانی رازداریاں اب سب کو کھلنے لگی تھیں۔ دارالعوام نے حالیہ زمانے میں جو غیر معمولی طاقت حاصل کی تھی اور اسے ملک کے نظامِ حکومت میں جو درجہ حاصل ہو گیا تھا اس کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کی کارروائیوں اور اس کے مباحث سے ملک کے باشعور طبقے کو دلچسپی ہو۔ لیکن پارلیمنٹ اپنا طریقۂ کار بدلنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ وہ اس رازداری کو اپنا ایک اہم امتیاز تصور کرتی تھی۔ رازداری کی روایت ایسے زمانہ میں شروع ہوئی تھی جبکہ پارلیمنٹ اور بادشاہ ایک دوسرے کے حریف تھے۔ نیز پارلیمنٹ کو یہ خوف رہتا تھا کہ اگر تقاریر کو راز میں نہ رکھا جائے تو اراکین کو شاید بادشاہ کے خوف سے آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کی ہمت نہ ہو۔ غرض بادشاہ کی کسی امکانی مداخلت سے بچنے اور آزادئ تقریر کے بنیادی حق سے پوری طرح استفادہ کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی کارروائیوں کو راز میں رکھنے کا طریقہ نکالا گیا۔ اب حالات کے بدل جانے کے باوجود دارالعوام اپنے اس امتیاز سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھا بلکہ اس پر مُصر تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر ایوان کے مباحثے اور تقاریر ہرگز شائع نہ کی جائیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض منچلے اور جری اخبار نویس پارلیمانی کارروائیوں

اور تقریروں کو شائع کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ پارلیمنٹ میں چونکہ اخباری نمائندے یا نامہ نگار داخلہ نہیں پا سکتے تھے لہٰذا اخباروں میں جو روئیداد چھپتی وہ ناقص، زیادہ تر فرضی، اور گمراہ کن بھی ہوتی تھی۔ اس سے پارلیمنٹ کو اور بھی تاؤ آتا تھا۔ چنانچہ ایسا کئی بار ہوا کہ خاطیوں کو امتیاز شکنی کے الزام میں اپنے حکم سے پارلیمنٹ نے قید کر دیا اور انھیں معافی مانگنے پر مجبور کیا۔ دونوں ایوانوں نے مختلف اوقات میں اخباروں کی اس روش کے خلاف سخت قرار دادیں بھی منظور کیں۔ لیکن اس تمام کشمکش میں عوام کی ہمدردی اخبارات اور رسائل کے ساتھ تھی، بعض اوقات ان کی تائید میں لندن کے شہری ہنگامہ آرائی پر اُتر آئے اور نقضِ امن کی شکل پیدا کر دی۔ رائے عامہ کھلے طور پر اس معاملہ میں پارلیمنٹ کے خلاف تھی۔ ۱۷۷۱ء میں ولکس (WILKES) نامی ایک ممبر پارلیمنٹ کے اشارے پر بعض اخبارات نے مقررین کے ناموں کی صراحت کے ساتھ ان کی پارلیمانی تقریریں شائع کیں۔ دارالعوام نے خاطیوں کی گرفتاری کے احکام نافذ کئے۔ بعد میں ان کو لارڈ میئر اور سٹی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ولکس بحیثیت آلڈرمین مجسٹریٹ بھی تھا۔ اخبار نویسوں کو شہر کے حکام نے بَری کر دیا۔ کیونکہ ان کے خلاف کوئی جُرم ثابت نہیں ہوا۔ اس پر دارالعوام نے لارڈ میئر اور سٹی مجسٹریٹ کی گرفتاری کا حکم جاری کیا لیکن اس سے لندن کے عوام میں برہمی پیدا ہوئی۔ اور بلوے کے آثار نمایاں ہوئے۔ ان حالات کے مدنظر پارلیمنٹ نے اس معاملہ سے درگزر کو ہی قرینِ مصلحت تصوّر کیا اور اس کے بعد سے ہمیشہ اس تعلق سے چشم پوشی اختیار کرنی شروع کی۔ پارلیمنٹ کی چشم پوشی کی پالیسی نے اس معاملہ کی نزاعی حیثیت ختم کر دی۔ اور عملاً ۱۷۷۱ء سے پارلیمانی کارروائیوں کی روئیداد کی اشاعت پر کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

اخباروں کی پارلیمنٹ کے مقابلے میں یہ کامیابی دراصل جمہوری طاقتوں کی جیت تھی۔ صحافت کی اس آزادی نے اسے قومی زندگی میں ایک بلند مقام عطا کیا۔ اب وہ نہ صرف رائے عامہ کے اظہار کا ذریعہ تھی بلکہ قومی سطح پر تنقید و تبصرہ کے ذریعہ سے اس کی تشکیل کا کام زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دے سکتی تھی۔ سیاسی زندگی میں یہ ایسی نئی قوت تھی جو قوم کی رہنمائی میں پارلیمنٹ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ اور خود پارلیمنٹ بھی قومی رجحان کے جاننے اور پہچاننے میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکتی تھی۔ غرض صحافت اس کے بعد سے مسلسل ترقی کرتی رہی۔ عوام کے بے باک ترجمان کی حیثیت سے وہ پارلیمنٹ کی ہمسر اور ہم پلّہ

ہوگئی۔ اب پارلیمنٹ خود اس کی نگاہیں دیکھنے پر مجبور تھی۔

آئرلینڈ کا اتحاد

فرانس سے جنگ کا ایک ذیلی نتیجہ یہ نکلا کہ آئرلینڈ میں ایک خطرناک صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ فرانسیسی انقلابی آئرلینڈ کی بددلی اور بے چینی سے فائدہ اٹھا کر انگلستان کے لئے سخت مشکلات پیدا کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں فرانسیسی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئی تھیں۔ پٹ اس خطرہ سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس لئے اس مسئلہ کی عاجلانہ یکسوئی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لیکن آئرلینڈ کے مسئلہ کا حل دریافت کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ٹیوڈروں کے زمانہ سے آج تک آئرلینڈ پر کوئی ایسا طرزِ ستم نہیں تھا جس کو انگریزی حکومت نے آزمایا نہ ہو۔ کہنے کو تو آئرلینڈ کی اپنی علٰحدہ پارلیمنٹ تھی۔ اس کی اپنی حکومت اور اس کی اپنی عدالتیں تھیں۔ مگر یہ سب کی سب انگریزی حکومت کے آہنی پنجہ کی گرفت میں عرصہ ہوا دم توڑ چکی تھیں۔ ہنری ہشتم کے زمانے سے پائننگ (POYNINGS ACT —) کے قانون کی بدولت آئرلینڈ کی پارلیمنٹ کی حیثیت محکومانہ ہوگئی تھی۔ بادشاہ اور اس کی کونسل کی اجازت کے بغیر آئرلینڈ میں نہ پارلیمنٹ منعقد ہوسکتی تھی اور نہ اس میں کوئی مسودہ قانون پیش کیا جاسکتا تھا۔ انگلستان کی پارلیمنٹ آئرلینڈ کے لئے قانون بنانے کی بھی مجاز تھی۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں آئرلینڈ میں انگریز پروٹسٹنٹوں کی نوآبادکاری کا سلسلہ جاری رہا۔ مقامی کیتھولکوں کی زمینیں چھین لی گئیں۔ انھیں بے گھر کیا گیا۔ ان کو ہر قسم کی آزادیوں سے محروم کیا گیا۔ کیتھولکوں کی زبوں حالی کا تو ذکر ہی کیا پروٹسٹنٹ نوآبادکار بھی اپنی قسمت کے آپ مالک نہیں تھے۔ حکومت قانون سازی، تجارت، صنعت و حرفت غرض سیاسی اور معاشی زندگی کے ہر شعبہ پر انگریزی حکومت کا تسلط تھا۔ آئرلینڈ کی تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کے خلاف امتیازی قوانین نافذ تھے جن سے انگلستان کے مفادات کا تحفظ منظور تھا۔ پروٹسٹنٹ آبادکاری کے بعد بھی آئرلینڈ کی محکومیت بدستور برقرار رہی، یہ بات ان انگریز نوآبادکاروں کو کھلنے لگی۔ 1781ء تک آئرلینڈ میں رہائی از حبسِ بے جا (HABEAS CORPUS ACT) کی قسم کا کوئی قانون نہیں تھا۔ اور 1782ء تک ججوں کی اپنی خدمت پر برقراری محض عاملہ کی خوشنودی پر منحصر تھی۔ انگلستان کے دارالامراء

نے 1719ء میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں یہ فیصلہ کیا کہ آئرلینڈ کے دارالامراء کو وہاں کی عدالتوں کے خلاف مرافعہ کی سماعت کا حق حاصل نہیں ہے۔ اور اسی سال برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس میں اس موقف کا اعادہ کیا گیا کہ وہ آئرلینڈ کے لئے قانون سازی کی مجاز ہے۔

آئرلینڈ کی پارلیمنٹ اپنی ان کمزوریوں کے قطع نظر عاملہ پر بھی کوئی کنٹرول نہیں رکھتی تھی۔ لارڈ لفٹنٹ آف آئرلینڈ اور اس کی کونسل اور چیف سکرٹری انگریز نژاد اور برطانوی حکومت کے نامزد کردہ ہوتے تھے۔ آئرستانی پارلیمنٹ کے سامنے ان کی جوابدہی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ یہاں بھی رشوت اور بدعنوانیوں کا بازار گرم تھا۔ عاملہ اس سے بیدریغ کام لیتی تھی۔ پارلیمنٹ پر ان طریقوں سے اس نے اپنی گرفت خوب مضبوط کر رکھی تھی۔ مگر جارج سوم کے زمانے سے آئرستانی پروٹسٹنٹوں نے اس محکومیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی جدوجہد تیز تر کر دی۔ اس دباؤ کے تحت انگریزوں کو رفتہ رفتہ اپنی گرفت ڈھیلی کرنی پڑی۔ 1782ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے قانون سازی کے اختیار سے دست برداری حاصل کرلی۔ 1719ء کے قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ عدلیہ پر برطانوی سیادت ختم کر دی گئی۔ اور آئرستانی دارالامراء کو مرافعوں کی سماعت کا حق حاصل ہوگیا۔ آئرستانی پارلیمنٹ نے پائننگ کے قانون کو منسوخ کر دیا۔ "قانون رہائی از حبسِ بے جا" پاس کیا۔ یہاں کے ڈسنٹرس (DISSENTERS.) کی حد تک "قانون آزمائش" (_ TEST ACT) کو منسوخ کر دیا گیا۔

یہ اصلاحات ترقی کی نشان دہی ضرور کرتی ہیں لیکن ان سے کیتھولکوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ان کی محرومیوں کا یہ عالم تھا کہ اپنی بھاری اکثریت کے باوجود وہ حقِ رائے دہی سے بھی محروم تھے۔ تعجب نہیں کہ ان حالات میں ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور کسی وقت بھی اس آتش فشاں مادہ کے پھٹ پڑنے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا۔ اسی لئے پٹ نے 1793ء میں کیتھولکوں کے ساتھ مراعات کی پالیسی کا آغاز کیا۔ انھیں پہلے حقِ رائے دہی عطا کیا گیا البتہ کوئی کیتھولک پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن بعض دوسری سہولتیں تعلیم اور ملازمت کی ان کو پہلی مرتبہ میسر آسکیں۔ عام تعصب اور مخالفت کی فضاء میں یہ مراعات بدقسمتی سے محض زیبِ قرطاس رہیں اور شرمندۂ معنی نہ ہوئیں۔ کیتھولکوں

کے لئے سب سے زیادہ موجبِ آزار یہ بات تھی کہ پروٹسٹنٹ کلیسا کی برقراری کے لئے ان کو بھی محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ زیادتیاں رنگ لائے بغیر نہ رہیں۔ پٹ کی نرم اور دوستدارانہ پالیسی کے باوجود آئرلینڈ میں فرانسیسیوں کے بھرتے پر ایک عظیم بغاوت پھوٹ پڑی اور کچھ دنوں تک خوب خون کی ہولی کھیلی گئی۔ پٹ نے بغاوت کے ختم ہوتے ہی اصلاح کی ایک جامع تجویز پیش کی۔ اس کے نزدیک آئرلینڈ کے پیچیدہ مسئلہ کا صرف ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ آئرلینڈ کا مکمل الحاق کرلیا جائے۔ اس پالیسی کے روبہ عمل لانے میں بہت سی مشکلات تھیں۔ یہاں بھی ویران اور جیبی شہروں (ROTTEN & POCKET BOROUGHS) کی لعنت موجود تھی۔ آئرلینڈ میں ایک سو اٹھارہ (118) شہر اپنے نمائندے ایوانِ زیریں کے لئے منتخب کرتے تھے۔ ان میں سے ایک سو دس (110) متمول اور دولت مند اشخاص کی خانگی ملک بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا ایسے تمام اشخاص کو بھاری معاوضہ ادا کرنا ضروری تھا جن کے مفادات متاثر ہو رہے تھے۔ اٹھارویں صدی میں حقِ رائے دہی کی بیع و شریٰ ایک عام بات تھی۔ اور قانوناً ایسے اشخاص کی مالکانہ حیثیت تسلیم کی جاتی تھی جو کسی ویران یا جیبی شہر سے اپنے نمائندوں کو نامزد کرنے کا حق حاصل کرچکے تھے۔ غرض مفاداتِ حاصلہ اور دیگر ذی اثر اور طاقتور عناصر کو مطمئن کرنے کے بعد آئرلینڈ کی جداگانہ وحدت کا خاتمہ عمل میں لایا گیا۔ پارلیمنٹ ختم کردی گئی۔ اس کی بجائے آئرلینڈ کو انگلستان کی پارلیمنٹ میں نمائندگی دی گئی۔

پٹ نے ۱۸۰۰ء میں قانون اتحادِ آئرستان منظور کروالیا۔ دارالعوام میں آئرلینڈ کے ۱۰۰ ممبروں کا اضافہ ہوا۔ دارالامراء کے لئے اعیانی طبقہ کی جانب سے اٹھائیس نمائندوں کے انتخاب کا انتظام کیا گیا۔ یہ انتخاب حینِ حیات تھا۔ آئرلینڈ کے امراء اس معاملہ میں اسکاٹ لینڈ کے مقابلہ میں زیادہ خوش نصیب رہے۔ اسکاٹ لینڈ کے اعیانی نمائندے صرف ایک پارلیمنٹ کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ ان کا انتخاب حینِ حیات نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ہر تین امراء کے فوت ہونے پر ایک نیا امیر بنایا جائے اور یہ کہ جب آئرلینڈ میں امراء کی تعداد گھٹتے گھٹتے ایک سو یا اس سے کم ہوجائے تو پھر سابقہ تناسب کی بجائے ہر ایک امیر کے انتقال پر ایک نیا امیر بنایا جائے۔ طبقۂ امراء کو ایک اور رعایت دی گئی کہ ایسے آئرستانی امراء جو دارالامراء کے رکن نہ ہوں،

دارالعوام کی رُکنیت حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ انگلستان کے کسی حلقۂ انتخاب سے منتخب ہوں۔ کلیسا کی نمائندگی کے لئے آئرلینڈ کے چار اساقفہ کو دینی امراء کی حیثیت سے دارالامراء میں جگہ دی گئی۔

آئرلینڈ کا اِتحاد، پِٹ کا بڑا تعمیری کارنامہ ہے۔ اس قانون کے ذریعے آئرلینڈ سلطنت متحدہ (UNITED KINGDOM —) کا ایک جزو بن گیا۔ یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ایک ترقی پذیر سلطنت کے جزو کی حیثیت سے آئرستان کا مستقبل شاندار ہوگا اور صدیوں کے ظلم وستم کی کچھ تلافی ہو جائے گی لیکن اس اتحاد کو کامیاب اور پائیدار ہونا نہ تھا۔ پٹ یہ جانتا تھا کہ صرف سیاسی سطح پر اعضاءِ حکومت کے اتحاد سے آئرستانیوں کی بنیادی مشکلات دُور نہ ہوں گی۔ اس لئے اس نے اپنی جامع تجویز کے ایک دوسرے جُزو کو بھی روبہ عمل لانا چاہا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اتحاد کے بعد کیتھولکوں کو کامل آزادی عطا کر دی جائے اور وہ کسی میدان میں بھی ناانصافیوں اور محرومیوں کے شکار نہ رہیں۔ چنانچہ اتحاد سے پہلے ہی آئرلینڈ کے رومن کیتھولکوں کو یہ اُمید دلائی گئی تھی کہ رومن کیتھولک آزادی کا دن اب دُور نہیں ہے۔ مگر جارج سوم رومن کیتھولکوں کی آزادی کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ پٹ نے اس کو منانے کی ہزار کوشش کی مگر جارج کے لئے یہ اس کے ضمیر کا معاملہ بن گیا۔ کیتھولکوں کی آزادی کو وہ اپنے حلف تاجپوشی (CORONATION OATH.) کے منافی سمجھتا تھا جس میں اس نے کلیسا کے تحفظ کا تیقن دیا تھا۔ اس لئے اس حلف شکنی کو وہ اپنے ضمیر کے ساتھ فریب کاری تصوّر کرتا تھا۔ جارج کی اس ضد نے آئرلینڈ سے متعلق پٹ کی پالیسی کو ناکام بنا دیا۔ پٹ کے عہدِ وزارت میں بادشاہ اور کیبنٹ کے درمیان یہ پہلا شدید اختلاف تھا۔ پٹ اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ نہیں سکا۔ لہٰذا وہ مستعفی ہوگیا۔ (سنہ 1801ء)

مسئلہ تولیت (REGENCY)

ایک اہم دستوری مسئلہ تولیت یا ریجنسی (REGENCY.) سے متعلق سنہ 1788ء میں پیدا ہوا جبکہ جارج سوم پر دیوانگی کا دورہ پڑا۔ اور کافی طویل عرصہ تک وہ اپنے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہا۔ اس غیر متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ملک کے

قانون میں گنجائش نہیں تھی ۔ اس قسم کی صورتِ حال کی کوئی پیش بینی نہیں کی گئی تھی اور کوئی ایسی قانونی یا دستوری مشینری موجود نہیں تھی جو حکومت کے کاروبار کو بلا رکاوٹ جاری رکھنے میں مدد دے سکے ۔ بادشاہ کی علالت کی وجہ سے حکومت کے کاروبار میں تعطل کا اندیشہ پیدا ہوگیا ۔ پارلیمنٹ اس وقت بحالتِ التوا تھی ۔ دستور کے مطابق پارلیمنٹ کا جب سیشن شروع ہو تو اس کا رسمی افتتاح صرف بادشاہ کر سکتا تھا یا پھر اس کا نامزد کردہ کمیشن۔ اس رسمی افتتاح کے بغیر پارلیمنٹ باضابطہ طریقہ پر اپنا کام شروع نہیں کر سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ مسوداتِ قانون پر بادشاہ کے دستخط کا تھا ۔ غرض حکومت کو بظاہر ایک لاینحل دشواری درپیش تھی ۔ نہ بادشاہ خود یہ فرائض انجام دینے کے قابل تھا اور نہ ان کی انجام دہی کے لئے وہ کمشنروں کا تقرر کرنے کے قابل تھا ۔ اس مشکل کا ایک آسان حل یہ تھا کہ ولی عہدِ سلطنت کو فوراً متولی یا ریجنٹ تسلیم کر لیا جائے ۔ چنانچہ فاکس اور اس کی پارٹی کا مطالبہ بھی یہی تھا لیکن پٹ کو اس معاملہ میں پس و پیش تھا ۔ کیونکہ ولیعہدِ سلطنت کے اس وقت فاکس اور اس کی پارٹی سے بہت اچھے تعلقات تھے ۔ وہ اپنے باپ سے کشیدہ تعلقات کی بناء پر حکومتِ وقت کا مخالف تھا اور وہگ پارٹی کا دوست اور سرپرست بنا ہوا تھا ۔ ان حالات میں پٹ کو یہ شبہ تھا کہ اگر ولی عہد کو غیر مشروط طور پر ریجنٹ یا متولی تسلیم کر لیا جائے تو خود اس کی حکومت کی خیر نہ ہوگی ۔ کابینی ترقی کے باوجود اب بھی تمام سیاسی لیڈر اور سیاسی پارٹیاں یہ سمجھتی تھیں کہ وزارت کو برطرف کرنے یا بحال رکھنے کا اختیارِ کُلّی بادشاہ کو حاصل ہے ۔ یہ تصور تھا کہ اگر بادشاہ اس اختیار کو کام میں لائے اور اس ضمن میں پارلیمنٹ کے احساسات کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کو دستور کی خلاف ورزی پر محمول نہیں کیا جا سکتا ۔ اس سے ضمناً یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کابینی طرزِ حکومت کی بنیادیں اب بھی کمزور تھیں اور وزراء کے تقرر کے شاہی اختیار کو اب بھی تسلیم کیا جاتا تھا ۔ پٹ کو بھی یہی خطرہ تھا کہ ولیعہد ریجنٹ مقرر ہوتے ہی کہیں عنانِ حکومت وہگوں کے سپرد نہ کر دے اس لئے وہ یہ چاہتا تھا کہ ریجنٹ کا تقرر پارلیمنٹ کرے اور اس کے اختیارات کی بھی حد بندی کر دے ۔ یہ بات دستوری روایات کے مطابق بھی تھی ۔ جب کبھی زمانہ ماسبق میں ریجنسی کے قیام کا موقعہ پیش آیا پارلیمنٹ نے ہی اس کا تقرر کیا اور ریجنٹ

کے اختیارات کی سختی سے حد بندی بھی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت وہگوں نے محض اپنے مفاد کی خاطر ایک ایسا موقف اختیار کیا جو ان کی روایات کے خلاف تھا۔ وہ پارلیمنٹ کے مقابلہ میں شاہی اختیارات کی تائید کر رہے تھے اور ریجنسی کو ولیعہد کا پیدائشی حق بتا رہے تھے۔ پٹ نے ان کی زمانہ سازروش کا پردہ چاک کر دیا۔ بالآخر اس کی کوششوں سے اس مسئلہ کا ایک پیچیدہ اور مصنوعی حل دریافت کیا گیا۔ پارلیمنٹ کی رضامندی کے ساتھ لارڈ چانسلر کو اختیار دیا گیا کہ وہ ایک حکم نامہ کے ذریعہ سے جس پر "مہر اعظم" (GREAT SEAL.) ثبت کی گئی ہو کمشنروں کا تقرر کرے اور یہ کمشنر بادشاہ کے نائبین کی حیثیت سے پارلیمنٹ کا رسمی افتتاح کریں۔ نیز یہ طے کیا گیا کہ ایک مسودۂ قانون بھی معینہ اور مصرحہ اختیارات کے ساتھ ریجنسی کے قیام کے لئے پارلیمنٹ میں پیش کیا جا کر اس کی منظوری حاصل کر لی جائے۔ شاہی منظوری کے مرحلہ پر کمیشن اس پر مہر اعظم کے تحت بادشاہ کے فرضی دستخط ثبت کر دے گا۔ اس طرح یہ سمجھا جائے گا کہ مسودۂ قانون کو بادشاہ کی منظوری حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ کا افتتاح عمل میں آیا اور ریجنسی بل ابھی پارلیمنٹ میں زیر دوران تھا کہ جارج سوم کی صحت بحال ہو گئی لہٰذا ریجنسی کے قانون کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ یہاں یہ بات لطف سے خالی نہیں ہے کہ اگر وہگوں نے اس معاملہ کی حد تک اپنا چولہ بدلا تھا اور پارلیمنٹ کے مقابلہ میں پرنس آف ویلز (ولیعہد) کے موروثی حقوق کی حمایت کی تھی تو ٹوریوں نے بھی ایک ایسے طریقہ کار پر اصرار کیا جس سے ادارہ شاہی کی پوزیشن نہایت کمزور ہو جاتی۔ بادشاہ کے فرضی اور مصنوعی دستخط کو قوانین کی منظوری کا ذریعہ بنانا عملاً ادارہ شاہی کی ضرورت سے بے نیاز ہونے کے برابر ہے۔ یہ بات ٹوری سیاسی نظریات کے منافی تھی اور ایک خطرناک نظیر بھی۔ بہر حال سنہ 1788ء میں تو یہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا لیکن جب سنہ 1810ء میں بادشاہ پر دوبارہ جنون کا دورہ پڑا تو پارلیمنٹ نے ریجنسی کے قیام کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا جس کی اوپر صراحت کی گئی۔

چودھواں باب

پارلیمانی اصلاح کی ضرورت

زرعی و صنعتی انقلاب

اٹھارویں صدی میں انگلستان کی معاشی اور سماجی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ اس انقلاب نے زندگی کے ایسے سانچے بدلے اور ایسی تبدیلیاں پیدا کیں کہ اس سے اصلاحِ نظم و نسق اور اصلاحِ پارلیمنٹ کے مسائل کی طرف قوم کو ناگزیر طور پر متوجہ ہونا پڑا۔ یہ سماجی اور معاشی تبدیلیاں بہت آہستہ آہستہ نمودار ہوئیں لیکن ان کی وسعت اور ہمہ گیری نے پوری قوم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کو عام طور پر صنعتی انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ بھونچال کی طرح نہیں آیا۔ اس کے جلو میں خوں ریزیاں، تباہ کاریاں اور ہنگامہ آرائیاں نہیں تھیں۔ اس کی آہستہ روی اور سبک خرامی نے کسی کو یہ محسوس بھی ہونے نہیں دیا کہ معاشرت اور سماج اپنا چولا بدل رہے ہیں اور اپنی ہزارہا سالہ پرانی روایات کو چھوڑ کر ایک روشن مستقبل کی طرف گامزن ہونے کو ہیں۔ انگلستان کا یہ صنعتی انقلاب انسانی زندگی کے ڈھانچے میں ایک برقی رَو کی مانند تھا۔ جہاں جہاں یہ برقی رَو پہنچی انسانی زندگی جاگ اٹھی۔ اور اس راستہ پر گامزن ہوئی جہاں سے انسان "نیچر" کے مقابلہ میں عظیم سے عظیم تر فتوحات حاصل کرنے کے قابل ہوا۔ اور اب تک حاصل کئے جا رہا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے انسان نیچر کی طاقتوں کا غلام تھا۔ اب وہ رفتہ رفتہ آقا کے روپ میں نمودار ہونے کو تھا۔ صنعتی انقلاب نے نہ صرف انگلستان میں بلکہ بعد میں ہر جگہ سماج اور معاشرت کو جس حد تک تبدیل کیا اس کی پچھلی تاریخ میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔ یہ حقیقت ہے کہ قدیم ترین فراعنۂ مصر کے زمانہ سے سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی تک بھی انسان نے ترقی کی کوئی بڑی چھلانگ

نہیں لگائی تھی۔ زندگی کے وہی پرانے سانچے تھے، وہی پرانی تنظیم، معیشت اور سیاست کے وہی پرانے خدوخال۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اواخر سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال میں علم و عمل کی ایسی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوئیں کہ اچانک زندگی کے سارے نقشے ہی بدل گئے۔ ایک انقلاب مسلسل کی رَو تھی جو جسدِ حیات کے رگ و پے میں داخل ہوگئی تھی اور اسے متحرک کردیا تھا۔ اس ڈیڑھ سو سال میں انسان نے ایسی ترقی کی جو پچھلے کئی ہزار سال میں ممکن نہ ہوسکی تھی۔ یہ حیرت انگیز ترقی و تبدیلی صنعتی انقلاب کا سبب بھی ہے، اور نتیجہ بھی۔

صنعتی انقلاب کے آثار اٹھارویں صدی سے نظر آنے لگے تھے۔ لیکن اس سے پہلے انگلستان میں زرعی انقلاب نے قومی معیشت میں قابلِ لحاظ تبدیلیاں پیدا کردی تھیں۔ سولھویں صدی سے بیرونی تجارت کو جو فروغ ہوا تھا اس سے ملک میں سرمایہ دار طبقہ پیدا ہوچکا تھا۔ اس طبقہ نے اپنی دولت کو زراعت میں مشغول کرنا شروع کیا۔ زمینات ان کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگیں۔ قدیم زرعی نظام میں رخنے پڑنے لگے۔ سرمایہ دارانہ زراعت نے چھوٹے کاشتکار کو راستے سے ہٹانا شروع کردیا۔ چھوٹے چھوٹے کھیت اور ایسی زمینات جس پر مالکانہ حیثیت سے کاشت کی جاتی تھی ان کا خاتمہ ہونے لگا۔ گاؤں اور دیہات میں کھلی زمین اور چراگاہیں جن سے پورا گاؤں استفادہ کرتا تھا غائب ہونے لگیں۔ ان کی جگہ دیواریں، باڑیں اور مختلف قسم کی حدبندیاں کھڑی کردی گئیں۔ بڑے بڑے فارم وجود میں آنے لگے تھے۔ اس سے پیداوار میں بہت اضافہ ہوا۔ لیکن صدیوں پرانا دیہاتی نظام بھی اس کی وجہ سے تہہ و بالا ہوگیا۔ چھوٹا کاشتکار بے زمین ہوگیا اور اپنی سابقہ باعزت حیثیت کو کھو کر مزدور طبقہ میں شامل ہوگیا۔ زراعت کے دولت مند طبقہ کے ہاتھ میں آنے کی وجہ سے زرعی نظام میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ ان تبدیلیوں نے اٹھارویں صدی تک ملک میں ایک زرعی انقلاب کو جنم دیا تھا۔

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اس صدی میں متعدد ایجادات معرضِ وجود میں آئیں۔ اٹھارویں صدی کو اس لحاظ سے ایجادات کی صدی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بہت سی ایجادات کا تعلق کپڑے کی صنعت سے تھا۔ لیکن دوسری صنعتیں بھی ترقی کی اس گھماگھمی سے محروم نہیں رہیں۔ ابتداءً ایسی مشینیں ایجاد کی گئی تھیں جو پانی کی قوت سے چلتی تھیں لیکن اس اثناء میں واٹ (WATT.) اور بولٹن (BOULTON.) کے تجربوں سے

بھاپ کی قوت کی دریافت ہوئی ۔ اس دریافت نے صنعتی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ۔ مشین اور بھاپ کے جوڑ سے انسان نے ایک ایسی قوت حاصل کی جس پر آج تک اسے دسترس حاصل نہیں ہوئی تھی ۔ پیدائش دولت کے طریقے بھی بدل گئے ۔ جگہ جگہ فیکٹریاں وجود میں آنے لگیں ۔ گاؤں دیہات یا شہروں کی مقامی صنعتوں کا خاتمہ ہوا ۔ چھوٹے پیمانے پر پہلے جو کام ہوتا تھا وہ اب غیر منفعت بخش ہوگیا ۔ گھریلو صنعت کاری معدوم ہونے لگی ۔ مقامی صناع اور اس کا خاندان اپنے صدیوں پرانے روزگار سے محروم ہوگیا ۔ وہ فیکٹریوں سے کیا مقابلہ کر سکتا تھا ؟ ملک کا سرمایہ دار طبقہ ترقی کے اس راستے پر چل پڑا ۔ اب اس کثرت سے مال تیار ہونے لگا کہ اس کی نکاسی کے لئے سڑکوں اور آبی راستوں کو ترقی دینے کی فوری ضرورت محسوس کی جانے لگی تاکہ صنعتوں کے مراکز سے بہ عجلتِ ممکنہ مال بندرگاہوں کو پہنچایا جا سکے اور وہاں سے بڑے بڑے جہازوں میں لدکر دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچایا جاسکے ۔ اس ضرورت کی بھی فوری تکمیل ہوئی ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں نئی سڑکوں اور آبی راستوں کا ملک میں جال بچھا دیا گیا ۔ اور حمل ونقل کا ایک نیا اور ترقی پذیر نظام وجود میں آیا ۔ ذرائع حمل ونقل کی اس سہولت نے نہ صرف شہروں اور صنعتی مراکز کو باہم مربوط کیا بلکہ ان سب کو ساحلی علاقوں اور بڑی بڑی بندرگاہوں سے منسلک کر دیا ۔

پیدائش دولت اور صنعت کاری کے طریقوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا گہرا اثر سیاسی اور سماجی زندگی پر پڑنے لگا ۔ بے روزگار چھوٹا کسان اور چھوٹا صناع اپنے گھر بار کے ساتھ شہروں کا رُخ کرنے لگا ۔ اس کے لئے اب اپنے پرانے گاؤں یا شہر میں روزگار کے کوئی ذرائع باقی نہیں رہے تھے ۔ مزدوروں کی ملک میں ایک بڑی فوج تیار ہوگئی ۔ عموماً نئی صنعتیں شمال میں قائم کی گئی تھیں ، کیونکہ نئی صنعتوں کے لئے دو چیزوں کی سخت ضرورت تھی ۔ ایک لوہا اور دوسرے کوئلہ ۔ ان کے بڑے ذخائر وسطی اور شمالی انگلستان میں پائے گئے ۔ قدرتی طور پر نئے شہر اور صنعتی مراکز ان ذخائر کے قریبی اور نواحی علاقوں میں وجود میں آئے ۔ بے روزگار مزدور تلاشِ معاش میں ان شہروں کی طرف چل پڑا ، پُرانے شہر ویران ہونے لگے ۔ آبادی کا رُخ عموماً جنوب سے شمال کی طرف تھا ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انگلستان کی شہری اور دیہاتی زندگی کا ڈھانچہ بدلنے لگا ۔ نئے شہروں میں ہر طرف اژدہام ہی اژدہام تھا ۔ کثرتِ آبادی سے یہ شہر پھوٹتے پڑتے تھے اور حکومت کے لئے انھوں نے نہایت دشوار اور لاینحل مسائل

اُجرت، صحت عامہ اور آجر و مزدور کے تعلقات، کے پیدا کر دیئے۔

ان عظیم تبدیلیوں کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ انگلستان بہت تھوڑے عرصہ میں ایک ترقی یافتہ صنعت کار ملک بن گیا اور اس کے کارخانوں کا بنایا ہوا مال دنیا کی منڈیوں میں ہر جگہ پہنچنے لگا۔ مال کی کھپت کے لئے نہ صرف نئی منڈیاں تلاش کر لی گئیں، بلکہ اژدہا صفت کارخانوں کے لئے خام مال کے حصول اور اس کی درآمد کا انتظام کیا گیا۔ اس دوطرفہ عمل نے انگلستان کو دنیا کی "ورک شاپ" میں تبدیل کر دیا۔ اور ادھر صنعتی ترقی کی وجہ سے آئندہ ایک سو سال کے عرصہ میں آبادی میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا۔ 1789ء میں انگلستان اور ویلز کی آبادی صرف اسی لاکھ تھی۔ 1871ء تک یہ دو کروڑ اکیس لاکھ تک جا پہنچی۔

صنعتی انقلاب کے سیاسی نتائج

صنعتی انقلاب کا ایک فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ زمیندار اور صنعت کار طبقہ میں آویزش پیدا ہو گئی۔ اب تک صدیوں سے حکومت اور اس سے متعلقہ اداروں پر زمیندار طبقہ کا تسلط تھا۔ اٹھارویں صدی میں تاجر اور صنعت کار کو قومی زندگی میں ایسا اونچا مقام مل گیا کہ اب وہ بھی سیاسی اقتدار کا خواہاں نظر آنے لگا۔ ان دونوں طبقات کے مفادات قدرتی طور پر متغائر تھے۔ صنعت کار طبقہ اس سے واقف تھا کہ اس کے اپنے مفادات کی حفاظت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ پارلیمنٹ پر اس کا قبضہ ہو لیکن پارلیمنٹ زمانۂ قدیم سے زمیندار طبقہ کے چنگل میں تھی۔ اس چنگل سے اسے آزاد کرنے کے لئے وسیع قانون سازی کی ضرورت تھی بلکہ اس کی بھی ضرورت تھی کہ پارلیمنٹ کی اصلاح کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ اور ان بدلے ہوئے حالات میں سماج کے ان دو طاقتور مفادات کو متصادم ہونے سے بچانے اور قوم کے مختلف عناصر کے مختلف النوع تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی موجودہ ہیئت اور ترتیب و تنظیم پر نظر ثانی کی جائے۔ صنعتی انقلاب نے پارلیمانی اصلاح کو ناگزیر کر دیا تھا۔

سماج اور حکومت کی تنظیم جدید کے لئے سیاسی اور معاشی مفکروں نے اٹھارویں صدی میں اصلاح کی بنیادوں کو ٹٹولنا چاہا۔ آدم اسمتھ کے معاشی نظریات کی وجہ سے پہلے تو یہ خیال تھا کہ فرد کو اپنی جدوجہد کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس پر کم سے کم پابندیاں

عاید کی جائیں۔ صنعت و تجارت کو ہر قسم کے قیود اور پابندیوں سے آزاد رکھا جائے۔ اس کو (LAISSES - FAIRE -) عدم مداخلت کی پالیسی کہتے ہیں۔ اس بات کا دعویٰ کیا جاتا تھا کہ حکومت کی کم سے کم مداخلت کی وجہ سے فرد اپنی بہترین صلاحیتوں کو اُجاگر کریگا آزاد معاشی جد وجہد سے (FREE ENTERPRISE.) انفرادی خوشحالی پیدا ہوگی، جو دراصل اجتماعی خوشحالی کا پیش خیمہ ہوگی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ تمام معاشی اور سیاسی ادارات کی جو زمانۂ ماسبق سے چلے آرہے ہیں ازسرِ نو جانچ پڑتال کی جانی چاہئے۔ ان میں سے ایسی تنظیمات اور ایسے ادارے جو زمانہ موجودہ کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اور جو اصلاح پذیر نہیں ہیں انھیں مٹا دینا چاہئے۔ یہ ماضی کی یادگاریں ترقی کے راستہ کی رکاوٹیں سمجھی جانے لگیں۔ ان میں تغیّر یا تبدیلی کے ذریعہ سے یا تو اصلاح کی جائے یا انھیں یکسر معدوم کردیا جائے۔ اس تصور کے پیچھے جرمی بینتھم (JERMEY BENTHEM.) کے فلسفۂ افادیت" کی جھلک نظر آتی ہے۔ بینتھم اس زمانہ کا مشہور مفکر اور فلسفی تھا۔ اس نے سیاسی اور سماجی اداروں کی جانچ کی کسوٹی یہ رکھی تھی کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس پس منظر میں کوئی تعجب نہیں کہ انیسویں صدی کے اوائل میں نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اصلاحات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو بعد میں چل کر 1832ء میں پارلیمنٹ کی پہلی اصلاح پر منتج ہوا۔ یہ امر کہ نظم و نسق سے متعلق یہ اصلاحات ایک ٹوری حکومت کی قیادت میں روبہ عمل لائی گئیں اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے لئے ملک میں کتنا شدید تقاضا تھا۔ 1823ء میں لارڈ لیورپول کی ٹوری وزارت تشکیل پائی۔ اس نے نظم و نسق سے متعلق بہت سی اہم اور دوررس اصلاحات کا پروگرام شروع کیا۔

اصلاحِ نظم و نسق

تعزیری قوانین کی طرف سب سے پہلے توجہ کی گئی۔ یہ قوانین صدیوں پہلے بنائے گئے تھے۔ ان میں عرصہ سے اصلاح کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ علوم و فنون کی ترقی سے سماج میں جو روشن خیالی پیدا ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر ان میں تبدیلی اور اصلاح ناگزیر ہوگئی تھی۔ ان قوانین کے تحت تقریباً دوسو جرائم کی سزا موت تھی۔ تحریف (FORGERY —) اور سرقہ

کے لیے بھی موت کی سزا دی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ان سخت سزاؤں پر لفظاً و معناً چھوٹے جرائم کی حد تک عمل نہیں کیا جاتا تھا لیکن تعزیری قوانین کو مجموعی حیثیت سے ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ازبس ضروری تھا۔ چنانچہ یہ کام 1823ء سے 1830ء کے درمیان مکمل کیا گیا۔ موت کی سزا صرف چند شدید جرائم کے لیے باقی رکھی گئی۔ فوجداری مقدمات کی کارروائیوں کو سہل اور آسان بنایا گیا تاکہ ملزم کو اپنے بچاؤ میں زیادہ سہولت اور آسانی میسر آسکے۔

مالیاتی اصلاح کا بھی ایک طویل سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس اصلاح میں جدید معاشی تقاضوں کا لحاظ رکھا گیا۔ قدیم قوانینِ جہازرانی میں ترمیمات کی گئیں۔ بیرونی تجارت پر جو بہت سی پابندیاں عاید تھیں ان کو دور کیا گیا۔ ایسے قوانین نافذ کیے گئے جن سے ٹیرف (TARIFF) کی شرح کم کی گئی۔ یہ دراصل آزاد تجارت کی طرف ابتدائی اقدامات تھے اگرچہ فوراً آزاد تجارت کے اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا لیکن تحفظ (PROTECTION) کی پالیسی سے رفتہ رفتہ دستبرداری کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ ان معاشی اقدامات سے ملک کو بہت فائدہ پہنچا اور معاشی خوشحالی کے اسباب پیدا ہوئے۔

مذہبی رواداری

لیکن ان عام اصلاحات سے زیادہ اہم اصلاح مذہبی رواداری کے تصورات کو قانونی شکل کا عطا کرنا تھا۔ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ایسے تمام گروہ اور طبقات جو کلیسائے انگلستان کے پیرو نہیں تھے اب تک امتیازی قوانین کا شکار تھے۔ انقلاب کے بعد (1689ء) صرف پروٹسٹنٹ منحرفین (DISSENTERS) کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ وہ اپنے عقاید کے مطابق اپنے فرائض مذہبی ادا کر سکتے ہیں اور اپنی عبادت گاہیں قائم کر سکتے ہیں لیکن کیتھولک شہریوں کو اس بنیادی رعایت سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں طبقات کیتھولک اور ڈسنٹرس سیاسی اور شہری حقوق سے محروم تھے۔ وہ کسی خدمت پر فائز نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن ہنوورین خاندان کی تخت نشینی اور وگوں کے تسلط کے زمانے میں ڈسنٹرس کی حالت کو کسی حد تک بہتر بنایا گیا۔ این (ANNE) کے زمانے میں ان کے خلاف جو قوانین بنائے گئے تھے "قانون مطابعت موقتی" اور "قانون افتراقِ دینی" دونوں کو منسوخ کر دیا گیا اور سال بہ سال پارلیمنٹ ایک "قانون معافی" (INDEMNITY ACT)

پاس کرکے ڈسنٹرس کو یہ موقعہ عطا کرتی تھی کہ وہ ملک کے عہدوں پر فائز ہوسکیں اسی غرض کے لئے "قانون آزمائش" اور "قانون کارپوریشن" کی مخالف دفعات کو "قانونِ معافی" کے ذریعے غیر موثر کر دیا جاتا تھا۔ مگر تاحال پارلیمنٹ کی یہ ہمت نہ ہوسکی تھی کہ مذکورالصدر قوانین کو منسوخ کر دے جو سترھویں صدی کے تنگ نظرانہ مذہبی ماحول میں پاس کئے گئے تھے۔ پروٹسٹنٹ ڈسنٹرس کی تو پھر بھی حالت بہتر ہوچکی تھی، کیونکہ پارلیمنٹ انھیں رعایتیں دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ مگر کیتھولکوں کی زبوں حالی کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں تو کیتھولکوں کی کوئی بڑی تعداد نہیں تھی۔ اس لئے وہ پارلیمنٹ کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن الحاق آئرلینڈ کے بعد کیتھولکوں کو اپنی کثیر عددی قوت کی وجہ سے ایک نئی طاقت اور اہمیت حاصل ہوگئی۔ آئرلینڈ میں انھیں حقِ رائے دہی مل گیا تھا مگر برطانیہ میں وہ اس سے بھی محروم تھے۔ پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ پارلیمنٹ پر انیسویں صدی کے بدلے ہوئے حالات میں دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس صدی کی عام روشن خیالی پرانے تعصبات کو زائل کرتی جا رہی تھی اس ترقی پسند اور روشن خیال فضا میں ٹوریوں کو بھی اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑا۔ چنانچہ 1828ء میں "قانونِ آزمائش" اور "قانونِ کارپوریشن" کو منسوخ کر دیا گیا۔ یہ مذہبی مساوات اور مذہبی رواداری کی جانب بہت بڑا قدم تھا۔ مگر اس سے کیتھولکوں کا بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کو کامل آزادی اور مساوات عطا کرنے کے لئے ایک جامع قانون کی ضرورت تھی۔ آئرلینڈ میں ڈانیل اوکانل (DANIEL O' CONNALL) کی سرکردگی میں ایک زبردست ایجی ٹیشن شروع کر دیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں اوکانل نے پارلیمنٹ کی ایک سیٹ کے لئے مقابلہ کیا اور کیتھولکوں کے ووٹ کے سہارے وہ اپنے پروٹسٹنٹ حریف کو بھاری اکثریت سے شکست دی۔ اوکانل جانتا تھا کہ کامیابی کے باوجود وہ دارالعوام کا ممبر نہیں بن سکتا۔ لیکن وہ اسی بے انصافی کی طرف رائے عامّہ کو متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے بھی آثار و قرائن پیدا ہوگئے تھے کہ اگر کیتھولکوں کو کامل مساوات اور آزادی عطا نہ کی جائے تو ملک میں وسیع پیمانے پر خون خرابہ کا آغاز ہوجائیگا ان حالات میں 1829ء میں ولنگٹن کی ٹوری حکومت نے "قانون آزادی فرقہ کیتھولک"

(CATHOLIC EMANCIPATION ACT.) پاس کیا۔ اس وقت جارج چہارم نے بھی اپنے باپ کی طرح اس قانون کی مخالفت کی۔ اور اپنی منظوری صادر کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ لیکن بالآخر اسے اپنی کیبنٹ کا ساتھ دینا پڑا۔ اس قانون کے ذریعہ سے کیتھولکوں کو کامل مذہبی اور سیاسی آزادی حاصل ہوئی۔ وہ اب پارلیمنٹ کے ممبر بن سکتے تھے۔ اور سوائے چند کے تمام عہدوں پر فائز ہو سکتے تھے۔ مذہبی رواداری کا اصول اب مکمل طور پر قبول کر لیا گیا تھا لیکن اب بھی یہودی پارلیمنٹ کے ممبر نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں یہ حق 1858ء میں حاصل ہوا۔

پندرھواں باب

پارلیمانی اِصلاح

قانونِ اصلاح 1832ء

انتخابی قوانین میں اصلاح کی ضرورت

پچھلے صفحات میں اس بات کا سرسری طور پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اٹھارویں صدی میں پارلیمنٹ کی اصلاح کا مسئلہ کافی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ انتخابی قوانین کے نقائص اور استقام کی وجہ سے پارلیمنٹ میں عوام کی صحیح نمائندگی کا انتظام ناممکن تھا۔ یہ قوانین پندرھویں صدی میں وضع ہوئے تھے اور ان میں تاحال کوئی اصلاح نہیں کی گئی تھی۔ حالانکہ جن سماجی اور سیاسی حالات میں ان قوانین کو وضع کیا گیا تھا وہ اب باقی نہیں تھے۔ قوم کئی انقلابات سے گزر چکی تھی۔ حکومت اور معاشرت سے متعلق نظریات بدل چکے تھے۔ دنیا بہت آگے نکل چکی تھی لیکن پارلیمنٹ اپنی ترتیب و تنظیم کے لحاظ سے دورِ وسطیٰ کی پارلیمنٹ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ طاقت اور اقتدار کے حصول میں اس نے بے مثل ترقی کی تھی لیکن وہ اپنی ہیئتِ ترکیبی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکی تھی۔

دارالعوام کے اراکین کہنے کو تو منتخبہ ہوتے تھے مگر یہ انتخاب بیشتر صورتوں میں ایک تماشا تھا۔ اضلاع (SHIRES) میں تو پھر بھی انتخاب کی کچھ لاج رہ جاتی تھی۔ مگر شہروں (BOROUGHS) کی حالت بُری تھی۔ اضلاع میں 1430ء کے قانون کے مطابق جو تاحال نافذ العمل تھا صرف ایسے زمینداروں کو حقِ رائے دہی حاصل تھا جو اپنی مملوکہ اراضی (FREE HOLD) پر سالانہ چالیس شلنگ زرِ تحصیل ادا کرتے تھے۔

اس کی وجہ سے اضلاع کی حد تک حق رائے دہی کے معیار میں کامل یکسانیت تھی اور رائے دہندوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ رشوت اور دیگر بدعنوانیوں کے ذریعہ سے انتخابات کو متاثر کرنا بہت مشکل تھا۔ مثال کے طور پر یارک شائر کے ضلع میں سولہ ہزار اشخاص رائے دہی کا حق رکھتے تھے اور عام اوسط کسی جگہ بھی چار ہزار سے کم نہ تھا۔ لیکن شہروں کی حالت بالکل جداگانہ تھی۔ یہاں حق رائے دہی کے لئے کوئی یکساں معیار نہیں تھا۔ اس کے لئے پارلیمنٹ نے کبھی کوئی قانون نہیں بنایا۔ ہر شہر کی تاریخ جداگانہ تھی اور اس کی اپنی جداگانہ ارتقائی منزلیں۔ عموماً ہر شہر کا وجود اس کے منشور سے وابستہ تھا۔ منشور کے عطیہ کے ساتھ رائے دہی کی اہلیت کا بھی تعین کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ یہ عطیے مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں شہروں کو حاصل ہوئے تھے لہٰذا حق رائے دہی کا معیار جگہ جگہ مختلف اور جداگانہ رہا۔ کہیں اس حق کو بہت محدود کر دیا گیا اور کہیں اس میں کسی حد تک وسعت روا رکھی گئی۔ چنانچہ بعض شہر ایسے بھی تھے جہاں رائے دہندوں کی تعداد ایک ہزار تھی، بعضوں میں پانچ سو اور بعضوں میں صرف دو سو تھی۔ لیکن ایسے بہت سے شہر تھے جن کے رائے دہندوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ اٹھارویں صدی کے معاشی انقلاب نے ان میں سے بعض قدیم شہروں کو اتنا ویران کر دیا تھا کہ وہاں مشکل سے دس پانچ رائے دہندے نکل سکتے تھے۔ چنانچہ گالٹن میں صرف سات رائے دہندے باقی رہ گئے تھے۔ ٹیوسٹاک (TAVISTOCK.) میں دس اور اولڈ سارم میں عرصہ ہوا کوئی رائے دہندہ باقی نہیں رہا تھا۔ یہ صرف نام کے شہر تھے، بالکل ویران اور بے نام و نشان۔ مگر ان میں سے ہر ایک اپنے نمائندے پارلیمنٹ کو روانہ کرتا تھا۔

انتخابی بدعنوانیاں

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ شہروں (باروز) کی حد تک انتخاب ایک صریح دھوکہ تھا۔ یہاں روپیہ پیسہ، اثرات، تخویف و تحریص خوب کام کر سکتے تھے۔ انتخاب سے پہلے ہی انتخاب کا نتیجہ ظاہر ہو جاتا تھا۔ امراء اور بڑے زمیندار ان ویران اور جیبی (POCKET اور ROTTEN.) شہروں کو اپنی جائیداد مکسوبہ بنائے ہوئے تھے۔ اکثر حلقہ ہائے انتخاب میں مقابلہ کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ۱۷۶۱ء میں اڑتالیس انتخابی

حلقوں میں مقابلہ ہی نہیں ہوا۔ اور جہاں مقابلہ ہوتا وہاں رشوت کے ذریعہ نتائج کو متاثر کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح دارالعوام بڑی حد تک عوامی مفادات کا نہیں، بلکہ اُمراء اور زمیندار طبقہ کا نمائندہ بن کر رہ گیا تھا۔ یہاں ضمناً اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ دارالامراء اور دارالعوام کے تعلقات اس زمانہ میں عام طور پر خوشگوار رہے۔ کسی چپقلش یا کشمکش کے موقعے بہت کم پیش آتے تھے اس کا راز بس یہی ہے کہ دارالعوام کے اراکین یا تو اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس سے دارالامراء تشکیل پاتا تھا یا پھر اس کے نامزد کردہ ہوتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے امراء اور زمیندار ان حالات میں خوب موج اڑاتے رہے۔ لارڈ نیوکاسل دارالعوام کے گیارہ اراکین کو نامزد کرتا تھا۔ لارڈ لانسڈیل (LORD LONSDALE) نو، لارڈ فٹز ولیم آٹھ، اور کوئی چھ امیر ایسے تھے جو 45 اراکین کو منتخب کراتے تھے۔ ایوان کی کم و بیش نصف رکنیت اس طرح مختلف امیر گھرانوں کی نامزد کردہ ہوتی تھی۔

دارالعوام پر زمیندار طبقہ کا تسلط

ان نقائص اور خرابیوں کے باوجود دارالعوام فی الواقع اس عہد کے معاشرہ کی بڑی حد تک صحیح نیابت اور عکاسی کرتا تھا۔ اٹھارویں صدی تک بھی انگلستان ایک زرعی معاشرہ تھا۔ اس معاشرہ کا حسن و قبح، اس کی کمزوریاں، اس کے تعصبات، اس کے طبقہ واری مفادات کی ذہنیت، یہ سب ہی خصوصیات دارالعوام میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ وہ زمیندار طبقہ کا نمائندہ تھا۔ انتخابی قوانین اسی طبقہ کے بنائے ہوئے تھے۔ لہٰذا کوئی تعجب نہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ سے اٹھارویں صدی تک دارالعوام اسی طبقہ کے مفاد کا نگران اور اس کا محکوم تھا۔ عوام کی نمائندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ تصور کہ اس کو قوم کی عددی اکثریت کا نمائندہ ہونا چاہئے۔ اور نیابت کی بنیاد آبادی کے تناسب پر رکھی جانی چاہئے انیسویں صدی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ورنہ دارالعوام تو اس تصور کا مظہر تھا کہ قوم میں جو مفادات اور عناصر طاقتور ہیں وہ ان کا ترجمان ہو۔

اس لحاظ سے اگر دارالعوام اس وقت زمیندار طبقہ کے زیر اثر تھا تو یہ بات نہ تو تعجب خیز تھی اور نہ ان اصولوں کے منافی تھی جن پر اس کی تشکیل عمل میں آئی

تھی۔ اٹھارویں صدی کا دار العوام بدلے ہوئے حالات کے تحت اصلاح طلب ضرور ہو گیا تھا لیکن اس پر یہ الزام کچھ درست نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بالکل کسی نمائندہ حیثیت کا حامل نہیں تھا۔ حق بات یہ ہے کہ وہ معاشرے کے نمایاں خدوخال کا آئینہ دار تھا۔ معاشرہ چونکہ اب تبدیل ہو رہا تھا، اس میں بھی تبدیلی ناگزیر ہو گئی تھی۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر سے پارلیمانی اصلاح کی تجاویز یکے بعد دیگرے دار العوام میں پیش کی جاتی رہیں۔ اس میں متعدد سرکردہ قائدین دلچسپی لے رہے تھے۔ ان میں پٹ ارل آف چیتھم، ڈیوک آف رچمنڈ، پٹ (اصغر) اور گرے (GREY) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک منزل پر ولکس نامی ایک ممبر پارلیمنٹ نے بھی ایک اچھی تجویز پیش کی تھی۔ ان تجاویز کا قدر مشترک یہ تھا کہ ویران شہروں کی نیابت ختم کر دی جائے۔ ان کی جگہ ایسے نئے شہروں کو حقِ نیابت عطا کیا جائے جو بڑے صنعتی مراکز بن گئے تھے۔ پٹ بحیثیت وزیرِ اعظم ایسے افراد اور کارپوریشنوں کو معاوضہ عطا کرنے تیار تھا۔ جنھیں تقریباً پچاس ویران شہروں میں اپنے نمائندے نامزد کرنے کا حق حاصل تھا، تاکہ وہ اپنے اس حق سے دست بردار ہو جائیں۔ اس طرح حاصل شدہ سو نشستوں کو وہ بڑے بڑے نئے شہروں میں بلحاظ آبادی تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ مگر دوسری تجاویز کی طرح پٹ کی کوشش بھی ناکام رہی۔ پٹ کو کہیں سے کوئی تائید نہیں ملی۔ خود اس کی کیبنٹ اس معاملہ میں منقسم، پارلیمنٹ، ناراض، اور بادشاہ سخت مخالف تھا۔

اصلاح کے مطالبہ میں شدت

انیسویں صدی سے یہ مطالبہ شدت پکڑنے لگا۔ فرانس سے صلح ہونے کے بعد جنگ کو مانع اور حائل سمجھنے کا کوئی حیلہ باقی نہیں رہا۔ ملک میں عام طور پر ایک بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ اس مقصد کی تائید میں جلسے منعقد ہوتے اور جلوس نکالے جاتے رہے سینکڑوں انجمنیں اور سوسائٹیاں تشکیل پاتی رہیں تاکہ ملک کی رائے عامہ کو اس مقصد کے لئے تیار کیا جائے۔ پارلیمنٹ کو ہزارہا دستخطوں کے ساتھ عرضیاں گزرنے لگیں۔ لارڈ گرے اور لارڈ جان رسل نے اس کا بیڑہ اُٹھایا تھا کہ وہ پارلیمنٹ کی اصلاح کے بغیر دم نہیں لیں گے۔ رسل کی جانب سے وقفہ وقفہ کے ساتھ اس بارے میں متعدد تحریکات پیش

کی جاتی رہیں۔ 1818ء سے 1826ء تک سات مرتبہ علٰحدہ علٰحدہ اصلاح کی تجاویز پیش کی جاتی رہیں۔ لیکن کبھی دارالعوام میں ان کا خاتمہ ہوگیا اور کبھی دارالامرا نے انھیں مسترد کردیا۔

مسوّدہ قانون اصلاح پر کشمکش

1830ء میں ولیم چہارم تخت نشین ہوا۔ نئے انتخابات کے بعد کچھ عرصہ تک لارڈ ولنگٹن کی قیادت میں ٹوری حکومت برقرار رہی لیکن سال کے اختتام تک ٹوریوں کو شکست ہوگئی۔ اور وہگ لیڈر لارڈ گرے نے اپنی حکومت بنائی — وہگوں کو ایک طویل عرصہ کے بعد حکومت کی گدیوں پر متمکن ہونے کا موقع ملا تھا اور وہ عرصہ سے اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ پارلیمنٹ کی اصلاح کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ چنانچہ مارچ 1831ء میں لارڈ جان رسل نے ایک مسودہ اصلاح دارالعوام میں پیش کیا۔ دوسری خواندگی میں یہ مسودہ پاس تو ہوگیا لیکن بہت کم اکثریت کے ساتھ۔ جب یہ کمیٹی کے مرحلہ میں داخل ہوا تو حکومت کو شکست ہوگئی۔ لارڈ گرے کے مشورے پر پادشاہ نے پارلیمنٹ برخواست کردی۔ نئے انتخابات منعقد کرائے۔ یہ انتخاب اصلاح کے مسئلہ پر لڑا گیا۔ وہگوں کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب ہوئے اور لارڈ گرے نے دوبارہ اپنی حکومت بنائی۔ اس کامیابی کے معنی یہ لئے گئے کہ رائے دہندوں نے اصلاح کی بھرپور تائید کی ہے۔ اس سے حکومت کے دست وبازو بہت مضبوط ہوگئے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں لارڈ جان رسل نے ایک تازہ مسودہ دارالعوام میں پیش کیا۔ اس کی تمام خواندگیاں بھاری اکثریت سے منظور ہوئیں۔ لیکن دارالامرا اب بھی اس کو قبول کرنے تیار نہیں تھا۔ بڑی سخت کشمکش جاری رہی۔ بالآخر ایوان نے اسے مسترد کردیا۔

حکومت نے اس منزل پر پارلیمنٹ کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کردیا تاکہ اس وقفہ میں قوم کو اس بارے میں سنجیدگی سے غور وفکر کا موقعہ ہاتھ آئے۔ اصلاح کے مویدین نے اس کی تائید میں ہر وہ طریقہ اختیار کیا جو رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لئے ان کو میسر آسکتا تھا۔ اخبارات، جلسے، جلوس، عرضیاں غرض سارے حربے استعمال کئے گئے۔

ملک میں بعض مقامات پر بلوؤں اور فسادات کی صورتیں بھی پیدا ہوگئیں۔ یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ قوم کی اکثریت اصلاح کی تائید میں ہے لیکن ٹوریوں کو اب بھی خوف سا تھا۔ انھوں نے یہ بات بھلائی نہیں تھی کہ اسی اصلاح کے نام پر فرانس میں کیسی کیسی خوں ریزیاں نہ ہوئیں۔ اور قوم کو کیسے کیسے خوفناک ادوار سے گزرنا نہ پڑا۔ زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی مشکل سے ایک سال گزرا تھا کہ فرانس میں ایک اور تازہ انقلاب نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور سماج کا تار و پود بکھیر دیا۔ یہ لوگ انگلستان میں ایسا کوئی روزِ بد دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے اصلاح کی مخالفت پر اڑے رہے۔ التوار کے بعد پارلیمنٹ کا جب دوسرا اجلاس شروع ہوا تو تیسرا مسودہ اصلاح، دارالعوام میں پیش کیا گیا۔ یہاں کے تمام مرحلوں سے کامیابی سے گزرنے کے بعد اسے دارالامرا بھیجا گیا۔ قوم کے بدلے ہوئے مزاج کے پیشِ نظر مخالفت میں یہاں کمی کے کچھ آثار ضرور نمایاں تھے۔ مگر پھر بھی دوسری خواندگی پر یہ معلوم ہوا کہ یہ مسودہ صرف نَو آرا کی اکثریت سے منظور ہوا ہے۔ یہ چیز صاف بتا رہی تھی کہ کمیٹی کے مرحلے پر مسودہ کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ گرے نے اس منزل پر بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اختیارِ خصوصی کو کام میں لا کر اتنے نئے امیر بنائے کہ وِگوں کو دارالامرا میں اکثریت حاصل ہو جائے۔ ایَن کے زمانے میں ٹوریوں نے صلح نامۂ اُٹرخٹ (PEACE OF UTRECHT) کی منظوری حاصل کرنے کے لئے یہی طریقۂ کار اختیار کیا تھا۔ اور بارہ نئے امیر بنوائے تھے۔ مگر اس وقت کم و بیش پچاس امرا کی ضرورت تھی۔ اتنی بھاری تعداد میں امیر بنانے سے قدرتی طور پر ولیم چہارم جھجکتا تھا۔ نیز یہ کہ وہ خود قدامت پسند تھا اور متنازعہ فیہ مسوّدہ اصلاحات سے اسے کچھ ہمدردی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے گرے کی درخواست قبول نہیں کی بلکہ ٹوریوں کے لیڈر ڈیوک آف ولنگٹن کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ ڈیوک نے یہ دعوت قبول تو کر لی مگر دیکھا کہ دارالعوام کے طاقتور عناصر اس کے ساتھ تعاون کرنے تیار نہیں ہیں۔ اِدھر دارالعوام نے بڑے جوش و خروش سے لارڈ گرے پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ ان حالات میں ولنگٹن کی ناکامی کے مدنظر ولیم کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ گرے کو دوبارہ طلب کرے اور حکومت اس کے سپرد کر دے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ بشرطِ ضرورت وہ نئے امرا کے بنانے میں کوئی پس و پیش

نہیں کرے گا۔

ٹوریوں نے اس نوبت پر محسوس کیا کہ ان کی مزید مخالفت تاج اور دارالامراء دونوں کے لئے ندامت اور خسارہ کا باعث ہوگی۔ چنانچہ اس بل کی تیسری خواندگی کے موقعہ پر ولنگٹن کے ایماء پر ٹوری امراء ایوان سے کثیر تعداد میں غیر حاضر رہے تاکہ حکومت کو دارالامراء میں موقتی اکثریت حاصل ہو جائے۔ اور بل کے پاس ہونے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

اصلاح عوامی نمائندگی کے اصول پر مبنی

اس طرح ایک طویل کشمکش کے بعد قانون اصلاح 1832ء میں پاس ہوگیا۔ پارلیمنٹ کی تاریخ میں اگر دولتِ عامّہ کے کام کو نظر انداز کیا جائے تو یہ پہلا قانونِ اصلاح تھا۔ اس کے دیگر مضمرات سے قطع نظر، اس نے دارالعوام میں نمائندگی کی بنیاد ہی بدل دی۔ ازمنۂ وسطیٰ سے اس وقت تک دارالعوام کو عام لوگوں کا نمائندہ ایوان نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ عام لوگوں کی نمائندگی اس میں ضروری خیال کی جاتی تھی۔ قدیم دارالعوام میں مفادات اور جماعتوں یا گروہوں (COMMUNITIES) کی نمائندگی کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ لیکن اب قانونِ اصلاح میں عام لوگوں کی نمائندگی کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔ اس کے نام سے ہی یہ بات ظاہر ہے۔ اس کو "قانونِ اصلاح نمائندگی عوام" کہتے ہیں[۱]۔

اس قانون نے نمائندگی کے نظام میں وسیع اور انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس میں بینتھم (BENTHEM) کے نظریات اور فرانس کے "انقلاب جولائی" کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ فرانسیسی انقلابات سے جمہوری تحریکات کو جو تقویت حاصل ہوئی تھی ان کا انگلستان میں بھی اثر پذیر ہونا ناگزیر تھا۔ اور ادھر بینتھم کے فلسفہ نے قدیم سیاسی اداروں کے کھوکھلے پن کو خوب اچھی طرح ظاہر کر دیا تھا۔ اور اس ضمن میں سماجی اور معاشی ادارات کو نظریۂ افادیت کی کسوٹی پر جانچنے کا ایک نیا معیار پیش کیا تھا۔ ان اثرات کی وجہ سے قانونِ اصلاح کو محض ترمیم اور پیوند کاری تک محدود

---

[۱] "AN ACT TO AMEND THE REPRESENTATION OF PEOPLE"

نہیں رکھا گیا بلکہ نمائندگی کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کی گئیں لیکن یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ انگلستان کے لوگ بہت ٹھنڈے دل و دماغ کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے ان جدید اثرات کو قبول تو کیا مگر قدامت پسندی اور اپنی تاریخی روایت سے وابستگی کا دامن نہیں چھوڑا۔ ترقی اور احتیاط کے دو متضاد عناصر کو باہم ایسا سمویا کہ قانونِ اصلاح کو انتہا پسندی (RADICALISM.) اور انقلاب آفرینی کے امکانی خدشات سے محفوظ کر دیا۔ اسی وجہ سے قانون اصلاح ترقی کیطرف ایک واضح قدم ہوتے ہوئے بھی انگلستان کی تاریخی روایات سے مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ تاریخی اور ارتقائی تسلسل سے یکسر انحراف روا نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ حق رائے دہی میں بنیادی تبدیلیاں کی گئیں لیکن اس کی بعض پرانی خصوصیات کو برقرار رکھا گیا۔ سیاسی اقتدار اب بھی جائیداد اور تموّل سے وابستہ تھا لیکن اصرار اس بات پر کیا گیا کہ صرف زمین سے وابستہ مفادات کی بجائے تموّل اور جائیداد کی دوسری شکلوں کو بھی سیاسی اقتدار میں شرکت کا موقعہ دیا جائے۔

قانونِ اصلاح 1832ء کے نمایاں خدوخال

اس قانون کی رو سے ستاون ویران اور جیبی شہروں کو جو مجموعی طور پر ایک سو تیرہ نمائندے منتخب کرتے تھے حقِ نمائندگی سے یکسر محروم کیا گیا۔ ان کے علاوہ تیس شہروں کو جو سابق میں دو دو نمائندے بھیجتے تھے اب صرف ایک نمائندہ منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس طرح جملہ ایک سو ترتالیس نشستیں تقسیم جدید کے لئے حاصل ہوسکیں۔ ان میں سے چوالیس نشستیں بائیس بڑے بڑے شہروں کو دی گئیں جن میں سے لندن کے مضافاتی اضلاع بھی شامل تھے۔ اکیس شہروں کو جو نسبتاً کم آبادی رکھتے تھے ایک ایک نمائندہ کے منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ اضلاع (COUNTIES) کی نیابت میں پینسٹھ نشستوں کا اضافہ کیا گیا۔ باقی نشستوں میں سے آٹھ آئرلینڈ کو اور پانچ اسکاٹ لینڈ کو دی گئیں۔ اس طرح دارالعوام کی مجموعی رکنیت میں کوئی کمی یا بیشی نہیں کی گئی۔

آبادی کے تناسب سے نشستوں کی تقسیم جدید کے ساتھ ساتھ رائے دہی کی اہلیت

کے معیار میں بھی تبدیلیاں پیدا کی گئیں۔ یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ اس منزل پر بھی شہر اور ضلع میں معیارِ اہلیت الگ الگ رکھا گیا۔ ابھی وہ دن دُور تھا جبکہ ان دونوں کو باہم ایک سطح پر لایا جا سکے۔ یہ قدامت پسندی کے اقتضا کا نتیجہ تھا۔ اضلاع میں چالیس شلنگ زرِ تحصیل ادا کرنے والوں کا حق بدستور باقی رکھا گیا۔ ان کے علاوہ ایسے لوگوں کو بھی یہ حق دیا گیا جو ضلع میں نقل دار (COPY HOLDER.) یا پٹہ دار (LEASE HOLDER.) کی حیثیت رکھتے ہوں اور جن کی زمین کی مالیت سالانہ دس پونڈ سے کم نہ ہو، نیز ایسا قلیل المدّتی پٹہ دار یا قابضِ جائیداد (OCCUPIER.) جو سالانہ پچاس پونڈ بطور زرِ تحصیل ادا کرتا ہے وہ بھی رائے دہی کا اہل بنا دیا گیا۔ ان انتظامات سے اضلاع میں رائے دہندوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ اور بہت سے طبقات جو پہلے اس حق سے محروم تھے اب اس سے مستفید ہوئے۔

شہروں میں معیارِ اہلیت سب کے لئے یکساں کر دیا گیا۔ جگہ جگہ جو علٰحدہ علٰحدہ معیارات تھے ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ شہروں (BOROUGHS.) میں ہر ایسا شخص رائے دہی کا اہل قرار پائے گا جو کسی ایسے مکان، گودام، دکان یا کسی نوع کی بھی عمارت پر بحیثیت مالک یا کرایہ دار قابض ہو اور جس کا کرایہ یا زرِ تحصیل دس پونڈ سالانہ وہ ادا کرتا ہو۔ ان تبدیلیوں سے مجموعی طور پر رائے دہندوں کی تعداد میں پچاس فی صد اضافہ ہوا۔

اس اصلاح کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ دارالعوام میں متوسط طبقہ کو بھاری نمائندگی حاصل ہو گئی۔ متوسط طبقہ کا اب بھی بول بالا تھا۔ کم آمدنی رکھنے والا طبقہ سیاسی اقتدار سے بدستور محروم رہا۔ اس کی سب سے بڑی نذر صنّاع اور کاریگر (ARTISAN) پر پڑی جسے سابق میں ووٹ حاصل تھا، اب یہ اس سے محروم ہو گیا۔ مگر سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ "اصلاح" سے دارالعوام میں کوئی غیر معمولی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی رکنیت میں کوئی نمایاں فرق ظاہر نہیں ہوا۔ اس سے متعلق بعض گوشوں سے جو بھیانک نتائج کی پیش گوئیاں کی جا رہی تھیں وہ غلط ثابت ہوئیں۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اس سے جمہوریت کو فوراً فروغ حاصل ہوا۔ زمیندار طبقہ کے اثر و نفوذ میں کچھ کمی ضرور ہوئی لیکن صرف اس حد تک کہ سیاسی اقتدار میں دوسرے متموّل طبقات بھی جو زمین سے وابستہ

نہیں تھے اس کے شریک بن گئے۔ دارالعوام اب بھی عوام کا ایوان نہیں تھا۔ اس اصلاح کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس نے آئندہ مزید اصلاحات کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اور اصلاح کے امکانی مضر نتائج کا جو خوف عام طور پر لوگوں کے دلوں پر طاری تھا اُسے دُور کر دیا۔

قدیم دارالعوام کی خدمات

اصلاح کے فوری نتائج کچھ زیادہ حیرت انگیز یا انقلاب آفرین نہ سہی لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے پارلیمنٹ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ قدیم دارالعوام کے ساتھ کئی صدیوں کی تاریخ وابستہ تھی۔ جن ویران اور جیبی شہروں کو اب نمائندگی سے محروم کیا گیا تھا انھوں نے پارلیمنٹ کی تاریخ بنائی تھی۔ یہی وہ بدنام اور مطعون شہر تھے جنھوں نے مختلف صدیوں میں بڑے نامور لوگوں کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اس کی کچھ تفصیل دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ ٹری گنی (TREGONY) سے ہارلے (لارڈ آکسفورڈ)، سینٹ جرمین سے سرجان ایلیٹ، ونڈوور (WENDOVER) سے ہیمپڈن اور بعد میں برک اور کیننگ، کیسل رائزنگ (CASTLE RISING) سے والپول، اولڈ سارم سے پٹ (اکبر) اور مڈہرسٹ سے فاکس جیسے لوگ منتخب ہو کر آتے رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تاریخ ساز شخصیتیں کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو پارلیمنٹ میں داخلہ ملا تو ان بدنام شہروں کے ذریعہ سے جن کا حقِ نمائندگی اب چھین لیا گیا تھا یہ ان شہروں کی کوئی معمولی خدمت نہیں تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ کیا گیا وہ درست نہیں تھا، یا یہ کہ اصلاح کی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف یہ بتانا منظور ہے کہ قدیم دارالعوام بھی اپنی کمزوریوں اور نقائص کے باوجود قوم کے مزاج اور اس کے حوصلوں اور آرزوؤں کی اچھی نمائندگی کرتا تھا۔ یہی وہ دارالعوام ہے جس نے شاہی مطلق العنانی کے خلاف صدیوں جدوجہد کی۔ کلیسا پر غیر ملکی تسلط کے خلاف جہاد کیا، فرد کی آزادی اور اس کے حقوق کے لئے جنگ کی۔ قانون کی حکمرانی کے لئے رزم آرا رہا۔ یہ بیش بہا خدمات اس دارالعوام نے انجام دیں جو اب اپنا چولا بدل رہا تھا۔ اس کی خدمات میں یہ بھی کچھ کم خدمت نہیں ہے کہ ضرورت پڑنے پر قوم کے مفاد کے لئے اس نے اپنے ہی قتل نامہ پر آپ دستخط کر دیئے۔

تاج کی روز افزوں بے بسی

قانونِ اصلاح جن مراحل سے گزر کر پاس ہوا اور حکومت کے عناصر ترکیبی نے اس سلسلہ میں جو رول ادا کیا اس کے مطالعہ سے دستوری ترقی کے بعض پہلوؤں پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ دارالامرا کی دارالعوام کے مقابلہ میں پسپائی اور بادشاہ کی کیبنٹ کے سامنے بے بسی یہ دونوں چیزیں اس کشمکش میں صاف طور پر نظر آتی ہیں اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان عناصر میں سے ہر ایک کا دائرۂ عمل اور دائرۂ اختیار کس طرح منضبط اور متعین ہوتا جارہا تھا۔ حکومت کی پالیسی کا تعین اب بادشاہ نہیں بلکہ کیبنٹ کرتی تھی۔ ولیم چہارم اس مسودۂ قانون سے ناخوش تھا۔ وہ ٹوری ذہنیت رکھتا تھا۔ اس لئے اس اقدام سے اسے کوئی ہمدردی یا دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ یہ مسودہ یا تو ناکام ہو جائے یا لیت و لعل میں ڈال دیا جائے۔ لیکن وہ اپنی کیبنٹ پر اپنا نقطۂ نظر مسلط نہیں کر سکا۔ اس کو اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی کہ اس مسودہ میں کوئی ایسی ترمیمات کرا سکے جو ٹوریوں کے لئے قابلِ قبول ہوں۔ اب بادشاہ کا موقف صرف یہ رہ گیا کہ وہ اپنی کیبنٹ کو اپنے نقطۂ نظر سے واقف کر سکتا اور انھیں مشورہ دے سکتا تھا، مگر اپنی رائے کی عمل آوری پر اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ بادشاہ کے عاملانہ اختیارات کی کیبنٹ وارث بن گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ سب کچھ اس کے نام سے اور بظاہر اس کے حکم سے کیا جاتا تھا مگر عملاً بادشاہ کی ذاتی رائے اور شخصی ارادے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ بعض مبصرین کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ اب "ادارۂ شاہی" کے صرف تین وظائف باقی رہ گئے تھے۔ بادشاہ اپنی کیبنٹ کو مشورہ دے سکتا ہے، اس کی ہمت افزائی کر سکتا ہے اور اس کو اس کی پالیسی کے نتائج سے بروقت متنبہ کر سکتا ہے۔ اس کے سوائے وہ کیبنٹ پر اپنا کوئی حکم نہیں چلا سکتا۔ "ادارہ شاہی" اب بھی دستور کا ایک مفید اور کارآمد عنصر تھا۔ سربراہ سلطنت کا تاجدار ہونا بین الاقوامی تعلقات میں قوم کے لئے ایک لاقیمت اثاثہ تھا۔ ادارہ شاہی کی وقعت اور عظمت بہت سے ایسے کام بنادیتی تھی جو جمہوری ملکتوں کے عوامی صدور سے ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے شاہی کو محض تزئین و آرائش دستور کا فضول ذریعہ سمجھنا بڑی غلطی ہوگی۔ اس سے قوم کو فی الواقع

ایسے فوائد حاصل ہوتے ہیں جو بصورتِ دیگر ممکن نہیں۔ قوم کے لئے بادشاہ کی ذات ایک ایسا مقدس مرکزِ جذب وکشش ہے جس کے اطراف اس کی وفاداریاں گھومتی ہیں۔ وہ قوم کے ذہن میں قومی اتحاد اور عظمت کی ایک نشانی اور علامت کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے اس ادارہ کی موجودہ دَور میں یہ وہ خدمات ہیں جو اس کے وجود کے جواز کے لئے کافی ہیں۔

ولیم چہارم نے ایک منزل پر کیبنٹ کے مشورہ کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ کیبنٹ یہ چاہتی تھی کہ مسودہ کی کامیابی کے لئے نئے امرا بنائے جائیں۔ بادشاہ کو تامّل تھا۔ اس اختلاف کی صورت میں کیبنٹ کو استعفیٰ دینے کے سوائے کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ ولیم نے ہمت کرکے ان کا استعفیٰ قبول کرلیا۔ اور ولنگٹن کی صدارت میں ٹوری حکومت بنانے کی کوشش کی۔ ولنگٹن کو جب حکومت بنانے میں ناکامی ہوئی تو بادشاہ گرے کو واپس طلب کرنے پر مجبور ہوا۔ اور اس کی شرائط بھی قبول کرلیں۔ ولنگٹن کی ناکامی بدقسمتی سے بادشاہ کی ناکامی بن گئی۔ اس کی وجہ سے شاہی وقعت وعظمت کو جو دھکہ پہنچا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس واقعہ سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ بادشاہ نہ تو اب اپنی مرضی کی وزارت بنانے میں آزاد ہے اور نہ وہ اپنی رائے کو کیبنٹ اور دارالعوام پر مسلط کرسکتا ہے۔ یہ چیز واضح طریقہ سے کابینی طرزِ حکومت کی ترقی کو ظاہر کرتی ہے۔ بادشاہ کی بےبسی اور حکومت سے عملاً بے دخل ہونے کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ ولیم نے اس ضمن میں جو کچھ کیا اس کو خلافِ دستور کہنا تو مشکل ہے مگر مماثل حالات میں اس کے بعد شاید کوئی اور بادشاہ اس قسم کے اقدام کی ہمت نہ کرسکے گا کیونکہ ایسے اقدام کا نتیجہ ناکامی اور ندامت کے سوائے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

1832ء کے قانونِ اصلاح نے جیبی اور ویران شہروں کی نمائندگی کو ختم کرکے بادشاہ کے ان ذرائع کا خاتمہ کردیا جن سے وہ دارالعوام کو اپنے قابو میں رکھتا تھا اور اس طاقت کو بالواسطہ کیبنٹ سازی میں استعمال کرتا تھا۔ قانونِ اصلاح کی کاری ضرب "نوازشاتِ شاہانہ" (CROWN PATRONAGE.) پر پڑی۔ کثیر آبادی کے حلقہ ہائے انتخاب میں نامزدگی کا پرانا طریقہ ناقابلِ عمل ہوگیا۔ اس چیز نے دارالعوام کو بادشاہ کی گرفت سے آزاد کردیا۔ اب بادشاہ اپنی مرضی کے اشخاص کو کیبنٹ میں ٹھونس نہیں سکتا تھا، بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ کیبنٹ سازی اب اس کے بس کی بات نہیں رہی۔

بادشاہ کی اس مجبوری نے ایک طرف کیبنٹ کو آزاد کیا اور دوسری طرف وزیراعظم کے اختیارات میں کافی وسعت پیدا کر دی۔ وہ بادشاہ کی مداخلت کے بغیر اب اپنی کیبنٹ آپ تشکیل دینے کے قابل ہو گیا۔

دارالامرا، قانونِ اصلاح سے پہلے

یوں تو اٹھارویں صدی سے ہی دارالامراء کی پوزیشن گرتی جا رہی تھی لیکن اس کے مخصوص فرائض اور وظائف کے نظر کرتے اس کو دستور کا ایک اہم جزو تصور کیا جاتا تھا۔ قانون سازی میں وہ نظری طور پر دارالعوام کا ہمسر اور ہم پلہ مانا جاتا تھا۔ البتہ مالی مسودوں میں وہ کمزور موقف کا حامل تھا۔ ہنوویرین دور کے ابتدائی زمانے میں وِگوں نے یہ کوشش کی تھی کہ دارالامراء کی رکنیت کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ وہ بادشاہ کے اختیار امرا سازی کو محدود کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ 1719ء میں ارل آف سنڈرلینڈ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دارالامراء کی موجودہ تعداد میں بادشاہ زیادہ سے زیادہ صرف چھ امیروں کا اضافہ کر سکتا ہے اور آئندہ کسی زمانے میں بھی اس مقررہ تعداد سے متجاوز امراء بنانے کا بادشاہ کو اختیار حاصل نہیں رہے گا۔ لیکن یہ مسودہ جو (PEERAGE BILL.) "مسودہ قانون امارت" کے نام سے موسوم ہے قانون نہیں بن سکا۔ بہت سے دور اندیش مدبروں اور سیاست دانوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ خصوصیت کے ساتھ والپول اس مخالفت میں بہت پیش پیش رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر یہ مجوزہ قانون پاس ہو جائے تو دستور کے توازن اور اس کی لچک کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ سنڈرلینڈ کا مقصد تاج کے اختیارات پر ایک قسم کی تحدید عاید کرنے کا تھا۔ مگر اس میں بڑی خرابی یہ تھی کہ دونوں ایوانوں میں مخالفت اور تعطل کی صورت میں ایک شدید بحران پیدا ہو جاتا۔ اور اس سے نمٹنے کے لئے کوئی دستوری طریقۂ کار باقی نہ رہتا۔ کسی وقت بھی کوئی تعطل یا اختلاف رائے دونوں ایوانوں میں ایک کھلے تصادم کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ اور شاید ان حالات میں دارالامراء کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جاتا۔ امرا سازی کا لامحدود اختیار تاج کے ہاتھوں میں ایک محفوظ حربہ ہے۔ دونوں ایوانوں کے تصادم پر قابو پانے کا یہ دستوری طریقۂ کار مہیا کرتا ہے۔

غنیمت یہ ہوا کہ اس بل کی ناکامی کی وجہ سے اسے کوئی گزند نہ پہنچ سکا۔

اس میں دوسری خرابی یہ تھی کہ دارالامرا اس کی وجہ سے ایک بند اور محدود ایوان ہو جاتا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی افادیت اور کارکردگی بری طرح متاثر ہو جاتی۔ کیونکہ اس میں قوم کے مشاہیر اور اعلیٰ صلاحیتوں کے اشخاص کے داخلہ کا راستہ ہی بند ہو گیا ہوتا۔ بہترین قومی صلاحیتوں سے محرومی کی یہ دائمی صورت اس کو غیر کارکرد، کمزور تر اور نیم جان بنا کر چھوڑ دیتی۔

یہ بات والپول کے زمانے سے ہی عیاں ہوتی جا رہی تھی کہ دارالامرا تدریجی طور پر تنزل کی طرف مائل ہے۔ ایک منتخبہ ایوان کے مقابلہ میں موروثی ایوان کی حیثیت سے اس کے اثر و رسوخ میں کمی بالکل قدرتی بات تھی۔ اسی احساس کی بنا پر والپول جب تک برسرِ اقتدار رہا دارالعوام کی رکنیت سے دست بردار ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ وزیر اعظم کے عہدہ سے سبک دوشی کے بعد اس نے دارالامرا کی رکنیت قبول کی۔ دارالامرا اپنی کمزوری کے باوجود اب بھی کبھی کبھی دارالعوام کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتا تھا اور حکومت کے فیصلوں کو متاثر کر سکتا تھا۔ چنانچہ فاکس انڈیا بل جو دارالعوام میں بھاری اکثریت سے پاس ہوا تھا اسے دارالامرا نے مسترد کر دیا۔ اور جارج سوم کو جو صرف ایک بہانہ کا متلاشی تھا اس کا موقعہ عطا کیا کہ وہ فاکس اور نارتھ کی مخلوط حکومت کو برطرف کر دے۔ دارالامرا کا عام رجحان ترقی پسند قانون سازی کے خلاف ہی رہا کرتا تھا۔ ادارہ شاہی سے اس کا قریبی ربط بھی اس کو ترقی پسند حلقوں میں مشکوک اور مشتبہ بنا رکھا تھا۔ پٹ کے دور سے قانونِ اصلاح کے زمانے تک ٹوریوں نے اس کی رکنیت میں بھاری اضافہ کر دیا تھا۔ رکنیت کی یہ کثرت بھی ایک غیر منتخبہ اور موروثی ایوان کے حق میں کچھ مفید بات نہیں تھی۔ دارالامرا قدامت پسندی کا گڑھ بن گیا تھا۔ اس وجہ سے جب اصلاح کا مسئلہ سامنے آیا تو اس ایوان میں اس کی سخت مخالفت کی گئی۔

دارالامرا اور "ریفارم بل"

دارالامرا قدرتی طور پر کسی ایسی اصلاح کو قبول کرنے تیار نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے اثر اور اقتدار کے خلاف پڑتی تھی۔ پچھلی صدیوں میں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کہ

دارالعوام اس کے مقابلہ میں سر نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ بعد میں جیبی اور ویران شہروں پر قبضہ کرکے امراء نامزدگی کے ذریعہ سے دارالعوام پر چھائے ہوئے رہے۔ اب یہ ہتھیار ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ دارالامراء میں اس مسئلہ پر سخت کشمکش جاری رہی۔ اصلاح کے دوسرے مسودہ کو دارالامراء نے بھاری اکثریت سے مسترد کر دیا۔ حالانکہ اس بارے میں رائے عامہ کی وسیع تائید کا واضح اظہار ہو چکا تھا۔ پہلے تو انتخابات کے ذریعہ سے یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ رائے دہندوں کی کثیر تعداد اصلاح کی حامی ہے۔ بعد میں اصلاح کی تائید میں بلوے اور فسادات بھی ہوئے۔ دارالامراء نے جب دوسرے مسودۂ اصلاح کو مسترد کیا تو ملک میں غم و غصہ کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔ اور جگہ جگہ فسادات پھوٹ پڑے۔ عوامی تائید کے ان واضح علامات کے باوجود تیسرے بل کو بھی عملاً ناکام کر دیا گیا لیکن جب یہ طے کر دیا گیا کہ نئے امراء بنا کر امراء کی مزاحمت پر عبور حاصل کر لیا جائے گا۔ تب مخالفین نے ہتھیار ڈالے۔ اور ایوان سے غیر حاضر ہو کر انھوں نے بل کو پاس ہونے کا موقعہ عطا کر دیا۔

دارالامراء قانونِ اصلاح کے بعد

قانونِ اصلاح کی منظوری نے اس خلیج کو اور وسیع کر دیا جو دونوں ایوانوں کے مابین اس قانون کی منظوری کے مراحل میں پیدا ہو گئی تھی۔ امراء کے ہاتھ سے وہ ذریعہ نکل چکا تھا جس کی بدولت وہ دارالعوام کو قابو میں رکھ سکتے تھے۔ جیبی اور ویران شہروں کے خاتمہ سے دارالعوام میں اُمراء کے نامزد ارکان کا وجود باقی نہیں رہا۔ اب جو نمائندے منتخب ہو کر آتے تھے وہ امراء کے رہینِ منت نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ایوانوں میں سابقہ ہم آہنگی اور مفاہمت باقی نہیں رہی بلکہ وقتاً فوقتاً دونوں میں اختلاف اور تصادم کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں۔ خصوصاً ایسی تحریکات پر جن کا تعلق ترقی پذیر اصلاحی تجاویز سے تھا، دارالامراء ایک سدِ سکندری کی طرح حائل ہونے لگا۔ قدامت پرستی اور مفاداتِ حاصلہ کے لئے وہ ہر وقت سینہ سپر ہونے کے لئے تیار ہو جاتا۔ چنانچہ بارہا ایسے مواقع آئے جب کہ ایسے مسودات جو دارالعوام میں بھاری اکثریت سے منظور ہوئے ہوں انھیں دارالامراء نے مسترد کر دیا۔ عموماً یہ بات اس وقت پیش آتی تھی جبکہ وِگ حکومت

برسر اقتدار ہوتی۔ "قوانین اجناس" (CORN LAWS.) کی منسوخی کے مسئلہ پر دارالامراء نے آخری دم تک سخت مخالفت کی۔ اس صدی میں اس قسم کی اور بہت سی صورتیں پیش آتی رہیں۔ دارالامراء میں ٹوریوں کی بڑی اکثریت تھی۔ اگرچہ وہگوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں وہگ امراء بنانے میں کوئی کمی نہیں کی لیکن رفتہ رفتہ یہ وہگ خاندان دارالامراء کی قدامت پسندانہ فضاء میں ایسے گھل مل جاتے کہ ان کی ترقی پسندی ختم ہوجاتی۔ اور شاید ایک پیڑی یا دو پیڑی میں پکے ٹوری ہوجاتے۔ اس طرح انیسویں صدی کے اواخر تک دارالامراء کی یہ قدامت پسندانہ ذہنیت لبرل حکومتوں کے لئے ایک لاینحل مسئلہ بنتی جارہی تھی۔ اور یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اس ایوان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے یا تو اس میں بنیادی تبدیلیاں لانی پڑیں گی یا پھر سرے سے اس کو ختم کرنا ہوگا۔ ایک موروثی اور غیر منتخبہ ایوان کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ قوم کی ترقی کے راستہ میں ہمیشہ ایک سدِ سکندری کی طرح حائل ہو۔ چنانچہ 1911ء کا قانونِ پارلیمنٹ اسی دشواری پر عبور حاصل کرنے کے لئے وضع کیا گیا۔

سماجی ومعاشی اصلاحات

قانونِ اصلاح سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اصلاح کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ انیسویں صدی میں علوم وفنون کی ترقی روشن خیالی کی فضاء پیدا کر رہی تھی۔ ان اثرات کے تحت بعض سماجی اور معاشی اصلاحات روبہ عمل لائی گئیں۔ پارلیمنٹ نے 1832ء کے بعد سے بہت سی مفید اصلاحی تجاویز کو قانونی جامہ پہنایا 1833ء میں تمام برطانوی قلمرو میں "قانون انسدادِ غلامی" کے ذریعہ سے غلامی کی لعنت کا سدِ باب کیا گیا اور اس کی تکمیل آوری کے لئے نوآبادیات میں غلاموں کے مالکوں کو کثیر رقمی معاوضہ ادا کیا گیا۔ اسی سال قومی تعلیم کے نظام میں بعض تبدیلیاں کی گئیں۔ تعلیم کا انتظام اس وقت تک مذہبی اداروں کے اختیار میں تھا۔ اور اس سے وہ دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس وقت حکومت نے اسکولوں کی مدد کے لئے بیس ہزار پونڈ کی رقم منظور کی۔ یہ حقیر رقم کوئی بڑا انقلاب نہیں لا سکتی تھی۔ لیکن اس سمت میں یہ اصلاح کا پہلا قدم تھا۔ اور انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے قومی نظامِ تعلیم میں واقعی ایک بڑا انقلاب

رونما ہوا۔ آجر و مزدور کے تعلقات کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور کٹھن ہوتا جا رہا تھا فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ مزدور طبقہ کے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ شدت پکڑتا جا رہا تھا۔ چنانچہ فیکٹری لاز (FACTORY LAWS) کے ذریعہ سے مزدور کی اُجرت، اوقاتِ کار اور اس سے متعلق دیگر مسائل کی یکسوئی کی کوشش کی گئی۔ قوانین جہاز رانی جن میں اس سے پہلے کچھ ترمیمات اور تبدیلیاں کی گئی تھیں 1849ء میں منسوخ کر دیے گئے۔ محاصل درآمد کی اونچی دیواروں کو ڈھایا جانے لگا تاکہ آزاد تجارت کے ذریعہ سے ملک میں خوشحالی پیدا ہو۔ "قوانین اجناس" (CORN LAWS) پر بھی اس سلسلہ میں خطِ تنسیخ کھینچا گیا۔ اس اثنا میں پارلیمانی اصلاح کا مسئلہ دوبارہ مرکزِ توجہ بننے لگا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ 1832ء کے قانونِ اصلاح کے بعد مزید اصلاحی قانون کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ مگر ان کا یہ خیال غلط نکلا۔

سولھواں باب

انیسویں اور بیسویں صدی میں
عدلیہ اور حکومتِ مقامی کی تنظیمِ جدید

(۱) عدلیہ

عدلیہ میں اصلاح کی ضرورت

انیسویں صدی کو عام طور پر اصلاحات کی صدی کہا جاتا ہے۔ نظم و نسق کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو امتدادِ زمانہ سے محتاجِ اصلاح نہ ہوگیا ہو۔ عدلیہ کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی ابھی تک وہی پرانی تنظیم چلی آرہی تھی۔ کام کی کثرت نے انفصالِ مقدمات میں تعویق و تاخیر کو ایک معمول بنا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ جدید ترقیوں کی روشنی میں عدلیہ کی تنظیم جدید ضروری ہوگئی تھی۔ عدالتوں میں متعدد انتظامی امور نظرِ ثانی کے محتاج ہوگئے تھے۔ عدلیہ کی مختلف شاخوں میں اختیارات کی واضح حدبندی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان میں آپس میں تصادم اور تضاد کی آئے دن صورتیں پیدا ہوتی تھیں۔ ان سب کو دور کرنا ضروری تھا۔ دادرسی کے کام کو زیادہ سائینٹفک بنیادوں پر رکھنے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ تنظیمی خرابیوں کی وجہ سے اہلِ مقدمہ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نظم و نسق کے دوسرے شعبوں کی طرح یہاں بھی ایسے مفت خور (SINECURIST.) عہدہ دار موجود تھے جو خزانہ سے تنخواہ تو پاتے تھے لیکن عملاً کوئی خدمت انجام نہیں دیتے تھے۔ 1818ء اور 1822ء کے درمیان ایسے متعدد عہدوں کو برخواست کر دیا گیا۔ عدالتوں کی فیس

ججوں کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ 1826ء میں اس طریقہ کو مسدود کیا گیا۔ ان کی تنخواہوں کی ادائی کا انتظام "ذخیرۂ زر محفوظ (CONSOLIDATED FUND.) سے کیا جانے لگا اور تنخواہوں کی شرحوں میں اضافہ بھی کیا گیا۔ چانسری کی عدالت بہت زیادہ محتاج اصلاح تھی۔ یہاں طرح طرح کی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ برسوں پرانے مقدمات لیت ولعل میں پڑے ہوئے تھے۔ کام میں سرعت پیدا کرنے کے لئے ایک وائس چانسلر کا عہدہ قائم کیا گیا۔ مگر اس سے اصل شکایت کا ازالہ نہ ہو سکا۔

فوجداری قانون میں اصلاح

1832ء میں قانون اصلاح پارلیمنٹ کے پاس ہونے کے بعد عدلیہ کی اصلاح کے لئے بھی فضا زیادہ ہموار ہوگئی۔ ورنہ اس سے پہلے اصلاحی تجاویز کو قدم قدم پر رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ 1836ء سے فوجداری مقدمات میں ملزم کو زیادہ سہولتیں دیئے جانے کا انتظام کیا گیا۔ اس کو اپنے وکیل کے مقرر کرنے اور اس کے خلاف پیش کردہ شہادت سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ دیا جانے لگا۔ فوجداری مقدمات میں یہ بہت مفید اصلاح تھی۔ کیونکہ اس سے ملزم کو اپنی صفائی کے پیش کرنے میں بہت مدد مل سکتی تھی۔ اس وقت بھی فوجداری قانون کچھ ایسا تھا کہ متعدد جرائم کی سزا موت تھی۔ ان سب پر نظر ثانی کی گئی اور صرف چند جرائم کے لئے موت کی سزا باقی رکھی گئی۔ قانون فوجداری کو بڑی حد تک بدل دیا گیا۔ عدالتوں کے طریقہ عمل میں اصلاحات نافذ کی گئیں تاکہ ملزم کے ساتھ انسانی سلوک کیا جا سکے اور اسے حصول انصاف میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

1907ء میں ایک فوجداری عدالت مرافعہ (COURT OF CRIMINAL APPEAL.) کا قیام عمل میں آیا۔ اور ملزمین کو بلا روک ٹوک اپیل کا حق عطا کیا گیا۔

دیوانی عدالتوں کی اصلاح

دیوانی مقدمات میں سب سے بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ مقدمات کی کارروائی میں سرعت پیدا کی جائے اور ان کے عاجلانہ یکسوئی کا انتظام کیا جائے ورنہ عام طور پر مقدمات کی رفتار بہت سست ہوتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ عدالتوں کا وہ طریقہ عمل

تھا جو ازمنۂ وسطیٰ سے چلا آرہا تھا۔ صدیوں سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ دادرسی بہت مہنگی پڑتی تھی۔ بے حساب روپیہ ضائع ہوتا تھا۔ اہلِ مقدمہ اس زیرِ باری کے خوف سے انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ 1832ء میں "کامن لاء" (COMMON LAW.) کی تینوں عدالتوں میں بہت سی اصلاحات نافذ کی گئیں جن کا مقصد عدالتی کارروائیوں کے طریقۂ کار کو آسان اور سہل بنانا تھا۔ 1852ء میں دو قوانین منظور کئے گئے جن سے ان عدالتوں کے عملہ کی ازسرِنو تنظیم کی گئی، اور طریقۂ کار میں مزید سہولتیں پیدا کی گئیں۔

1873ء سے 1910ء تک عدلیہ کی تنظیمِ جدید کے لئے متعدد قوانین پاس کئے گئے۔ موجودہ عدالتی نظام کی بنیاد انہی قوانین پر ہے۔ اس تنظیمِ جدید کا پہلا قدم 1873ء میں اٹھایا گیا جبکہ پارلیمنٹ نے سپریم کورٹ آف جڈی کیچر ایکٹ" (SUPREME COURT OF JUDICATURE ACT.) پاس کیا۔ اس قانون کے ذریعہ سے ملک کی تمام عدالتوں کو ازسرِنو جدید بنیادوں پر مربوط کیا گیا۔ سپریم کورٹ آف جڈی کیچر کو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کا مرتبہ دیا گیا لیکن اس سے اعلیٰ تر عدالت دارالامراء ہے جہاں دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات کی بعض شرائط کے ساتھ اپیل ہوسکتی ہے۔

انگلستان میں نیچے سے اوپر تک دو قسم کی عدالتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک دیوانی دوسرے فوجداری۔ یہ تقسیم نسبتاً حالیہ زمانے کی پیداوار ہے۔ عام طور پر جرائم سے متعلق مقدمات فوجداری عدالتوں میں اور سیول مقدمات دیوانی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تقسیم کو ایک قطعی حدِ فاصل نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ بسا اوقات سیول مقدمات کی سماعت فوجداری عدالتوں میں بھی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف فوجداری مقدمات کبھی کبھی سیول عدالتوں میں نمبر پر لے لئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ صورتیں استثنائی ہوتی ہیں۔

فوجداری عدالتیں

"عدالتِ منصفی" (MAGISTRATE'S COURT.) فوجداری مقدمات کے لئے سب سے چھوٹی اور ابتدائی عدالت کا کام دیتی ہے۔ ان عدالتوں کے حاکم یا تو تنخواہ یاب مجسٹریٹ ہوتے ہیں یا پھر جسٹس آف دی پیس۔ ان میں چھوٹے قسم کے جرائم کی جانچ ہوتی

ہے۔ اگر جانچ میں بظاہر جرم کا ارتکاب ثابت ہو جاتا ہے تو فرد جرم لگا کر مقدمے کو بالاتر عدالت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ان مقدمات کی اپیل کوارٹر سیشن کی عدالتوں (COURT OF QUARTER SESSION.) میں ہو سکتی ہے۔ ان کو عدالت ضلع (COUNTY COURTS.) بھی کہا جاتا ہے۔ بعض مقدمات میں یہ عدالتیں سماعت کا ابتدائی حق بھی رکھتی ہیں۔ ان کے اجلاس سال میں چار مرتبہ ہوتے ہیں۔ اگر کام زیادہ ہو تو ان کی نشستوں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ لندن اور لنکاشائر میں تو ان کے اجلاس مسلسل ہوتے رہتے ہیں انھیں ایسے مقدمات کی سماعت کا حق نہیں جن میں سزائے موت یا حبس دوام کی سزا صادر کی جا سکتی ہے۔

کوارٹر سیشن سے بالاتر عدالت اسائزس (ASSIZES.) کی ہے۔ یہ ایک قسم کی گشتی عدالت ہے۔ اس کے اجلاس سال میں تین مرتبہ بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہوتے ہیں۔ حاکم عدالت عموماً ہائی کورٹ کا جج ہوتا ہے۔ مقدمات کی سماعت کے لئے یہ حکام برابر دورہ کرتے رہتے ہیں اور فوجداری مقدمات میں جیوری سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ گشتی عدالتیں فوجداری کے علاوہ دیوانی مقدمات کی اپیل بھی سنتی ہیں۔ ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل فوجداری عدالت مرافعہ (COURT OF CRIMINAL APPEAL.) میں ہو سکتی ہے۔ یہ عدالت اصل میں عدالت العالیہ (HIGH COURT OF JUSTICE) کی ایک شاخ ہے۔ لارڈ چیف جسٹس اور "کوئینس بنچ" (QUEENS BENCH.) کے دوسرے ججوں پر یہ مشتمل ہوتی ہے۔ ویسے اس کو نیچے کی تمام عدالتوں کے خلاف بھی مرافعہ کی سماعت کا حق حاصل ہے بشرطیکہ زیر نظر مقدمہ میں کوئی قانونی نکتہ توضیح طلب ہو۔ عموماً اس کے فیصلے قطعی اور آخری ہوتے ہیں لیکن بعض خاص صورتوں میں دارالامراء کو اس کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کا حق حاصل ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے دارالامراء ملک کی اعلیٰ ترین عدالت ہے، سیول اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات کے لئے۔

دیوانی عدالتیں

سیول مقدمات کے لیے عدالت ضلع ابتدائی عدالت کا درجہ رکھتی ہے۔ ان عدالتوں کی تنظیم پہلی مرتبہ 1846ء میں عمل میں آئی۔ حاکم عدالت عموماً تنخواہ یاب عہدہ دار ہوتا ہے

اس کا تقرر لارڈ چانسلر کرتا ہے۔ عموماً یہ تنہا فیصلے کرتا ہے لیکن کبھی کبھی حسبِ ضرورت جیوری بھی استعمال کی جاتی ہے۔ جدید ترین (1958ء) صورتِ حال یہ ہے کہ پورے ملک میں اس قسم کی چار سو عدالتیں موجود ہیں۔ نچلی سطح پر تمام دیوانی کام یہی عدالتیں سنبھالتی ہیں۔ عدالت ضلع کے خلاف مرافعہ عدالت العالیہ (HIGH COURT OF JUSTICE.) میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

عدالت العالیہ

عدالت العالیہ "سپریم کورٹ" کی ایک شاخ (ڈویژن) ہے۔ سپریم کورٹ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے 1873ء میں قائم کیا گیا۔ اس کی دو شاخیں یا ڈویژن ہیں، ایک عدالت العالیہ، دوسرے عدالتِ مرافعہ (COURT OF APPEAL.)۔ عدالت العالیہ تین علٰحدہ علٰحدہ شاخوں پر مشتمل ہے۔ (۱) کوئنس بنچ ڈویژن (QUEEN'S BENCH DIVISION.)۔ (۲) چانسری ڈویژن۔ (۳) ڈویژن متعلقہ وصیت، طلاق اور بحریہ (PROBATE, DIVORCE AND ADMIRALTY DIVISION)

کوئنس بنچ ڈویژن، لارڈ چیف جسٹس اور دیگر (عموماً 24) ججوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چانسری ڈویژن کا صدر لارڈ چانسلر ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر کام دوسرے ججوں کے سپرد ہوتا ہے جو تعداد میں سات ہوتے ہیں۔ تیسری اور آخری ڈویژن کے کام کی نوعیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔

عدالتِ مُرافعہ

ہائی کورٹ کی کسی شاخ سے بھی سیول مقدمات کا مرافعہ متذکرہ صدر کورٹ آف اپیل میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ عدالت کئی ججوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کی صدارت ایسا جج کرتا ہے جو "ماسٹر آف دی رولس" (MASTER OF THE ROLLS.) کہلاتا ہے۔ اس کی مدد کے لیے آٹھ اور جج ہوتے ہیں جو لارڈس جسٹس آف اپیل (LORDS JUSTICES OF APPEAL.) کہلاتے ہیں۔ یہاں سے مقدمات دارالامرا میں بشکل اپیل لے جائے جا سکتے ہیں۔ یہ ملک کی آخری اور اعلیٰ ترین عدالت ہے۔

۲۔ حکومت مقامی

حکومتِ مقامی کی اہمیت

انگلستان کے سیاسی ادارات میں حکومت مقامی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بلیک اسٹن (BLACKSTONE.) کا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ اہلِ انگلستان کی حریت زیادہ تر مقامی ادارات کی مضبوطی اور ان کے خود اختیارانہ طرزِ حکومت کی مرہونِ منت ہے۔ قومی زندگی میں مقامی ادارات نے ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے ان ادارات کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ بعض ادارات تو ایسے ہیں کہ ان کا تسلسل سیکسن زمانے تک جا پہنچتا ہے۔ ان ادارات میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن یہ سب تبدیلیاں ایک ارتقائی زنجیر میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قدیم زمانے سے دورِ وسطیٰ تک مقامی ادارے اپنی اپنی جگہ کارکرد ضرور رہے۔ لیکن ان کا روپ بدلتا گیا۔ ان کے اختیارات اور فرائض میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ بعض ادارے کمزور پڑ گئے اور ان کی اہمیت ختم ہوگئی۔ بعض نے نیا جنم لیا۔ بہرحال حکومتِ مقامی کو موثر بنانے کے لئے ٹیوڈر زمانے سے پہلے کچھ زیادہ کام نہیں کیا گیا لیکن ٹیوڈروں نے کمزور اور ماند پڑے ہوئے مقامی ادارات کو دوبارہ جان بخشی اور قوم کی رگِ حیات میں ایک نئی جولانی پیدا کی۔ اس دور میں مقامی اداروں کو مضبوط اور طاقتور بنایا گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مقامی ذمہ داریاں مقامی لوگوں کے سپرد کر دیں۔ اس سے مقامی حکومت کا نظم ونسق بہت کارکرد اور جاندار بن گیا۔ ٹیوڈروں نے جو انتظامی مشینری بنائی تھی وہ امتدادِ زمانہ کی وجہ سے انیسویں صدی تک سماج کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ رہی۔ مقامی اداروں کے اختیارات و فرائض کی کچھ اس طرح توسیع عمل میں آتی رہی تھی کہ کسی منضبط نظام کی بجائے ایک بے نظمی سی پیدا ہوگئی تھی۔ اور انیسویں صدی کے اوائل سے یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی کہ مقامی حکومت کی مشینری میں جو کمزوریاں اور خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو اولین فرصت میں دور کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ اس صدی میں مختلف قوانین کے ذریعہ سے مقامی حکومت کی اصلاح اور تنظیم جدید کا انتظام کیا گیا۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی میں بھی جاری رہا۔

بہت سی اصلاحات اس صدی کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے عمل میں لائی گئیں۔

مقامی ادارات کی تنظیمِ جدید

تنظیم جدید کی طرف پہلا قدم 1835ء میں اٹھایا گیا جبکہ میونسپل کارپوریشن ایکٹ پاس کیا۔ اس کے ذریعہ سے بارو (شہر) کے نظم و نسق کو درست کیا گیا۔ باروز یا شہروں کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کیونکہ زمانۂ قدیم سے ان کو دارالعوام کے ممبروں کے منتخب کرنے کا حق حاصل تھا۔ پارلیمانی اصلاح کے بعد ان کے نظم و نسق میں تبدیلیاں ناگزیر ہو گئی تھیں۔ 1888ء میں لوکل گورنمنٹ ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس کے ذریعہ سے ضلع یا کونٹی (COUNTY.) کے نظم و نسق کو عصری ضروریات کے مطابق کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1894ء میں ایک اور لوکل گورنمنٹ ایکٹ کے ذریعہ سے پیرش (PARISH.) کی مجلسوں کی تنظیم اور ان کے اختیارات کی حدبندی کی گئی۔ 1929ء اور پھر 1933ء میں حکومت مقامی سے متعلق دو مرتبہ قوانین پاس کئے گئے۔ اول الذکر قانون کے ذریعہ سے مقامی اداروں کو مالی امداد کے بہم پہنچانے کے طریقے متعین کئے گئے۔ موخرالذکر قانون ایک جامع قانون ہے۔ مقامی حکومت کے مختلف اجزا کو باہم مربوط کرکے ان کے اختیارات کی اس میں واضح حدبندی کی گئی۔ 1946ء میں شاہراہوں کا انتظام منسٹر آف ٹرانسپورٹ کے سپرد کیا گیا۔ اور اسی سال نیشنل ہلت سروس ایکٹ (NATIONAL HEALTH SERVICE ACT) پاس کیا گیا۔ اس کے ذریعہ سے ہسپتالوں کا انتظام "علاقہ داری بورڈس" (REGIONAL BOARD) کے حوالے کیا گیا۔ اور یہ بات مقامی ادارات کے فرائض میں داخل کی گئی کہ وہ معمر اور معذور افراد اور اندھوں، بہروں اور گونگوں کی دیکھ بھال کا انتظام کریں۔

متذکرہ صدر قوانین کی بنا پر مقامی حکومت کا جو ڈھانچہ تیار ہوا اور جس طرح وہ اس وقت رائج ہے اس کی کچھ تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

کونٹی یا ضلع

انگلستان میں حکومتِ مقامی کی سب سے بڑی وحدت "ضلع" یا کونٹی کہلاتی ہے۔ ضلعوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو تاریخی اضلاع جو اینگلو سیکسن زمانے کی یادگار ہیں۔

دوسرے انتظامی اضلاع :- تاریخی اضلاع اصل میں قدیم زمانے کے شائرس (SHIRES) ہیں۔ ان کی تعداد باون ہے۔ 1888ء سے مقامی حکومت میں ان کی کوئی انتظامی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ البتہ پارلیمنٹ کے حلقہ ہائے انتخاب کی حیثیت سے یہ ابھی تک برقرار ہیں۔ ان کے لئے کوئی کونٹی کونسل بھی نہیں ہوتی۔

1888ء کے قانون نے 62 انتظامی اضلاع بنائے۔ ہر ضلع اپنی ایک کونسل یا مجلس رکھتا ہے۔ ضلع کے انتظامی امور اسی سے متعلق ہوتے ہیں۔ کونسل کے اراکین تین سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد کا انحصار ضلع کی آبادی پر ہے۔ کونسل آلڈرمین (ALDERMEN) کو منتخب کرتی ہے۔ ان کی تعداد کونسلرس کی تعداد کا چھٹواں حصہ ہوتی ہے۔ آلڈرمن چھ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے نصف ہر تین سال کے بعد سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ کونسلرس اور آلڈرمن کے متفقہ اجلاس میں کونسل کا صدر (CHAIRMAN) منتخب کیا جاتا ہے۔ کونٹی کونسل کے سال میں چار مرتبہ اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔

کونٹی کونسل کو مقامی معاملات میں وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ وہ ضمنی قوانین (BYE - LAWS) بناتی ہے۔ اخراجات کے لئے روپیہ کی منظوری دیتی ہے۔ اس کو بعض مقامی محاصل کے عاید کرنے کا بھی اختیار ہے۔ مقامی پولیس اور ابتدائی اور سکنڈری تعلیم کا انتظام، متعدی امراض کی روک تھام، اوزان اور پیمانوں کی نگرانی، پلوں اور سڑکوں کی نگہداشت، تادیب خانوں اور پاگل خانوں کی برقراری، سوائے شراب کے دیگر اشیاء کی فروخت کے لئے اجازت ناموں کی اجرائی غرض یہ اور اسی قسم کے بہت سے کام کونٹی کونسل کے فرائض میں داخل ہیں۔ کونسل اپنے طور پر ایک تنخواہ یاب وسیع انتظامی عملہ مقرر کرتی ہے۔ اس عملہ کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے ضلع کے نظم ونسق کا معیار ہمیشہ بلند رہا کیا ہے۔

کونٹی بارو (COUNTY BOROUGH)

"کونٹی بارو" ایسے بڑے بڑے شہر ہیں جو حکومت مقامی میں اپنی علحدہ وحدت رکھتے ہیں۔ دوسرے کمتر درجہ کے شہروں کی طرح یہ ضلع (COUNTY.) کے

نظم ونسق کے ماتحت نہیں ہوتے۔ کونٹی بارو کا درجہ صرف ایسے شہروں کو دیا جاتا ہے جو آبادی اور وسائل کے اعتبار سے اس قابل سمجھے جاتے ہیں کہ مقامی حکومت کی ذمہ داریاں ان کو سونپی جاسکیں۔ 1888ء کے قانون کے ذریعہ سے ایسے شہر جو پچاس ہزار کی آبادی رکھتے تھے اس درجہ کے مستحق قرار دیئے گئے۔ چنانچہ ایسے تمام شہروں کو کونٹی باروز کی حیثیت دے دی گئی۔ 1926ء میں آبادی کی شرط پچاس ہزار سے بڑھاکر پچھتر ہزار کردی گئی۔ اب تو یہ صورتِ حال ہے کہ بعض کونٹی باروز ایسے ہیں جن کی آبادی لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔

نظم ونسق میں یہ ضلع سے بالکل علٰحدہ اور آزاد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی حکومت مقامی کا ڈھانچہ ضلع کے خطوط پر قائم کیا گیا ہے۔ کم وبیش وہی تنظیم، وہی اختیارات اور وہی فرائض کونسلرز اور آلڈرمین پر مشتمل کونسل (مجلس) پورے نظم ونسق کی ذمہ دار ہے۔ یہ کونسل علاوہ دوسری خدمات کے حمل ونقل، الکٹرسٹی، سربراہی، آب وگیاس کا بھی انتظام کرتی ہے۔

ڈسٹرکٹ یا تعلقہ

ضلع اور کونٹی بارو سے نچلی سطح پر تعلقے (DISTRICTS.) قائم کئے گئے ہیں۔ تعلقے دو قسم کے ہیں۔ (۱) شہری (URBAN) اور (۲) دیہی (RURAL).

حکومتِ مقامی کے اغراض کے لئے ڈسٹرکٹس (تعلقات) کا قیام 1894ء کے قانون (متذکرہ صدر) کی رو سے عمل میں آیا۔ اس وقت (1960ء) ان دونوں کی تعداد علی الترتیب 572 اور 475 ہے۔ شہری تعلقہ (URBAN DISTRICT.) اور بارو میں کوئی خاص اصولی فرق نہیں، دونوں کی حیثیت چھوٹے شہروں کی سی ہے۔ جب کسی اربن ڈسٹرکٹ کی آبادی بڑھ جاتی ہے تو اسے بارو کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اربن ڈسٹرکٹ (شہری تعلقہ) کے باشندے اپنی کونسل کے اراکین کو منتخب کرتے ہیں۔ ہر پیرش (PARISH.) سے ایک کونسلر منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کونسل میں آلڈرمین نہیں ہوتے۔ البتہ کونسل اپنے صدر کو آپ منتخب کرتی ہے۔ اس عہدہ کے لئے کوئی ایسا آدمی بھی منتخب کیا جاسکتا ہے جو کونسل کا رکن نہیں ہے۔

دیہی تعلقہ (.RURAL DISTRICTS) کئی پیرشوں (مواضعات) کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہاں کا انتظام بھی ایک منتخبہ کونسل کے سپرد ہے۔ اس کا کام سربراہی آب، صحتِ عامّہ، امورِ متعلقہ، حفظِ صحت اور مقامی سڑکوں کی دیکھ بھال اور نگرانی ہے۔

مواضعات .PARISHES

حکومتِ مقامی کے تعلق سے یہ سب سے چھوٹی وحدت ہے۔ اس کے اختیارات بھی محدود ہیں۔ ایسی پیرشیں جن کی آبادی تین سَو سے زیادہ ہے اپنی ایک کونسل رکھتی ہیں جو "پیرشس کونسل" کہلاتی ہے۔ کونسل کے اراکین کی تعداد کا انحصار پیرش کی آبادی پر ہے۔ سال میں تین مرتبہ اس کے اجلاس ہوتے ہیں۔ اور وہ مقامی ضروریات کی تکمیل کا انتظام کرتی ہے۔ سڑکوں پر روشنی، مقامی سڑکوں کی نگہداشت، کتب خانوں کی فراہمی، صفائی اور حفظانِ صحت کے اُمور اس کے فرائض میں داخل ہیں۔

بارو (شہر) BOROUGH

بارو ایک ایسا درمیانی شہر ہے جو کونٹی بارو سے کم اور اربن ڈسٹرکٹ سے اُونچا درجہ رکھتا ہے۔ بارو اور کونٹی بارو میں اصل فرق اختیارات کا ہے۔ تنظیم اور تشکیل کا نہیں۔ بارو انتظامی کونٹی (.ADMINISTRATIVE COUNTY) کا ایک جزو اور اس کا ماتحت ہوتا ہے۔ کونٹی بارو جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے انتظامی معاملات اور دیگر تمام امور میں کونٹی سے بالکل علٰحدہ اور آزاد ہوتا ہے۔ بارو میں تمام اختیارات کی حامل کونسل ہوتی ہے۔ کونسل، کونسلرز اور آلڈرمین پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اس کا صدر میئر (.MAYOR) کہلاتا ہے۔ اراکین کونسل تین سال کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ ان کا راست انتخاب عمل میں آتا ہے۔ ان کی تعداد کا تیسرا حصّہ ہر سال کے اختتام پر سبکدوش ہوجاتا ہے۔ اس طرح کونسل کے لئے عملاً

سالانہ انتخاب ہوتا رہتا ہے۔ 1907ء سے عورتوں کے انتخاب کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ آج کل بہت سی عورتیں مختلف باروز میں کونسلرز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بارو کی آبادی بیس ہزار (20000) سے ایک لاکھ (100000) تک ہوسکتی ہے۔ بارو کونسل میں ایک تہائی اراکین آلڈرمن ہوتے ہیں۔ ان کا انتخاب چھ (6) سال کے لئے اراکین کونسل کرتے ہیں۔ ہر دوسرے سال ان میں سے ایک تہائی سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ میئر (MAYOR) کونسل کا صدرنشین ہوتا ہے۔ اس کے فرائض انتظامی نہیں۔ عہدہ داروں کے تقرر اور برطرفی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عام طور پر کسی مالدار آدمی کو میئر منتخب کیا جاتا ہے اور اس کو کوئی مشاہرہ نہیں دیا جاتا۔

بارو کونسل کے اجلاس حسب ضرورت مہینے میں ایک بار، دوبار یا ہر ہفتہ منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ تمام کام کمیٹیوں کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے — ان کمیٹیوں کا انتخاب اراکین کونسل کرتے ہیں۔ کمیٹیاں خود اپنے صدر چن لیتی ہیں۔

بارو کونسل کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ وہ ضمنی قوانین بناتی ہے۔ مالیہ کی فراہمی اور اس کے خرچ کا انتظام کرتی ہے۔ اور نظم و نسق کی مشینری چلاتی ہے۔ وہ بائی لاز (ضمنی قوانین) اور آرڈی ننس نافذ کرسکتی ہے۔ مقامی محصول عاید کرتی ہے۔ اور خرچ کی منظوری یہ تخصیص رقوم دیتی ہے۔ مرکزی حکام کی اجازت سے وہ اپنی ذمہ داری پر قرض بھی حاصل کرتی ہے۔ اس کے تحت ایک وسیع تنخواہ یاب عملہ کام کرتا ہے۔

انگلستان کے مقامی اداروں کو بجا طور پر بہت سراہا جاتا ہے۔ بعض باہر کے مبصرین نے بھی جن میں پریسیڈنٹ لول (PRESIDENT LOWELL) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان اداروں کی اعلیٰ کارکردگی کی بڑی ستائش کی ہے۔ انگلستان میں جمہوری اقدار اور جمہوری میلانات کی ترقی پذیری زیادہ تر مقامی اداروں کی حیات بخش کارکردگی کی مرہونِ منت رہی ہے۔ اہلِ انگلستان نے یہیں سے درسِ جمہوریت حاصل کیا اور صدیوں تک جمہوریت یہیں نشو و نما پاتی رہی اور رفتہ رفتہ کچھ اس طرح پروان چڑھی کہ قومی زندگی کی نس نس میں جاگزیں ہوگئی۔ انگلستان کا جمہوری نظام بلاشبہ آزاد مقامی اداروں کی دین ہے۔

سترھواں باب

پارلیمانی اصلاح

انیسویں صدی کے نصف آخر میں

چارٹسٹ یا منشوری تحریک

لارڈ جان رسل نے 1832ء کے قانونِ اصلاح کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کے بعد کسی مزید اصلاح کی ضرورت نہ ہوگی۔ قوم کی نیابت کی حد تک اسے وہ لفظِ آخر سمجھتا تھا۔ رسل ایک ترقی پسند وہگ تھا۔ اس قانون کو منظور کرانے میں اس نے بہت سرگرم حصہ لیا تھا۔ پارلیمانی اصلاح کے حامی ہونے کے باوجود وہگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب اس سمت میں مزید کسی تبدیلی یا تغیر کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ اس اصلاح کو اصلاح مختتم سمجھ کر اس سے آگے بڑھنا خلافِ مصلحت اور بے ضرورت خیال کرتے تھے۔

قانونِ اصلاح (1832ء) کی منظوری کے بعد کم و بیش ربع صدی تک ملک میں مزید اصلاحی اقدامات کے لئے کچھ زیادہ سرگرمی یا جوش و خروش کے آثار نظر نہیں آئے لیکن اس زمانے میں بھی ایسے لوگ اور ایسی چھوٹی چھوٹی جماعتیں موجود تھیں جو نہ صرف اس قانون کو ناقص سمجھتی تھیں بلکہ اس کو مبنی بر انصاف تصوّر نہیں کرتی تھیں۔ یہ ایسا طبقہ تھا جس کے سیاسی معتقدات میں انتہاپسندی (RADICALISM —) پائی جاتی تھی۔ انھوں نے قانون اصلاح کے پاس ہونے کے بعد سے ہی ایک تحریک چلانی شروع کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ کے تعلق سے مزید اصلاحات روبہ عمل لائی جائیں۔ انھوں نے اپنے مطالبات کو "عوامی منشور" (PEOPLE'S CHARTER) کے نام سے پیش کیا چنانچہ

یہ لوگ "چارٹسٹ" کہلاتے ہیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ

(۱) ہر بالغ مرد کو رائے دہی کا حق دیا جائے۔
(۲) خفیہ رائے دہی کا طریقہ رائج کیا جائے۔
(۳) دارالعوام کے لئے سالانہ انتخابات منعقد کئے جائیں۔
(۴) اراکین کو تنخواہیں دی جائیں تاکہ غریب طبقہ کے لوگ بھی پارلیمنٹ کے ممبر بن سکیں۔
(۵) اراکین کے صاحب جائیداد ہونے کا لزوم برخواست کیا جائے۔ اور
(۶) ملک بھر میں مساوی اور یکساں حلقہ ہائے انتخاب بنائے جائیں۔

یہ مطالبات اس زمانے کے لحاظ سے بہت انقلاب آفرین سمجھے گئے۔ ان لوگوں نے اس کے لئے بھاری ایجی ٹیشن چلایا۔ پارلیمنٹ کو ہزارہا دستخطوں کے ساتھ عرضداشتیں دیں۔ بلوے اور ہنگامے کئے۔ لیکن معتدل سیاست دانوں کا طبقہ جو اس وقت پارلیمنٹ پر چھایا ہوا تھا' ان مطالبات کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ خود ملک میں اس کے لئے کوئی وسیع پشت پناہی نہیں تھی۔ اس لئے چارٹسٹ تحریک 1839ء کے بعد بے جان اور مفلوج ہو کر رہ گئی۔ گو یہ کہنا پڑے گا کہ ان کے بیشتر مطالبات اس وقت نہ سہی مگر آنے والے زمانے میں یکے بعد دیگرے قبول کر لئے گئے۔

سابقہ قانون اصلاح کی خامیاں

اگرچہ چارٹسٹ تحریک ترقی اور اصلاح کی رفتار کو تیز تر کرنے میں کامیاب نہیں رہی۔ اور ملک نے اس کا سرد مہری سے استقبال کیا۔ لیکن سابقہ قانون اصلاح کے بیس پچیس سال بعد جب ایک نئی نسل میدان عمل میں داخل ہوئی تو پارلیمانی اصلاح کا مسئلہ پھر مرکز توجہ بننے لگا۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ رائے دہی کی اہلیت کے جو معیارات قائم کئے گئے ہیں وہ مہمل بے معنیٰ اور بے ڈھنگے ہیں۔ نمائندگی کے لئے کوئی ایسے اصول دریافت نہیں کئے گئے جنھیں معقولیت یا انصاف پر مبنی کہا جا سکتا ہو۔ یہ بھی نہیں کیا گیا کہ یکساں سماجی اور معاشی مرتبہ رکھنے والے لوگوں کو ہر جگہ حق رائے دہی حاصل ہو جائے۔ مثال کے طور پر شہروں میں " دس پونڈ سالانہ" کی جو شرط رکھی گئی تھی اس کے نتیجہ میں بعض عجیب صورتیں پیدا ہوئیں۔ ایسے بڑے شہروں میں جہاں کرایوں کی شرح اونچی تھی لوگ نسبتاً کثیر تعداد

میں حق رائے دہی سے مستفید ہوئے۔ چھوٹے مقامات پر صورت حال برعکس تھی بمعیارِ اہلیت یکساں ہوتے ہوئے بھی ووٹ کا حاصل ہونا یا نہ ہونا بعض خارجی اسباب وحالات کے تابع تھا۔ معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے سکہ کی قیمت برابر گرتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے رائے دہندوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہ بجائے خود اچھی بات تھی، لیکن اب بھی جو لوگ ووٹ سے محروم تھے اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ 1832ء کے قانون کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ سابق میں چھوٹے صناع اور کاریگر کو جو ووٹ حاصل تھا اس سے وہ محروم ہوگیا تھا۔ لہٰذا اس طبقہ میں سخت بے چینی پیدا ہونے لگی۔

دوسرا قانونِ اصلاح 1867ء

1852ء سے حکومت اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہونے لگی اور 1860ء تک چار مسودات پارلیمنٹ میں پیش کئے گئے۔ ان میں سے تین مسودات لارڈ جان رسل نے پیش کئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کے دباؤ کے تحت رسل کو اپنے خیالات میں تبدیلی کرنی پڑی تھی اور اب وہ اصلاح کو ناگزیر سمجھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ رائے عامہ پالیمانی اصلاح کے موافق ہوتی جارہی تھی۔ یہ مسودات کامیاب نہیں ہوسکے پارلیمنٹ ابھی کسی بڑی تبدیلی کے لئے تیار نہیں تھی۔ 1866ء تک لارڈ جان رسل جواب ارل رسل تھا وزیر اعظم ہوچکا تھا۔ لارڈ پامرسٹن کا انتقال ہوچکا تھا جو ایک زمانہ تک اصلاح کی راہ میں سدِراہ بنا رہا۔ رسل نے بحیثیت وزیر اعظم 1866ء میں جو مسودہ اصلاح پیش کیا اس کو دارالعوام نے مسترد کر دیا۔ رسل کی حکومت مستعفی ہوگئی اور قدامت پسندوں نے لارڈ ڈاربی کی سرکردگی میں لبرل حکومت کی جگہ لی۔ اس وزارت میں ڈیزریلی (DISRAELI) وزیر خزانہ تھا۔ اگرچہ نئی حکومت قدامت پسندوں کی تھی لیکن ملک میں عام اور شدید مطالبہ کے نظر کرتے انھوں نے اپنا تازہ مسودہ اصلاح پیش کیا۔ ڈیزریلی نے ابتداء ہی میں یہ تجویز پیش کی کہ اس مسئلہ کو دونوں پارٹیاں غیر نزاعی بناکر اصلاح کی تجویز کو کامیاب بنائیں۔ لبرل پارٹی نے اس پیش کش کو قبول کیا اور بغیر کسی دقت کے یہ دوسرا مسودۂ قانون دارالعوام میں بھی پاس ہوگیا اور بعد میں دارالامراء میں بھی۔ دارالامراء میں اس کی کوئی مخالفت نہیں کی گئی کیونکہ اس وقت ایک قدامت پسند حکومت برسرکار تھی۔ اگر لبرل برسر عہدہ ہوتے تو شاید اس

آسانی سے یہ مسودہ پاس نہ ہوسکتا

اس کے اہم خدوخال

دوسرا قانونِ اصلاح 1867ء میں پاس ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حق رائے دہی کو زیادہ عام کیا جائے۔ اس کے لئے ملکیت، جائیداد یا اور دوسری قسم کی شرطیں جو 1832ء میں ضروری سمجھی گئی تھیں ان میں ایسی تبدیلیاں لائی گئیں کہ نسبتاً کم تر مالی حیثیت کا آدمی بھی ووٹ دینے کے قابل ہوسکا۔ اضلاع میں سابقہ قانون کی رو سے دس پونڈ سالانہ کی مالیتی زمین یا جائیداد کو معیارِ اہلیت قرار دیا گیا تھا۔ اب اس کو گھٹا کر صرف پانچ پونڈ سالانہ کی شرط باقی رکھی گئی۔ سابق میں قلیل المدتی پٹہ دار کسان یا قابضِ جائیداد کے لئے پچاس پونڈ سالانہ زرِ تحصیل کی شرط تھی۔ اس کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور طبقہ کو حقِ رائے دہی عطا کیا گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سالانہ بارہ پونڈ کے مالیتی مکان یا جائیداد پر قابض تھے۔ اب ان کو بھی ووٹ کا حق حاصل ہوگیا۔ ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اضلاع میں رائے دہندوں کی تعداد پانچ لاکھ چالیس ہزار سے سات لاکھ نوّے ہزار ہوگئی۔

شہروں میں بلاتخصیصِ مالیت ہر ایسے شخص کو ووٹ حاصل ہوگیا جس کے قبضہ میں کوئی رہائشی مکان ہو، بلالحاظ اس امر کے کہ یہ قبضہ مالکانہ ہے یا بحیثیت کرایہ دار کے۔ اس کے علاوہ ایسے اشخاص جو کمروں میں بحیثیت کرایہ دار (LODGER —) اقامت گزیں تھے اور جو سالانہ دس پونڈ کرایہ ادا کرتے تھے، اب حقِ رائے دہی سے استفادہ کرنے کے قابل ہوگئے۔ ان دونوں صورتوں میں صرف قبضہ کافی نہیں تھا بلکہ رہائش لازمی رکھی گئی تھی البتہ دس پونڈ مالیتی جائیداد کے قابضین کو 1832ء کے قانون کی رُو سے جو حقِ رائے دہی دیا گیا تھا اس کو اسی طرح برقرار رکھا گیا۔ اس میں رہائش کا لزوم نہیں تھا۔ شہروں میں ان نئی شرائط کے تحت رائے دہندوں کی تعداد دوگنی ہوگئی — اور خصوصیت کے ساتھ ماہر کاریگروں کا طبقہ جو پہلے ووٹ سے محروم ہوگیا تھا کثیر تعداد میں اس سے مستفید ہوا۔ اس کا واضح اثر ان شہروں میں ظاہر ہوا جہاں بڑی بڑی صنعتیں مرکوز تھیں۔ مجموعی حیثیت سے ووٹوں کی تعداد یہاں اضلاع کے مقابلہ میں پچاس فیصد

زیادہ ہوگئی۔ حالانکہ شہروں کی آبادی اضلاع کی آبادی سے بہت کم تھی۔

ان انتظامات کے ساتھ ساتھ شہروں اور اضلاع کے حقِ نیابت میں بلحاظِ آبادی کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ متعدد چھوٹے شہروں کا حقِ نیابت چھین لیا گیا۔ اس طرح باون نشستیں تقسیم جدید کے لئے حاصل کی گئیں۔ ان میں سے پچیس اضلاع پر تقسیم کی گئیں۔ انیس بڑے شہروں کو۔ ایک لندن یونیورسٹی کو۔ دو اسکاچستانی یونیورسٹیوں کو۔ اور باقی پانچ اسکاٹ لینڈ کو دی گئیں۔ اس تقسیم سے اسکاٹ لینڈ کی نشستوں میں یونیورسٹیوں کو شامل کرکے سات کا اضافہ کیا گیا۔ اس کی تکمیل کے لئے انگلستان اور آئرلینڈ کی نشستوں میں کمی کی گئی۔ پانچ انگلستان سے لی گئیں اور دو آئرلینڈ سے۔

اصلاح کے نتائج

1867ء کے قانون نے دارالعوام کو عوامی رائے کا زیادہ تابع کردیا۔ عوام کے بڑے بڑے گروہ جنھیں اب حقِ رائے دہی حاصل ہوا تھا وہ پارلیمنٹ کی مشینری کو اپنے مسائل اور اپنی مشکلات کے حل کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ اس بات کے خواہاں تھے کہ معاشی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قانون سازی کے ذریعہ سے ازسرِنو منظم کیا جائے اور ان معاملات میں عدم مداخلت (LAISSEZ FAIRE.) کی پالیسی کو ترک کردیا جائے۔ جمہوریت ایک نئی قوت کے ساتھ اُبھر رہی تھی۔ شخصی اقتدارِ اعلیٰ کا تصور تو زمانہ ہوا مِٹ چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب پالیمانی اقتدارِ اعلیٰ PARLIAMENTARY SOVEREIGNTY) عوامی اقتدارِ اعلیٰ (POPULAR SOVEREIGNTY) کے لئے جگہ چھوڑ رہا تھا۔ دارالعوام اس نئے مقتدرِ اعلیٰ کے مسلسل دباؤ میں تھا۔ رائے دہندوں کی خواہش یہ تھی کہ ان کے منتخب کردہ اراکین اپنے قول و فعل اور اپنی پالیسیوں کے لئے راست ان کے سامنے ذمہ دار رہیں اور ان کے خیالات اور رجحانات کی صحیح ترجمانی کریں۔ اس میں سرِمو کوئی فرق نہ آئے۔ سابق میں دارالعوام اگرچہ مختلف علاقوں سے منتخب ہوتا تھا مگر اس کے اراکین پوری قوم کے نمائندے سمجھے جاتے تھے اور قومی مسائل پر ضروری سوچ بچار اور بحث و تحیص کے بعد اپنی رائے قائم کرتے اور اس پر عمل کرتے۔ ان پر ان کے منتخب کرنے والوں کا راست دباؤ نہیں ہوا کرتا تھا۔ اب صورتِ حال دوسری ہوگئی۔ ہر حلقۂ انتخاب (CONSTITUENCY)

کے رائے دہندے یہ چاہتے تھے کہ ان کا منتخب کردہ رُکن ہر وقت اپنے آپ کو ان کی رائے سے ہم آہنگ رکھے ۔ اس کو وہ اپنا وکیل سمجھنے لگے ۔ اس کا کام ان کی رائے اور ان کے فیصلوں کو روبہ عمل لانا تھا ۔ وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کا منتخب کردہ رُکن اپنی پارٹی کا بھی پابند اور وفادار رہے گا کیوں کہ انھوں نے اس کو پارٹی کے اساس پر منتخب کیا تھا ۔ اس 1867ء کے بعد سیاسی پارٹیوں میں زیادہ سخت نظم وضبط پیدا ہوا ۔ اور اراکین پر ان کا کنٹرول بڑھ گیا ۔ یہ سب آثار جمہوری نظام کی ترقی کے تھے ۔ بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے ملک میں راست جمہوریت (DIRECT DEMOCRACY) کے میلانات کو تقویت حاصل ہو رہی تھی لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ نتائج یکایک یا فوراً ظہور پذیر ہو گئے ۔

یہ علامات صرف نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور آئندہ ترقی کی اُڑتی سی خبر دیتے ہیں ۔ نظامِ سیاست میں تاج اور دارالامراء کا موقف تیزی سے بدل رہا تھا ۔ امورِ سلطنت میں ان دونوں کا اثر واقتدار زائل ہوتا جا رہا تھا ۔ دارالعوام اور وزراء کی نظریں اب بادشاہ یا دارالامراء پر نہیں بلکہ اپنے منتخب کرنے والوں پر بھی رہنے لگیں ۔ 1832ء کا قانون جمہوریت نہیں لا سکا تھا لیکن 1867ء کے قانون نے اس کو بہت بڑی حد تک وجود پذیر کر دیا ۔

بعض دیگر اصلاحات

یہ بات ناگزیر تھی کہ پارلیمانی اصلاح کا اثر قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ہلچل پیدا کرے ۔ اور جہاں جہاں ضرورت ہو ان میں بھی ضروری اصلاحات بروئے عمل لائی جائیں یہ کام زیادہ تر گلیڈسٹن کے دورِ وزارت میں ہوا ۔ 1868ء کے انتخابات میں لبرل پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیابی ہوئی ۔ گلیڈسٹن وزیرِ اعظم ہوا ۔ یہ وزارت 1874ء تک برسرِ کار رہی ۔ نئی حکومت نے نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں ایک وسیع اصلاحی پروگرام کا آغاز کیا ۔ آئرلینڈ کے تعلق سے دو اہم قوانین پاس کئے گئے ۔ ایک کا تعلق کلیسائے آئرلینڈ کی مسدودی[1] سے تھا ۔ اور دوسرے کا بندوبست اراضی آئرلینڈ[2] سے ۔ موخرالذکر قانون کے

---

1. DISESTABLISHMENT OF THE IRISH CHURCH.
2. IRISH LAND BILL.

ذریعہ سے کاشتکار کے موقف کو قدرے بہتر بنایا گیا اور اس کو کچھ قانونی تحفظ اور ضمانتیں عطا کی گئیں۔ آئرلینڈ کی بگڑی ہوئی حالت کے مدنظر یہ اصلاحات ناگزیر ہوگئی تھیں۔ حالیہ پارلیمانی اصلاح نے کثیر تعداد میں ایسے لوگوں کو ووٹ عطا کیا تھا جو اَن پڑھ اور تعلیم سے نابلد تھے۔ اس لئے اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ تعلیم سے متعلق ایک جامع قانون وضع کیا گیا اور ایک جدید تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی گئی — غیر مقلدین (NON-CONFIRMISTS —) کے لئے یونیورسٹیوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اس ضمن میں ان پر جو پابندیاں تھیں برخواست کر دی گئیں: فوجی عہدوں کی خریدی کا رواج مسدود کر دیا گیا۔ اصلاحی قوانین کے ذریعہ سے عدلیہ کے نظام میں دوررس اور وسیع تبدیلیاں کی گئیں۔ اسی ضمن میں حق رائے دہی کو وسیع تر کرنے کی باتیں بھی کچھ سُنی جانے لگی تھیں۔ اور پارلیمنٹ میں اس کے لئے تحریکات بھی پیش کی گئیں۔

تیسرا قانونِ اصلاح 1884ء

1880ء میں نئے انتخابات کے بعد گلیڈسٹن نے دوسری مرتبہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس انتخاب میں لبرل بڑی تعداد میں منتخب ہوئے۔ اس طرح حکومت کو دارالعوام میں وسیع تائید حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب قوم مزید پارلیمانی اصلاح کے لئے بے چین ہے۔ وہ اس سمت میں ایک اور چھلانگ لگانا چاہتی تھی۔ 1867ء کے قانون نے ملک کو جمہوریت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا تھا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ قوم کے ایسے طبقات اور گروہ جو اب بھی ووٹ سے محروم تھے اپنی اس حالت پر قانع نہیں رہ سکتے تھے۔ زرعی مزدور اب بھی حق رائے دہی سے محروم تھا۔ ایسے صنعتی مزدور بھی ووٹ سے محروم تھے جو اُن شہروں میں رہتے تھے جنھیں اب تک پارلیمنٹ میں حق نیابت حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ صریحاً ناانصافی تھی۔ اصلاح سے متعلق سابق میں جو بدگمانیاں تھیں وہ دُور ہوگئی تھیں۔ اس سے نہ قومی نظام حیات درہم برہم ہُوا اور نہ خونین انقلابات آئے۔ اس پُرسکون ترقی نے لوگوں کی ہمتیں بلند کیں۔ اب خوف و دہشت کا احساس زائل ہوچکا تھا۔ قدامت پسند پارٹی بھی اصولاً اب اصلاح کی مخالف نہیں تھی بلکہ وہ صرف اس کی رفتار کو قدرے سست رکھنا چاہتی تھی۔

کے رائے دہندے یہ چاہتے تھے کہ ان کا منتخب کردہ رُکن ہر وقت اپنے آپ کو ان کی رائے سے ہم آہنگ رکھے۔ اس کو وہ اپنا وکیل سمجھنے لگے۔ اس کا کام ان کی رائے اور ان کے فیصلوں کو روبہ عمل لانا تھا۔ وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کا منتخب کردہ رُکن اپنی پارٹی کا بھی پابند اور وفادار رہے گا کیوں کہ انھوں نے اس کو پارٹی کے اساس پر منتخب کیا تھا۔ اس سے 1867ء کے بعد سیاسی پارٹیوں میں زیادہ سخت نظم و ضبط پیدا ہوا۔ اور اراکین پر ان کا کنٹرول بڑھ گیا۔ یہ سب آثار جمہوری نظام کی ترقی کے تھے۔ بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے ملک میں راست جمہوریت (DIRECT DEMOCRACY) کے میلانات کو تقویت حاصل ہو رہی تھی لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ نتائج یکایک یا فوراً ظہور پذیر ہو گئے۔

یہ علامات صرف نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور آئندہ ترقی کی اُڑتی سی خبر دیتے ہیں۔ نظام سیاست میں تاج اور دارالامراء کا موقف تیزی سے بدل رہا تھا۔ امورِ سلطنت میں ان دونوں کا اثر و اقتدار زائل ہوتا جا رہا تھا۔ دارالعوام اور وزراء کی نظریں اب بادشاہ یا دارالامراء پر نہیں بلکہ اپنے منتخب کرنے والوں پر جمی رہنے لگیں۔ 1832ء کا قانون جمہوریت نہیں لا سکا تھا لیکن 1867ء کے قانون نے اس کو بہت بڑی حد تک وجود پذیر کر دیا۔

بعض دیگر اصلاحات

یہ بات ناگزیر تھی کہ پارلیمانی اصلاح کا اثر قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ہلچل پیدا کرے۔ اور جہاں جہاں ضرورت ہو ان میں بھی ضروری اصلاحات بروئے عمل لائی جائیں۔ یہ کام زیادہ تر گلیڈسٹن کے دورِ وزارت میں ہوا۔ 1868ء کے انتخابات میں لبرل پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیابی ہوئی۔ گلیڈسٹن وزیراعظم ہوا۔ یہ وزارت 1874ء تک برسرِکار رہی۔ نئی حکومت نے نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں ایک وسیع اصلاحی پروگرام کا آغاز کیا۔ آئرلینڈ کے تعلق سے دو اہم قوانین پاس کئے گئے۔ ایک کا تعلق کلیسائے آئرستان کی مسدودی سے[1] تھا۔ اور دوسرے کا بندوبست اراضیٔ آئرلینڈ سے[2]۔ موخرالذکر قانون کے

---

1. DISESTABLISHMENT OF THE IRISH CHURCH.
2. IRISH LAND BILL.

ذریعہ سے کاشتکار کے موقف کو قدرے بہتر بنایا گیا اور اس کو کچھ قانونی تحفظ اور ضمانتیں عطا کی گئیں۔ آئرلینڈ کی بگڑی ہوئی حالت کے مدنظر یہ اصلاحات ناگزیر ہو گئی تھیں۔ حالیہ پارلیمانی اصلاح نے کثیر تعداد میں ایسے لوگوں کو ووٹ عطا کیا تھا جو ان پڑھ اور تعلیم سے نابلد تھے۔ اس لئے اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ تعلیم سے متعلق ایک جامع قانون وضع کیا گیا اور ایک جدید تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی گئی ۔۔۔ غیر مقلدین (NON-CONFIRMISTS —) کے لئے یونیورسٹیوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اس ضمن میں ان پر جو پابندیاں تھیں برخواست کر دی گئیں۔ فوجی عہدوں کی خریدی کا رواج مسدود کر دیا گیا۔ اصلاحی قوانین کے ذریعہ سے عدلیہ کے نظام میں دوررس اور وسیع تبدیلیاں کی گئیں۔ اسی ضمن میں حق رائے دہی کو وسیع تر کرنے کی باتیں بھی کچھ سُنی جانے لگی تھیں۔ اور پارلیمنٹ میں اس کے لئے تحریکات بھی پیش کی گئیں۔

تیسرا قانونِ اصلاح 1884ء

1880ء میں نئے انتخابات کے بعد گلیڈسٹن نے دوسری مرتبہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس انتخاب میں لبرل بڑی تعداد میں منتخب ہوئے۔ اس طرح حکومت کو دارالعوام میں وسیع تائید حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب قوم مزید پارلیمانی اصلاح کے لئے بے چین ہے۔ وہ اس سمت میں ایک اور چھلانگ لگانا چاہتی تھی 1867ء کے قانون نے ملک کو جمہوریت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا تھا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ قوم کے ایسے طبقات اور گروہ جو اب بھی ووٹ سے محروم تھے اپنی اس حالت پر قانع نہیں رہ سکتے تھے۔ زرعی مزدور اب بھی حق رائے دہی سے محروم تھا۔ ایسے صنعتی مزدور بھی ووٹ سے محروم تھے جو ان شہروں میں رہتے تھے جنھیں اب تک پارلیمنٹ میں حق نیابت حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ صریحاً ناانصافی تھی۔ اصلاح سے متعلق سابق میں جو بدگمانیاں تھیں وہ دور ہو گئی تھیں۔ اس سے نہ قومی نظامِ حیات درہم برہم ہوا اور نہ خونین انقلابات آئے۔ اس پُرسکون ترقی نے لوگوں کی ہمتیں بلند کیں۔ اب خوف و دہشت کا احساس زائل ہو چکا تھا۔ قدامت پسند پارٹی بھی اصولاً اب اصلاح کی مخالف نہیں تھی بلکہ وہ صرف اس کی رفتار کو قدرے سست رکھنا چاہتی تھی۔

غرض مجموعی حیثیت سے قوم ایک نئی منزل کی طرف بڑھنے کے لئے پر تول رہی تھی۔

گلیڈسٹن اگرچہ اصلاح کا حامی تھا مگر پھر بھی بہ نظر احتیاط کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کے لئے پس و پیش کر رہا تھا۔ ادھر ملک میں اصلاح کا مطالبہ بڑھ رہا تھا۔ اس مقصد کے لئے لبرل انجمنیں جگہ جگہ کام کر رہی تھیں۔ سنہ 1877ء میں ان تمام مقامی لبرل انجمنوں کے اتحاد سے ایک قومی انجمن بنائی گئی جس کا نام قومی لبرل فیڈریشن رکھا گیا۔ یہ انجمنیں ملک میں انتخابات اور اصلاحات کے تعلق سے مفید خدمات انجام دے رہی تھیں۔ ٹریڈ یونین کانگریس نے بھی اسی مقصد کے لئے اپنا ایک علٰحدہ مرکزی ادارہ "مزدور نمائندہ لیگ" کے نام سے قائم کیا۔ سنہ 1874ء میں اس لیگ کے نامزد کردہ تیرہ (13) امیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ غرض یہ انجمنیں ایک طرف سیاسی بیداری اور آگہی پیدا کر رہی تھیں اور دوسری طرف اصلاحِ پارلیمنٹ کے لئے بھی رائے عامّہ کو ہموار کر رہی تھیں۔ چنانچہ سنہ 1883ء میں لبرل انجمنوں کے کوئی دو ہزار پانچ سو (2500.) نمائندوں نے (DELEGATES.) لیڈس کے شہر میں اپنی کانفرنس منعقد کی۔ اور اصلاح کا ایک جامع پروگرام حکومت کے سامنے پیش کیا۔ ملک کے دوسرے گوشوں سے بھی اسی نوعیت کے مطالبات کئے جانے لگے جگہ جگہ اصلاح کی تائید میں جلسے منعقد ہوئے جن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے۔ انتہا پسند (RADICAL.) سیاسی گروپس اس میں بہت پیش پیش تھے۔ اس کے باوجود گلیڈسٹن کو تامّل تھا۔ اس کا دورِ وزارت قریب الختم تھا۔ کیبنٹ اس معاملہ میں پوری طرح متحد نہیں تھی۔ وہ ان حالات میں انتخابی قوانین میں کوئی وسیع تبدیلیاں روبہ عمل لانے سے ہچکچاتا تھا لیکن بالآخر ریڈیکل عناصر کے دباؤ کے تحت جس کی کیبنٹ میں چیمبرلین (CHAMBERLAIN.) نمائندگی کرتا تھا، گلیڈسٹن نے سنہ 1884ء میں مسودہ قانونِ اصلاح پیش کیا۔

دارالعوام میں یہ مسودۂ اصلاح آسانی سے پاس ہوگیا۔ لیکن دارالامراء نے اس کو مسترد کر دیا۔ ان کو اصلاح کی تجاویز سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں تھا۔ وہ اس بات پر معترض تھے کہ حکومت نے اس مسودے میں نشستوں کی تقسیمِ جدید کے جزو کو شریک نہیں رکھا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ حقِ رائے دہی کے معیارات اور نشستوں کی تقسیم کا پورا خاکہ ایک ساتھ پیش کیا جا کر منظوری حاصل کی جائے وہ اصلاحی قانون کو جزءاً جزءاً قبول

کرنے تیار نہیں تھے۔

دارالامراء میں کشمکش

اس بل کے استرداد نے دونوں ایوانوں میں تعطل کی صورت پیدا کر دی۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ دارالامراء، قومی آرزوؤں اور ولولوں کے خلاف سدِّ راہ بنتا جا رہا ہے۔ ترقی پسند عناصر نے اُمراء کو ہدفِ ملامت بنایا۔ ان کے اختیارات پر نکتہ چینی شروع کی۔ ان چہ میگوئیوں میں یہاں تک کہا جانے لگا کہ عوامی فیصلوں کی صورت گری کے لئے اگر ضرورت ہو تو اس ایوان کے اختیارات میں قطع و بُرید کی جائے یا سرے سے اس کے وجود کا ہی خاتمہ کر دیا جائے۔ گزشتہ نصف صدی سے دونوں ایوانوں میں ایسا تصادم آئے دن پیدا ہونے لگا تھا۔ کیونکہ ایک طرف دارالعوام جمہوری طاقتوں کے تابع ہوتا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف دارالامراء اپنے وجود، ہیئتِ ترکیبی اور میں ابھی تک ازمنۂ وسطیٰ کی یادگار بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں دونوں کا وقتاً فوقتاً متصادم ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ دونوں میں کوئی ایسا نقطۂ اتصال نہیں تھا جہاں سے وہ قومی مسائل کو ایک نظر سے دیکھیں۔

اس تعطل اور تصادم کو دُور کرنے کے لئے ملکہ نے مقدور بھر کوشش کی۔ یہ اس کے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں تھی کہ دارالامراء کا وقار اور اس کی ہر دلعزیزی یوں پامال ہوتی جائے۔ وہ دارالامراء کے موقف کو کمزور تر ہوتا دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور نہ وہ دستور کی کسی امکانی قطع و بُرید کو پسند کر سکتی تھی۔ اس لئے اس معاملہ میں اس نے شخصی دلچسپی لی۔ وزیر اعظم گلیڈسٹن اور قدامت پسند پارٹی کے لیڈر لارڈ سالسبری کو لکھا کہ وہ دونوں آپس میں مل بیٹھ کر مفاہمت اور مصالحت کی کوئی صورت نکال لیں۔ اس کی کوشش بار آور ہوئی۔ دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ حکومت نے نشستوں کی تقسیم کے مجوزہ خاکہ سے حزبِ مخالف کو آگاہ کیا جس کو وہ اگلے سال علٰحدہ بل کی شکل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس تمام بات چیت کے دَوران ملکہ نے اپنی شخصی اثر سے دونوں لیڈروں کے درمیان ایک خوشگوار ماحول پیدا کیا۔ اس کانفرنس کے نتیجہ میں قدامت پسندوں کے شکوک

وشبہات دُور ہوگئے اور جب یہ بل دوسری مرتبہ دارالامراء بھیجا گیا تو آسانی سے منظور ہوگیا۔ اس موقعہ پر ملکہ نے جو خدمت انجام دی اس کو ملک بھر میں سراہا گیا۔ وزیراعظم نے بل کے پاس ہونے کے بعد خاص طور پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس بات کا اعتراف کیا کہ شاید اس کے شخصی اثر اور دلچسپی کے بغیر اس نازک صورتِ حال پر قابو پانا ممکن نہ ہوتا۔ ملکہ نے اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی بعض نازک مواقع پر اپنے اثرات کو کام میں لاکر حکومت کی مشکلات کو دور کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس قسم کی مثالوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تاج کو دستور میں اب بھی ایک اہم مقام حاصل تھا۔ وہ نازک وقتوں میں حکومت کی گتھیوں کو سلجھا کر قوم کی بے بہا دستوری خدمت انجام دے سکتا تھا۔

معیارِ اہلیت

حق رائے دہی سے متعلق قانون ۱۸۸۴ء میں منظور ہوا۔ اس کے ذریعہ سے جو زبردست تبدیلی کی گئی وہ یہ تھی کہ انگلستان بھر میں رہائشی مکانات کے مکینوں کو بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ ضلع میں سکونت پذیر ہیں یا شہر میں حق رائے دہی مل گیا۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۶۷ء کے قانون کی رُو سے شہروں میں رہائشی مکانات میں رہنے والوں کو جو حق دیا گیا تھا اس کا اطلاق اب اضلاع پر بھی کیا گیا۔ اس صنف کے لوگوں کی حد تک شہر اور ضلع کی کوئی تمیز باقی نہیں رکھی گئی۔ اس سے اضلاع میں رائے دہندوں کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہوا۔ ان کی تعداد نو لاکھ سے پچیس لاکھ ہوگئی۔ لیکن یہ قانون بقول میٹ لینڈ[1] کچھ اس بے ڈھنگے طریقہ پر بنایا گیا تھا کہ اس سے بعض عجیب و غریب صورتیں پیدا ہوئیں۔ اس کی رو سے ہر بالغ مرد جس کی عمر اکیس سال ہو اور جو کسی رہائشی مکان میں سکونت پذیر ہو یا مکان کے کوئی علٰحدہ حصہ میں رہتا ہو رائے دہی کا اہل ہوگا بشرطیکہ اس مکان میں اس کا قیام کسی ایسے شخص کے ساتھ نہ ہو جس کا وہ ملازم یا خدمتگار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک مالی جو اپنے مالک کے مکان کے علٰحدہ

---

[1] CONSTITUTIONAL HISTORY OF ENGLAND— MAITLAND, P. 361 ملے

کمرہ یا لاج میں رہتا ہے ووٹ کا مستحق ہو سکتا تھا لیکن اسی گھر کا بٹلر اس حق سے استفادہ نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اصل مکان میں مالک کے ساتھ سکونت پذیر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اہلیت کے بعض سابقہ معیارات کو بحال رکھا گیا۔ مثلاً شہروں میں دس پونڈ کی مالیتی جائیداد کا قابض اور ایسا " اقامت گزیں" (.LODGER) جو اتنی ہی رقم بطور کرایہ ادا کرتا ہو، بدستور اس حق سے استفادہ کر سکتا تھا۔ اضلاع میں چالیس شلنگ کا فری ہولڈ (.FREE HOLD) رکھنے والا اور پانچ پونڈ کا نقل دار اور پچاس پونڈ اور پانچ پونڈ کے پٹہ دار یہ سب رائے دہی کے اہل برقرار رہے۔

اگرچہ اس قانون نے مجموعی حیثیت سے ملک کی کثیر آبادی کو (باستثنائے صنفِ نازک) ووٹ عطا کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس میں ایسے تحفظات، ایسی خامیاں اور نقائص تھے کہ اس کو پارلیمانی اصلاح کا لفظِ آخر نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لئے کم و بیش تیس سال کے گزرنے کے بعد اس پر نظرِ ثانی اور اس کی مزید توسیع کے مطالبات پیش کئے جانے لگے۔ لیکن ان نقائص کے باوجود یہ کہنا بعید از حقیقت نہیں ہے کہ تیسرے قانونِ اصلاح کی وجہ سے انگلستان ایک جمہوری ملک بن چکا تھا اور جمہوری طاقتیں تمام سیاسی ادارات میں اپنا اثر دکھانے لگی تھیں۔

قانون بابتہ 1885ء نشستوں کی تقسیم

اگلے سال 1885ء میں حکومت نے نشستوں کی تقسیم جدید سے متعلق مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش کیا اور اس کی منظوری حاصل کر لی۔ اس قانون نے ایسے تمام شہروں کو جن کی آبادی پندرہ ہزار سے کم تھی ان کے متعلقہ اضلاع میں ان کو ضم کر دیا۔ ایسے شہر جنھیں اب تک علٰحدہ حقِ نیابت حاصل نہیں تھا لیکن جن کی آبادی پچاس ہزار تھی انھیں ایک نمائندہ کو منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ بڑے شہروں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے زیادہ نمائندگی دی گئی بہتر (۷۲) شہروں کو حقِ نیابت سے محروم کر دیا گیا۔ اب یہ پارلیمانی باروز (BOROUGHS) باقی نہیں رہے۔ چھتیس شہروں سے ان کا ایک ایک نمائندہ چھین لیا گیا۔ ان مختلف انتظامات سے ایک سو بیالیس نشستیں، تقسیم جدید کے لئے نکالی گئیں۔ دارالعوام کی رُکنیت میں بارہ ممبروں کا اضافہ کیا گیا۔ اور اب رُکنیت چھ سو ستّر ہو گئی۔ حتی الامکان اس امر

کی کوشش کی گئی کہ پورے ملک کو کم و بیش مساوی حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم کیا جائے اور ہر حلقہ صرف ایک ممبر منتخب کرے۔ لیکن اس اصول پر ہر جگہ عمل آوری نہ ہو سکی۔ کچھ ایسے حلقہ ہائے انتخاب باقی رہ گئے جو ایک سے زیادہ نمائندے منتخب کر سکتے تھے۔ اب 670 رکنی ایوان میں انگلستان کے 465، ویلز کے 30، اسکاٹ لینڈ کے 72 اور آئرلینڈ کے 103 نمائندے تھے۔

اسی زمانے میں حسبِ ضرورت ایسے قوانین بھی پاس کئے جاتے رہے جن سے بہت کچھ انتخابی بدعنوانیوں کا انسداد ہوا۔ ووٹروں کی سہولت کے لئے رجسٹریشن کے طریقۂ کار کو آسان بنایا گیا۔ خفیہ رائے دہی کے لئے قانون وضع کیا گیا۔ اس قانون نے رائے دہندے کو ہر قسم کی تخویف اور تشدد کے امکان سے محفوظ کر دیا۔ اس تمام قانون سازی نے مجموعی طور پر انگلستان میں جمہوریت کو زیادہ مضبوط اور استوار کر دیا۔

اٹھارواں باب

کابینی ارتقاء انیسویں صدی میں

تاج، کابینہ اور دار العوام

نیا سماج

انگلستان کی دستوری تاریخ میں انیسویں صدی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس صدی میں سب سے زیادہ پارلیمانی اصلاح پر توجہ دی گئی۔ یہ پارلیمانی اصلاح جو تین قسطوں میں روبہ عمل لائی گئی بجائے خود ایک انقلابی کارروائی تھی۔ معاشی اور صنعتی ترقیوں نے ایک نئے سماج کو جنم دیا تھا۔ اس سماج کے تقاضوں کو وہ سیاسی ادارے پورا نہیں کر سکتے تھے جنھوں نے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام حیات میں جنم لیا تھا۔ اس لئے پارلیمنٹ کی اصلاح ناگزیر ہوگئی تھی۔ نئے سماج کے وہ لاکھوں انسان جن کی حکومت میں کوئی آواز نہیں تھی اپنی تقدیر پر قانع رہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے جدوجہد مسلسل اور عمل پیہم سے جس طرح اپنی اردگرد کی زندگی کو مشین اور بھاپ کی مدد سے بدل کر رکھ دیا تھا اب چاہتے تھے کہ اپنی تقدیر کے آپ معمار بنیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے خوابوں کی تکمیل اسی وقت ہوگی جبکہ سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو۔ سیاسی اقتدار کے حاصل کرنے کے لئے انھیں پارلیمنٹ پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ یہی عوامی آرزو پارلیمانی اصلاح کی بنیادی محرک تھی۔

ولیم چہارم اور پیل کی وزارت

پارلیمنٹ جیسے جیسے جمہوری طاقتوں کے زیر اثر آتی گئی اسی نسبت سے کیبنٹ تاج کے تسلط سے آزاد ہوتی گئی۔ یوں تو ایک عرصے سے وزارت سازی میں تاج کی بے بسی

نمایاں طور پر نظر آنے لگی تھی۔ لیکن سنہ 1832ء کی اصلاح کے بعد سے تاج کا موقف اور کمزور ہوگیا۔ اس کی ایک اچھی مثال سنہ 1834ء کی وزارت سازی میں ملتی ہے۔ ولیم چہارم، لارڈ ملبرن کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس وقت اس کی وزارت برسرِ کار تھی۔ بعض اسباب کی بنا پر ملبرن مستعفی ہوگیا۔ ولیم چہارم نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اپنی پسند کی کیبنٹ بنانی چاہی۔ چنانچہ پیل کو اپنی مرضی سے وزیر اعظم مقرر کیا لیکن دارالعوام میں پیل کی نئی حکومت کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا نئے انتخابات عمل میں لائے گئے۔ لیکن بادشاہ کی تائید کے باوجود پیل کی قدامت پسند پارٹی کو انتخابات میں کامیابی نہیں ہوئی۔ پیل ان حالات میں زیادہ عرصہ تک اپنی حکومت برقرار نہیں رکھ سکا۔ اصلاح سے پہلے پھر بھی یہ ممکن تھا کہ دارالعوام کی مخالفت کو شاہانہ سرپرستی کے ذریعے بے اثر کر دیا جائے۔ لیکن اب بادشاہ کی تائید کسی وزارت کو برقرار رکھنے میں کارگر نہیں ہوسکتی تھی۔ اور نہ ہی انتخاب کے جیتنے میں اس کی مدد کرسکتی تھی۔ پیل نے مجبوراً استعفیٰ دے دیا اور ولیم کو مشورہ دیا کہ مخالف پارٹی کے لیڈر ملبرن کو وہ حکومت بنانے کے لئے طلب کرے۔ یہ واقعہ کیبنٹ سازی میں تاج کی بے بسی پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

خواتین خوابگاہ کا مسئلہ

چند سال بعد 1839ء میں ملکہ وکٹوریہ کو بھی کم و بیش اسی نوعیت کا تجربہ ہوا۔ ملبرن کو دارالعوام میں شکست ہوگئی۔ اس نے استعفیٰ دے دیا۔ ملکہ نے پیل کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ مگر اس کے لئے وہ یہ تیقن حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ملکہ کی "خواب گاہ کی خواتین" کو بدلنے کا اسے اختیار حاصل رہے گا۔ وکٹوریہ اس شرط پر راضی نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملکہ کی خواہش پر ملبرن کو دوبارہ وزارت بنانی پڑی۔ اور ہر چند اسے ملکہ کی کامل تائید حاصل تھی لیکن اس کے باوجود وہ پارلیمنٹ کو اپنا ہمنوا بنا نہ سکا۔ دارالعوام میں اسے کافی تائید حاصل نہیں تھی۔ چونکہ اس زمانے میں دونوں پارٹیوں کا موقف کچھ غیر یقینی تھا۔ اس لئے ملبرن کسی نہ کسی طرح دو سال تک برسرِ کار رہا۔ سنہ 1841ء کے عام انتخابات میں ملکہ کی تائید اور سرپرستی بھی ملبرن کی لبرل پارٹی کو شکست سے بچا نہ سکی۔ یہ بات واضح ہوتی جارہی تھی کہ محض شاہی تائید اور سرپرستی نہ کسی وزارت کو برقرار رکھ سکتی ہے اور

نہ اسے انتخابات میں کامیاب کرانے کی ضامن ہوسکتی ہے۔ انتخابات کے بعد پیل وزیر اعظم مقرر ہوا۔ ملکہ نے "خواتین خوابگاہ" سے متعلق اس کے مطالبہ کو قبول کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اس صدی کا عام رجحان تو یہی ہے کہ بادشاہ کا موقف کمزور ہوتا چلا گیا۔ لیکن بعض مخصوص حالات میں ایسی صورتیں پیدا ہوتی رہیں کہ تاج کو وزارت سازی میں دخیل ہونے کا برابر موقعہ ملتا رہا۔ خصوصاً وکٹوریہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ وہ اس معاملے میں بے بس اور بے اختیار ہوگئی ہے۔

پارٹی بندی میں انتشار کے اثرات

کیبنٹ اور تاج کے مسئلہ پر بحث کرتے وقت یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ پرانی رسمیں اور پرانے تصورات آسانی سے نہیں مٹتے۔ اب بھی یہ قدیم تصور جاگزیں تھا کہ وزراء تاج کے ماتحت عہدہ دار ہیں۔ ان کا کام کسی ایسے سیاسی پروگرام کو روبہ عمل لانا نہیں ہے جس کو رائے دہندوں (.ELECTORATE) نے منظور کیا ہو۔ بلکہ وہ صرف نظم و نسق کے چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ڈزریلی[1] کے زمانہ تک انتخابات میں شکست کے ساتھ ہی کوئی وزارت مستعفی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی برطرفی راست الکٹوریٹ سے حاصل کرنے کی بجائے دارالعوام کے فیصلہ کے منتظر رہتے۔ انھیں یہ توقع ہوتی کہ انتخابات میں ناکامی کے باوجود وہ دارالعوام کو اپنا ہمنوا بنا سکیں گے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ ابھی پارٹی بندی کے قیود اتنے زیادہ سخت نہیں ہوئے تھے۔ 1846ء کے بعد سے ملک میں متعدد چھوٹی چھوٹی پارٹیاں یا ان کے گروپس بن گئے تھے۔ "قوانین اجناس" کی منسوخی پر ٹوری پارٹی ٹوٹ گئی اور اس کے دو گروپس ہوگئے۔ ایک تو پیل کے متبعین جو پیلئے (.PEELITES) کہلاتے تھے۔ دوسرے ٹوری یا قدامت پسند۔ وہگوں کی پارٹی میں بھی ایک نیا گروپ انتہا پسندوں (.RADICALS) کا پیدا ہوگیا تھا۔ آئرستانی گروپ ان سب سے علٰحدہ تھا۔ پارٹی بندی کے اس انتشار کا نتیجہ تھا

---

[1] ڈزریلی پہلا شخص تھا جس نے 1868ء کے انتخابات میں شکست کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کا انعقاد کا انتظار کئے بغیر اپنی حکومت کا استعفیٰ پیش کر دیا۔

کہ آئندہ بیس سال تک کوئی سیاسی پارٹی کامل اکثریت کے ساتھ کوئی انتخاب جیت نہ سکی۔ ان حالات میں برسرِ کار وزارت کو کچھ توڑ جوڑ کا موقع ضرور ملتا تھا۔ اسی لئے وہ استعفیٰ دینے سے پیشتر دارالعوام میں اپنی حکومت کی برقراری کی کوشش کو اپنا حق سمجھتے تھے۔

ملکۂ وکٹوریہ اور کیبنٹ سازی

پارٹی بندی میں اس انتشار کی وجہ سے کیبنٹ سازی میں تاج کو ایک نادر موقع حاصل ہوا۔ پارٹیوں کی کثرت اور ان میں سے کسی ایک کو فیصلہ کن اکثریت حاصل نہ ہونے کی بنا پر کیبنٹ بنانے کا کام قدرے مشکل ہوگیا تھا۔ ان حالات میں ملکہ کو اپنے اثر اور اپنے اختیارِ تمیزی کو کام میں لانے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ 1846ء سے 1868ء تک تین مرتبہ (بلاتسلسل) اقلیتی حکومتیں (MINORITY GOVTS.) بنتی رہیں۔ جن میں سے ایک چھ سال تک اور باقی دو علی الترتیب ایک سال اور دو سال کارگزار رہیں۔ 1852ء سے 1855ء تک ایک مخلوط حکومت برسرِ کار رہی۔ ان وزارتوں کی تشکیل زیادہ تر ملکہ کی کوششوں اور اس کے حسنِ انتخاب کا نتیجہ تھا۔ ایسے مواقع پر وزیراعظم کا انتخاب زیادہ تر وہ اپنی مرضی سے کر سکتی تھی اور کیبنٹ کے دوسرے وزراء کے تقرر میں بھی وہ اپنی مرضی کو مسلط کرتی۔ اس کے قطع نظر کیبنٹ میں جو مباحث ہوتے یا وہاں جن آراء کا اظہار کیا جاتا ان سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی۔ وہ اس بات پر اصرار کرتی کہ اس کو کیبنٹ اپنے تمام فیصلوں سے آگاہ رکھے، وہ اپنے وزراء کی ہمت افزائی کرتی۔ چنانچہ "قانونِ اجناس" کی منسوخی کے وقت پیل کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور تو اور خود اس کی پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور اس کے ساتھی اس کے دشمن ہوگئے تو اس وقت ملکہ نے اس کا ہر طرح ساتھ دیا، اس کی تائید کی اور اس کی ہمت افزائی کرتی رہی۔ پیل کے لئے ایسے نازک مرحلے پر تاج کا اس درجہ اعتماد حاصل رہنا اس کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوا وہ جہاں ہمت افزائی کرتی تھی وہیں اپنے وزراء پر نکتہ چینی اور اعتراض سے بھی بشرطِ ضرورت پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔ جب کبھی حکومت کی تشکیل جدید ہوتی وہ وزراء کے انتخاب اور ان کے قلمدانوں کی تقسیم میں برابر دلچسپی

لیا کرتی۔ 1851ء میں وہ ڈزریلی کو سکرٹری آف اسٹیٹ کا عہدہ دیئے جانے کی مخالف تھی۔ ایک موقعہ پر وہ چاہتی تھی کہ پامرسٹن (.PALMERSTON) کو وزارتِ خارجہ کا قلمدان نہ دیا جائے۔ 1853ء میں جب لارڈ ابرڈین (ABERDEEN) حکومت بنانے کی کوشش کر رہا تھا ملکہ کی خواہش یہ تھی کہ گلیڈسٹن کو وزیر خزانہ اور لارڈ سینٹ لیونارڈ (.ST, LEONARDS) کو لارڈ چانسلر بنایا جائے لیکن اس وقت ملکہ کی اس خواہش کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

ملکہ اور پامرسٹن

ملکہ خصوصیت کے ساتھ وزارتِ خارجہ کے محکمہ میں دلچسپی لیا کرتی تھی۔ روایات کچھ ایسی تھیں کہ صدیوں سے بیرونی دُول سے تعلقات کو تاج کا ایک ذاتی اور شخصی معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کا اثر و رسوخ حکومت کے لئے عموماً مفید ثابت ہوتا تھا۔ لارڈ پامرسٹن سے وہ اس لئے ناخوش تھی کہ بحیثیت وزیر خارجہ وہ بہت سے کام اس کے علم میں لائے بغیر کر گزرتا، یا پھر پالیسی میں کوئی ایسی تبدیلی کر بیٹھتا جس سے ملکہ کو قبل از قبل آگاہ نہ کیا گیا ہو۔ 1850ء میں اس نے پامرسٹن کو سخت ڈانٹ پلائی اور لکھا کہ

> "تمام بیرونی مراسلے بروقت اس کے ملاحظہ میں پیش کئے جائیں تاکہ ملکہ کو ان پر غور و خوض کرنے کا کافی موقعہ ملے۔ ملکہ کو اس بات سے بھی واضح طور پر آگاہ کیا جائے کہ وزیر متعلقہ اس خاص معاملہ میں جو ملکہ کے سامنے پیش کیا گیا ہے کیا حکمتِ عملی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اس حکمتِ عملی کے بارے میں ملکہ کی منظوری حاصل ہو جانے کے بعد اس میں کسی قسم کی تبدیلی ملکہ سے استمزاج کے بغیر نہ کی جائے۔"

ان ہدایات کے باوجود جب پامرسٹن نے 1851ء میں حکومت کی پالیسی سے اچانک انحراف کرتے ہوئے اور ملکہ سے استمزاج کئے بغیر نپولین بوناپارٹ سوم کی انقلابی شاہی کو تسلیم کر لیا تو ملکہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ پامرسٹن کو برطرف کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں میں یہ چیز ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ملکہ کو اعتراض پامرسٹن کے طریقۂ کار پر تھا، وہ پالیسی ساز ہونے کی مدعی نہیں تھی۔ یہ کام اس کے وزراء کا ہے لیکن وہ ان کی دوست، رہنما اور سرپرست

ہے جو اپنے دیرینہ تجربہ اور شخصی وجاہت کی وجہ سے ان کے فیصلوں کو متاثر کر سکتی ہے۔

امریکی خانہ جنگی کے موقعہ پر ملکہ کی بیش بہا خدمت

1861ء میں امریکی خانہ جنگی کے زمانہ میں بعض انگریز ملاحوں کی گرفتاری پر دونوں ممالک میں جنگ کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ انگلستان میں اس واقعہ کی وجہ سے بڑا جوش وخروش تھا اور اس کو قومی وقار کا مسئلہ سمجھا جانے لگا تھا۔ ایسے میں لارڈ جان رسل نے ملاحوں کی واپسی کے بارے میں ایک سخت مراسلہ لنکن کو لکھا۔ اس وقت پرنس کنسرٹ بستر مرگ پر تھا۔ مگر مرتے مرتے اس نے ملک کی بڑی اچھی خدمت انجام دی۔ اس مراسلہ میں اس نے بعض ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اس سے دونوں ملک جنگ کی مصیبت سے بچ گئے رسل کے مراسلہ کا لب ولہجہ اتنا سخت تھا کہ مفاہمت کے تمام دروازے بند ہو جاتے مگر پرنس کانسرٹ نے وقار اور مطالبہ کی شدت کو ہاتھ سے دیئے بغیر لب ولہجہ میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ لنکن کے لئے صلح و آشتی کی راہ اختیار کرنے کا راستہ نکل آیا۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ پرنس کنسرٹ نے ملکہ کے پس پردہ مشیر کی حیثیت سے اپنی زندگی میں ملک کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ بالخصوص بیرونی دول سے تعلقات میں اس کی رائے صائب اور اس کا مشورہ وزنی ہوا کرتا تھا۔

ملکہ کا مصالحتی رول

تاج کے اثرات کا دائرہ غیر محدود تھا۔ صرف بیرونی معاملات میں ہی اس کا وجود ایک نعمت نہیں تھا بلکہ اندرون ملک بھی بعض خطرناک اور بحرانی حالات میں تاج کے اثر ورسوخ نے ملک کی ناؤ کو طوفانی تھپیڑوں کے خوفناک نتائج سے بچایا۔ ملکہ نے دو اہم مواقع پر اپنی شخصی مداخلت سے دونوں ایوانوں کے درمیان تصادم کو دور کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1869ء میں آئرستانی کلیسا کی مسدودی کے مسودۂ قانون پر دونوں ایوانوں میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے تھے اور ایسی صورتیں پیدا ہوگئی تھیں کہ ملک ایک شدید دستوری بحران سے دوچار ہو جائے۔ ملکہ اس مسودۂ قانون کی خود بھی مخالف تھی، مگر اس کے باوجود اس نے اپنی تمام توانائیاں حکومت کی تائید میں اس مسودہ کو دارالامرا میں پاس

کرانے کے لئے صرف کردیں۔ ایک دوسرے موقعہ پر 1885ء میں تیسرے قانون اصلاح پر مباحث کے دوران دونوں ایوانوں میں جو تعطل اور تصادم پیدا ہوا تھا اور ملکہ نے جس کامیابی سے اس پر قابو پایا اس کا ذکر پچھلے صفحات میں کردیا گیا ہے۔ دونوں مواقع پر گلیڈسٹن نے وزیر اعظم کی حیثیت سے ملکہ کو اس کی ان بیش بہا خدمات کے لئے بہت پُرزور الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اور اسے اس بات کو تسلیم کرنا پڑا کہ ملکہ کے اثر ورسوخ اور اس کی دلچسپی کے بغیر یہ مسائل حل نہ ہو پاتے۔ اور یہ محض اسی کا احسان ہے کہ قوم اور حکومت دونوں کو ایک امکانی دستوری بحران سے چھٹکارا حاصل ہوا۔

گلیڈسٹن اور ڈزریلی کی وزارتیں

1868ء سے 1880ء کا زمانہ ایسا ہے کہ اس وقت دو طاقتور وزارتیں یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار رہیں۔ گلیڈسٹن کی وزارت 1868ء سے 1874ء تک اور اس کے بعد ڈزریلی کی کیبنٹ جو 1874ء سے 1880ء تک کارگزار رہی۔ دونوں کو انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ ان بھاری اکثریتوں کی بنا پر ملکہ کی حد تک وزیر اعظم کے انتخاب کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ رائے دہندوں نے گلیڈسٹن اور بعد میں ڈزریلی کو ووٹ دے کر یہ واضح کر دیا تھا کہ انھوں نے اپنا وزیر اعظم آپ چن لیا ہے۔ ملکہ ان حالات میں وزارت سازی میں کچھ مداخلت کرنے کے موقف میں نہیں تھی۔ وہ دیگر وزراء کے انتخاب میں بھی اپنا کچھ اثر یا زور ڈالنے سے قاصر تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ واضح اور فیصلہ کن اکثریتیں وزارت سازی کے تعلق سے تاج کے موقف کو بہت کمزور کر دیتی ہیں۔ ان حالات میں ملکہ کی مداخلت کے لئے بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ تاہم جب 1880ء میں اس کی امیدوں کے برخلاف قدامت پسندوں کو شکست ہوگئی تو وہ لبرل پارٹی کے مسلمہ لیڈر گلیڈسٹن کو وزیر اعظم بنانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے لارڈ ہارٹنگٹن (HARTINGTON) کو اس عہدہ کا پیش کش کیا جس کو اس نے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

اصل میں قصہ یہ تھا کہ گلیڈسٹن پر اسے پورا بھروسہ نہیں تھا۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ گلیڈسٹن کے نزدیک ملکہ کی حیثیت ایک محترم اور مقدس ادارہ کی سی تھی۔

ڈزریلی اسے ایک عورت سمجھتا تھا اور ایک خاتون کی طرح اس کا وہ پاس و لحاظ کرتا تھا۔ ملکہ چونکہ بہر حال عورت تھی، گلیڈسٹن کے میکانی اور ضرورت سے زیادہ رسمی برتاؤ کے ڈھنگ کو ناپسند کرتی تھی۔ اسی وجہ سے گلیڈسٹن کی اس دوسری وزارت میں ملکہ سے اس کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ اس کے وزرا کے انتخاب پر اس نے کڑی تنقید کی۔ اس زمانے میں وہگ (لبرل) پارٹی میں ایک علٰحدہ گروہ انتہاپسندوں (RADICALS) کا پیدا ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے اختلافات کو وہ ہوا دیتی رہی اور مجموعی حیثیت سے اس وزارت کے ساتھ اس کا طرزِ عمل مخالفانہ ہی رہا۔

لبرل پارٹی میں پھوٹ

اس وزارت کے آخری زمانے میں لبرل پارٹی میں ایک اور پھوٹ پیدا ہوئی۔ یہ پھوٹ آئرلینڈ کے مسئلہ پر پیدا ہوئی۔ وہگوں اور انتہاپسندوں کے سابقہ دو گروپس کے علاوہ اب اس پارٹی میں اور دو گروپ پیدا ہو گئے۔ ایک تو وہ جو آئرلینڈ کو ہوم رول (HOME RULE.) دینا چاہتے تھے، دوسرے وہ جو اس کے مخالف تھے۔ یہ لوگ "موافقین ہوم رول" اور "مخالفین ہوم رول" کہلاتے تھے۔ 1885ء کا انتخاب غیر فیصلہ کن رہا۔ قدامت پسندوں کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔ لیکن لبرل پارٹی میں اتنی پھوٹ تھی کہ وہ مستحکم وزارت بنانے کے موقف میں نہیں تھی۔ متعدد چھوٹے چھوٹے گروپس اور پارٹیوں کی موجودگی کی وجہ سے ملکہ کو پھر اس بات کا موقعہ ملا کہ وہ اپنی من مانی وزارت بنانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ لارڈ سالسبری (قدامت پسند) نے حکومت بنائی لیکن اس کی پارٹی کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔ ملکہ نے کوشش کی کہ مخالف ہوم رول گروپ کا لبرل لیڈر گوسچن، سالسبری کی تائید کرے یا وہ خود اپنی حکومت تشکیل دے مگر ملکہ کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ سالسبری اور گوسچن کے مشورے پر بالآخر اس نے گلیڈسٹن کو طلب کیا۔ یہ انتظام کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ گلیڈسٹن کی حکومت کو اس کے پہلے ہوم رول بل پر دارالعوام میں شکست ہو گئی اور وہ مستعفی ہو گیا۔ 1892ء میں لبرل پارٹی کو آئرستانی نیشلسٹ پارٹی کے تعاون سے اکثریت حاصل ہوئی لیکن اس کے باوجود ملکہ نے وزارتِ عظمیٰ کے لئے گلیڈسٹن کی بجائے

لارڈ روزبری (ROSE BERY.) کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ملکہ کی یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ مجبوراً اسے گلیڈسٹن کو قبول کرنا پڑا۔ دو سال بعد جب گلیڈسٹن مستعفی ہوگیا تو ملکہ نے اپنے اختیارِ تمیزی سے سر ولیم ہارکورٹ کی بجائے جو دارالعوام میں لبرل پارٹی کا لیڈر تھا لارڈ روزبری کو حکومت بنانے کے لئے طلب کیا۔ اس طرح وزیراعظم کے انتخاب میں وہ اپنے اختیارِ تمیزی سے کام لینے پر مسلسل اصرار کرتی رہی اور جب کبھی موقعہ ملتا وہ اپنی پسند اور اپنے ڈھب کی کیبنٹیں بنانے کی کوشش کرتی رہی۔

بیجہاٹ کا تصورِ شاہی

کیبنٹ سازی میں ملکہ کی ان دراندازیوں اور مداخلت کے مدِنظر بعض حالیہ دَور کے مبصّرین اور مورخین نے اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیبنٹ کے تعلق سے ملکہ کے طرزِ عمل کو ہدفِ ملامت بنانا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بیجہاٹ (BAGEHOT.) نے اپنی مشہورِ عالم تصنیف "دستورِ انگلستان" میں جو 1868ء میں شائع ہوئی تھی تاج کے اختیارات کو صرف تین وظائف کی حد تک محدود کردیا تھا۔ یہ کہ

(۱) بادشاہ کا یہ حق ہے کہ اس سے مشورہ کیا جائے۔

(۲) بادشاہ اپنے وزراء کی ہمت افزائی کرسکتا ہے۔ اور یہ کہ

(۳) ان کو بر وقت متنبہ کرسکتا ہے۔

ملکہ کے طرزِ عمل کو اگر اس کسوٹی پر جانچا جائے تو شاید وہ خطاکار ثابت ہو مگر اکثر مبصّرین کا اس پر اتفاق ہے کہ بیجہاٹ نے 1868ء میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ بعد کے حالات کی روشنی میں نظرِ ثانی کے محتاج ہوگئے تھے۔ بیسویں صدی کی "شاہی" پر شاید ان کا من وعن انطباق ہوسکے۔ نیز یہ بات بھی ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ ملکہ وکٹوریہ نے جس سیاسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں تاج صرف چند گنے چنے فرائض انجام دینے کی مشین نہیں بن گیا تھا۔ وہ ابھی تک ذی روح اور ذی حیات عنصر کی حیثیت رکھتا تھا اور عام طور پر اس دَور میں یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ بادشاہ کو اپنے وزراء کے منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ تعجب نہیں کہ وکٹوریہ نے ان تصوّرات کو

اپنی ذہنی وراثت میں حاصل کیا ہو۔

کیبنٹ اور دارالعوام

انیسویں صدی میں اصلاحِ پارلیمنٹ کے قوانین کی وجہ سے کیبنٹ پر رائے دہندوں کا راست اثر پڑنے لگا۔ حکومت کو ہر طرف اپنے ان اصلی آقاؤں کے رجحانات اور خیالات پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ جمہوری ترقی کا یہ بالکل قدرتی نتیجہ تھا۔ تیسرے قانونِ اصلاح کے منظور ہونے سے پہلے ہی حکومتیں رائے دہندوں (ELECTORATE) کے دباؤ کو محسوس کرنے لگی تھیں۔ چنانچہ 1880ء میں گلیڈسٹن کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس کی حکومت پر پارلیمنٹ کے دباؤ سے زیادہ رائے عامہ کا دباؤ ہے۔" اس نئی قوت کے اُبھرنے سے انیسویں صدی کے اواخر میں ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ دستور کچھ غیر مرئی تبدیلیوں سے دوچار ہے۔ حکومت پر حلقہ ہائے انتخاب (CONSTITUENCIES.) کے راست دباؤ کی وجہ سے دارالعوام کی حیثیت گرتی جارہی تھی۔ کیبنٹ اب یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کو جس آقا کے اشاروں پر کام کرنا ہے اس کا وجود پارلیمنٹ کی چار دیواری میں نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔ اس سے دارالعوام کا وہ موقف جس نے اس کو کم و بیش دو صدیوں سے کیبنٹ کا آقا اور حاکم بنا رکھا تھا بڑی تیزی سے بدلتا ہوا نظر آنے لگا۔ انگلستان کے دستور کی نظریاتی بنیاد یہ تھی کہ کیبنٹ دارالعوام کی زائیدہ ہے۔ اور اس کو اس کے اشاروں پر کام کرنا چاہئے۔ کیبنٹ کی موت وزیست کا انحصار دارالعوام پر ہونا چاہئے۔ جب تک دارالعوام میں حکومت کو اکثریت اور تائید حاصل رہے وہ برسرکار رہ سکتی ہے۔ لیکن اگر دارالعوام کا وہ اعتماد کھو دے تو اسے فوراً مستعفی ہو جانا چاہئے۔ اب کچھ ایسے حالات پیدا ہورہے تھے کہ دارالعوام کیبنٹ کے حاکم کی بجائے اس کا محکوم بنتا جارہا تھا۔ دوسرے قانونِ اصلاح کے بعد سے "پارلیمانی انتخاب" عام طور پر وزیراعظم کو منتخب کرنے کا ایک رفرنڈم بنتا جارہا تھا۔ رائے دہندے نہ صرف کسی پارٹی اور اس کے پروگرام کو ووٹ دیتے تھے بلکہ اپنے ووٹ سے یہ ظاہر کر دیتے تھے کہ وہ کس کو وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ 1868ء کا انتخاب گلیڈسٹن کے لئے اور 1880ء کا ڈزریلی کے لئے ایک رفرنڈم ثابت ہوا۔ رائے دہندوں کی اس

روزافزوں دلچسپی اور بیداری سے پارٹی بندی کے نظم وضبط میں زیادہ سختی اور استواری پیدا ہونے لگی۔ وہ اپنے نمائندوں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ ایک مرتبہ منتخب ہوجانے کے بعد وہ پارٹی لیڈر کے پوری طرح تابع اور پارٹی ڈسپلن کے پابند رہیں گے۔ اس سختی کی وجہ سے منتخب شدہ رُکن اپنی پارٹی سے انحراف کرنے کی مشکل سے جرات کرسکتا تھا۔ اور ادھر ملک بھر میں سیاسی پارٹیوں نے اپنی اپنی انجمنیں بنا رکھی تھیں۔ یہ نہ صرف اپنی پارٹی کا پروپگنڈہ کرتی تھیں بلکہ ممبروں کے رویّے اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لیتی رہتیں۔ ان انجمنوں کو یا رائے دہندوں کو جو ممبر ناراض کردیتا وہ دوسری مرتبہ ان سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے ان کے سامنے جانے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔ نیز یہ کہ بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر انیسویں صدی کے نصف آخر میں جو انتخابات ہوئے ان میں کامیاب پارٹی کو بھاری اکثریت حاصل ہوتی رہی[1]۔ ایسی بھاری اکثریت کے بل بوتے پر جو حکومت بنتی وہ امکانی طور پر چند انفرادی ممبروں کی بے وفائی یا دغا کی وجہ سے لوٹنے سے رہی۔ اس طرح کیبنٹ کے ایک مرتبہ تشکیل پا جانے کے بعد دارالعوام میں اس کی شکست کے امکانات بہت موہوم ہوجاتے اور عام اراکین اوپر کے بتائے ہوئے اسباب کی بناء پر اپنی حکومت کے خلاف بغاوت پر شاید ہی آمادہ ہوسکیں۔ انھیں ایک تو پارٹی کے نظم وضبط کی خلاف ورزی کے نتائج کا خوف ہوتا۔ دوسرے وہ اس بات سے ناواقف نہیں تھے کہ شکست کی صورت میں حکومت پارلیمنٹ کو برخواست کرکے نئے انتخابات منعقد کراسکتی ہے۔ یہ ثانی الذکر تصوّر ایک ممبر کے لئے کافی وحشت ناک ثابت ہوسکتا ہے۔ پارلیمانی رُکنیت منفعت اور اعزاز دونوں کی حامل ہے۔ اس سے دیدہ ودانستہ ہاتھ دھونا اور ایک نئے انتخاب کے لئے بازی لگانا جس میں روپیہ، وقت اور توانائی کا نہ جانے کتنا جان لیوا صرفہ ہو۔ اراکینِ پارلیمنٹ کو اس اقدام سے روکنے کے لئے بہت کافی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دارالعوام کیبنٹ کا حکم بردار بنتا جارہا تھا اور اس کے فیصلوں کو روبہ عمل لانے کی ایک مشین۔ وہ کیبنٹ کو کنٹرول کرنے کی بجائے جو کابینی حکومت کی نظریاتی اساس

---

[1] خصوصاً ۱۸۶۸ء سے ۱۸۸۵ء کے درمیان یہی صورتِ حال رہی۔

ہے خود اس کا تابع اور محکوم ہوتا جا رہا تھا۔

دارالعوام کی بے بسی

اس صورتِ حال کے بعض اور نتائج بھی ظاہر ہونے لگے۔ کیبنٹ اتنی طاقتور ہوتی چلی گئی کہ محض اپنے ایک "وہپ" (WHIP) کے ذریعہ سے اپنے پیش کردہ مسودات کو آسانی سے پاس کرا سکتی تھی۔ دارالعوام میں اتنی سکت باقی نہیں رہی کہ حکومت کے منشاء کے خلاف ایسے مسودات میں ترمیم کر سکے۔ لوول (LOWEL) نے اپنی مشہور کتاب "گورنمنٹ آف انگلینڈ" میں دارالعوام کے اس کمزور موقف پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اور ایک جدول کے ذریعہ سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سنہ 1851ء کے بعد سے رفتہ رفتہ دارالعوام کیبنٹ کے مقابلہ میں اپنے حقِ ترمیم سے بھی دست بردار ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ سنہ 1851ء میں ایک سال کے عرصہ میں حکومت کے مسودوں میں دارالعوام نے نَو مرتبہ ترمیمیں کیں۔ اور سنہ 1854ء اور سنہ 1856ء میں علی الترتیب سات مرتبہ۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا دارالعوام بے بس ہوتا گیا۔ چنانچہ سنہ 1876ء سے 1906ء تک تیس سال کے عرصہ میں صرف تیئس (۲۳) ترمیمات مسودات میں کی جا سکیں یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ دارالعوام اب کیبنٹ کا آقا نہیں بلکہ اس کا محکوم بن گیا تھا۔ وہ کیبنٹ کی مرضی کو چیلنج کرنے کے موقف میں نہیں تھا۔ ایسی صورت میں یہ پرانا تصور کہ کیبنٹ دارالعوام کے سامنے جواب دہ ہے ایک دستوری "مفروضہ" کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

اس صورتِ حال کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایوان میں جو مباحث ہوتے یا جن آراء کا اظہار کیا جاتا اس سے کسی تجویز زیر بحث کی قسمت پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ موافقت یا مخالفت میں کیسی ہی پُرمغز اور معقول تقریریں کیوں نہ کی گئی ہوں، مگر مسودہ زیر بحث کی کامیابی یا ناکامی کو یہ متاثر نہیں کر سکتی تھیں۔ حکومت کی بھاری اکثریتیں اس کی پیش کردہ تجاویز اور مسودوں کی کامیابی کی ضامن تھیں۔ ایوان میں ووٹ کا نتیجہ پہلے ہی سے ایک امرِ منفصلہ کی حیثیت رکھنے لگا۔ اسی وجہ سے دارالعوام میں مباحث کا معیار گرنے لگا۔ اراکین کو مباحث اور تقاریر میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔

حزبِ مخالف بھی محض اس غرض سے اپنی رائے کا اظہار کرتا کہ کم از کم وہ ریکارڈ میں محفوظ رہیں۔ اور تقریروں کا زیادہ تر مقصد پارلیمنٹ کے ممبروں کو ہمنوا کرنا نہیں بلکہ باہر کی دنیا کو یہ بتانا تھا کہ وہ اپنا فرض برابر انجام دے رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ دارالعوام کا کام مسائل زیرِ بحث پر اپنا فیصلہ صادر کرنے کا نہیں بلکہ صرف اس فیصلہ کو روبہ عمل لانا ہے جو پارلیمنٹ سے باہر پہلے ہی کر دیا گیا ہے۔ اس فیصلہ تک پہنچنے میں پبلک پلیٹ فارم، اخبارات، رسائل، اور صحافت اپنی بھرپور خدمت انجام دیا کرتے ہیں۔ رائے عامہ یہیں بنتی ہے۔ اور یہی ادارے اس کو تشکیل دیتے ہیں۔

دارالعوام کی بے بسی اور مجبوری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قومی مسائل کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے اس کے پاس کافی وقت نہیں ہوا کرتا۔ حکومت عملاً اس کے تمام تر وقت پر قابض رہتی۔ حکومت کے سامنے قانون سازی کا اتنا وسیع پروگرام ہوتا کہ خود اس کے اپنے لئے وقت نکالنا مشکل تھا۔ قانون سازی کی تمام تحریکات صرف حکومت کی جانب سے پیش ہو سکتی تھیں۔ اراکین اپنی انفرادی حیثیت میں کسی قانون سازی کی تحریک کو آگے بڑھا نہیں سکتے تھے۔ انھیں وقت ضرور دیا جاتا لیکن اتنا کم کہ وہ بے فیض ہو جاتا۔ نیز یہ کہ ایسے مسوّدات جب تک حکومت کی تائید انھیں نہ مل جائے کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ تنگیٔ وقت اور کام کی زیادتی دارالعوام کی بہتر اور معنی خیز کارکردگی کے راستے میں حائل ہو جاتی تھی۔

کیبنٹ کی آمرانہ حیثیت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دستور اپنا قالب بدل رہا تھا۔ کیبنٹ دارالعوام کی جگہ لے رہی تھی۔ قانون سازی سے متعلق تفصیلی بحث، غور و خوض، موافق اور مخالف آراء کا توازن اور اس کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کا عمل یہ سب کام اب دارالعوام میں نہیں بلکہ کیبنٹ میں انجام پاتا ہے۔ وہاں پالیسیوں کو آخری صورت دے دی جاتی اور بعد میں رسمی طور پر دارالعوام سے اس کی منظوری حاصل کر لی جاتی۔ بعض مبصّرین نے اس تبدیلی کو تاڑ لیا تھا۔ چنانچہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ کیبنٹ اب

تیسرا ایوان ہے، بلکہ کیبنٹ بجائے خود مجلس قانون ساز بن گئی ہے۔

لارڈ سالسبری نے 1894ء میں کہا تھا کہ:

" اس کے دیکھتے دیکھتے دارالعوام میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ اور اس تبدیلی کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس تبدیلی کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی مسئلہ پر مفید اور معنی خیز بحث صرف کیبنٹ میں ہو سکتی ہے، دارالعوام میں یہ ممکن نہیں۔"

ایک دوسرے موقعہ پر اسی مسئلہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے اس نے کہا کہ:

" دارالعوام کے اختیارات سلب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف کیبنٹ اس کے اختیارات پر قابض ہوتی جا رہی ہے اور دوسری طرف الکٹوریٹ (ELECTORATE.)"

بیسویں صدی کے اوائل میں ایک مشہور سیاست دان ایف ای اسمتھ نے بھی کم و بیش اسی رائے کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ:

" یہ کہنا کہ کاروبار (سلطنت) کی انجام دہی دارالعوام میں ہوتی ہے بالکل غلط ہے۔ یہ کام اب کیبنٹ میں انجام پاتا ہے۔"

قدامت پسند لیڈر لارڈ ہیوسیسل (LORD HUGH CECIL ـــــ) کی رائے بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اس نے تو یہاں تک کہا کہ:

" دارالعوام اب ایک بے مصرف ایوان ہے۔ کیبنٹ اس کی جگہ لے رہی ہے۔ اگر ایک بے مصرف اور فضول ادارہ کیبنٹ جیسے کارکرد اور بہتر ادارہ کے لئے جگہ خالی کرے تو ملک کے لئے کوئی تشویش کی بات نہیں۔"

آخر میں سڈنی لو (SIDNEY LOW.) نے اپنی مشہور کتاب حکومتِ انگلستان (GOVERNANCE OF ENGLAND.) میں اس صورتِ حال پر جو تبصرہ کیا ہے وہ مطالعہ کے

قابل ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ :

" دارالعوام اب عاملہ پر کوئی قدرت نہیں رکھتا ۔ اس کے برعکس عاملہ نے دارالعوام کو اپنا حکم بردار بنا لیا ہے ۔ حکومت کی نظری اساس یہ ہے کہ وزراء ہر منزل پر اپنی پالیسیوں کی توثیق اور منظوری دارالعوام سے حاصل کیا کریں جو قوم کا نمائندہ مانا جاتا ہے ۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو دارالعوام انھیں برطرف کر سکتا ہے ۔ یہ تو نظریہ کی بات ہے ۔ لیکن اب عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت چاہے کچھ بھی کرے دارالعوام اسے برطرف نہیں کر سکتا "

یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ انقلاب دستور میں کسی مستقل اور بنیادی تبدیلی کی نشان دہی کرتا ہے یا یہ دستوری اداروں کے تعلقات کی ایک عارضی شکل ہے ۔ اس کا فیصلہ مستقبل کے دستوری ارتقاء پر منحصر ہے ۔

اُنیسواں باب

دارالاُمرائے کے اختیارات میں تخفیف

پارلیمانی اصلاح کا اثر دارالاُمراء پر

انیسویں صدی میں اصلاح پارلیمنٹ کی کچھ ایسی ہوا چلی کہ دارالامراء پر بھی اس کے اثرات پڑنے لگے۔ اس کا موروثی موقف اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ تعجب نہیں کہ جمہوریت کی ترقی و ترویج کے ماحول میں اسے ازمنۂ قدیمہ کی ایک بے مصرف یادگار سمجھا جانے لگا ہو۔ لیکن انگریز اپنے قدیم اداروں کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ ان کو کارآمد بنانے کے لئے تدریجی اقدامات سے کام لیتے ہیں۔ ان کے انتہا پسند اور ریڈیکل گروہ بھی سیاسی تبدیلیوں کے روبہ عمل لانے میں حزم و احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ شکست و ریخت کے قائل نہیں۔ اسی وجہ سے دارالامراء اپنی غیر نیابتی حیثیت کے باوجود کسی تباہ کن انقلابی کارروائی کا تختۂ مشق نہیں بنا، صرف اس بات کی کوشش کی گئی کہ وہ قومی ترقی کے راستے میں سدِ آہنی بنا نہ رہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب لیبر پارٹی کو عروج ہونے لگا تو اس کے مسلّمہ اشتراکی عقائد، اور انقلابی تصورات کی بناء پر یہ خوف ظاہر کیا جانے لگا تھا کہ اگر یہ پارٹی برسرِ اقتدار آجائے تو شاید دارالامراء اپنا وجود باقی نہ رکھ سکے۔ تاج کے تعلق سے بھی اسی اندیشہ کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں اب تک متعدد مرتبہ لیبر حکومت قائم ہوئی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد تو اسے دارالعوام میں بھاری اکثریت حاصل

تھی لیکن اس نے دارالامراء کے تعلق سے جس حزم و احتیاط کا رویہ اختیار کیا اس سے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ قدامت پسندی کے خلاف ان کی آتش نوائی صرف ۱۰ ڈاوننگ اسٹریٹ پہنچنے تک ہے۔

1832ء کی اصلاح کے بعد دارالامراء اور دارالعوام کے تعلقات میں بیّن فرق محسوس کیا جانے لگا۔ اٹھارویں صدی میں ان میں جو باہم اتحاد اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی وہ باقی نہیں رہی۔ انتخابی قوانین کی پیہم اصلاح سے دارالعوام تیزی سے بدل رہا تھا۔ اب دونوں ایوانوں میں ہم آہنگی سے زیادہ رقابت پائی جانے لگی لیکن اس فرق کے باوجود کہ جب قدامت پسند برسر اقتدار ہوتے تو دارالامراء اپنی مخالفانہ روش سے باز رہتا اور لبرل پارٹی کے برسر اقتدار ہونے کی صورت میں اس کی روش معاندانہ ہوجاتی۔ دونوں صورتوں میں اس کے وقار اور مرتبہ کو ٹھیس لگتی تھی۔ اول الذکر صورتوں میں اس کا وجود بے مصرف ہوجاتا اور ثانی الذکر صورت میں مضرت اور نقصان کا باعث۔

دارالامراء کی ہیئتِ ترکیبی خود اس بات کی ضامن ہے کہ وہ ایک قدامت پسند ایوان بنا رہے۔ صدیوں سے اس کی تشکیل موروثی اساس پر قائم رہی۔ اور اس کا آغاز ہی ایک جاگیردارانہ ایوان کی حیثیت سے ہوا۔ انیسویں صدی تک اس میں کسی حد تک نیابتی عناصر کی شمولیت عمل میں آچکی تھی۔ لیکن بنیادی طور پر وہ صرف طبقۂ اعیان کا نمائندہ تھا۔ اس کی رکنیت پر کسی قسم کی کبھی کوئی تحدید نہیں رہی۔ 1719ء میں اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ اس کی رکنیت کے لئے کوئی حد مقرر کر دی جائے۔ لیکن اس کو دارالامراء کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ یہ تحریک کامیاب نہیں ہوسکی۔ تاج کو ہمیشہ سے اُمراء سازی کا لامحدود اختیار حاصل رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالامراء کے اراکین کی تعداد بیسویں صدی کے دوسرے دہے تک کم و بیش سات سَو ہو چکی تھی۔

دارالامراء کی ہیئتِ ترکیبی

دارالامراء کی رکنیت کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایوان میں بھاری اکثریت موروثی اُمراء کو حاصل ہے۔ موروثی اُمراء کی تین شاخیں پائی جاتی ہیں:

(۱) ایک وہ جن کو رتبۂ امارت 1707ء سے پہلے ملا جبکہ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ

کا اتحادِ عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ اُمرائے انگلستان کہلاتے ہیں۔

(۲) دوسرا گروہ "امرائے برطانیہ عظمٰی" کے نام سے موسوم ہے جنھیں 1707ء سے 1800ء کے درمیان درجۂ امارت حاصل ہوا۔

(۳) سب سے آخری شق ان کی ہے جو 1800ء کے بعد اس رُتبہ کو پہنچے جبکہ آئرلینڈ کا اتحادِ عمل میں آچکا تھا۔ ان کو "امرائے سلطنتِ متحدہ" کہا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے نیابتی امراء ہیں۔ 1707ء کے قانون الحاق کی رُو سے اسکاٹ لینڈ کے امراء کو ہر نئی پارلیمنٹ کے انعقاد کے وقت اپنی برادری میں سے سولہ امیروں کو منتخب کرنے کا حق دیا گیا تھا تاکہ دارالامراء میں وہ ان کی نمائندگی کریں۔ 1800ء کے قانونِ اتحاد آئرلینڈ نے اسی قسم کا حق آئرلینڈ کے اُمراء کو دیا گیا۔ یہ اٹھائیس اُمراء کو منتخب کرسکتے تھے۔ لیکن ان کا انتخاب صرف ایک پارلیمنٹ کی مدت کے لئے نہیں بلکہ حینِ حیات[1] ہوتا تھا۔

اُمرائے دینی (SPRITUAL PEERS.) کی تعداد چھبیس ہے۔ کنٹربری اور یارک کے دو آرچ بشپس، لندن، ڈرہم اور ونچسٹر کے تین اساقفہ ایوان میں مستقلاً اپنی نشست رکھتے ہیں۔ باقی تمام اساقفہ میں سے صرف اکیس کو بلحاظ سینیارٹی رُکنیت کے لئے نامزد کیا جاتا ہے۔ دارالامراء چونکہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت بھی ہے اس لئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ماہرینِ قانون کو اس کی رُکنیت میں شامل رکھا جائے۔ چنانچہ چھ امرائے مرافعہ حینِ حیات اس کے ممبر بنا دیئے جاتے ہیں[2]۔ ان سب کے علاوہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شہزادے بھی رُکنیت کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ایوان کی کارروائیوں میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیتے۔

دارالامراء کی افادیت

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دارالامراء اپنی ہیئت ترکیبی

---

[1] ۔ 1922ء کے بعد سے آئرلینڈ کی علٰحدگی اور آزادی کی وجہ سے ان کی نمائندگی کا حق ختم ہوگیا۔

[2] ۔ اب ان کی تعداد نو ہے۔

کی وجہ سے بجا طور پر رجعت پسند ایوان سمجھا جانے لگا تھا۔ اور ان لوگوں کی نگاہ میں کھٹکتا تھا جو ملک میں انقلابی تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ قومی ترقی کی رفتار کو سُست رکھنے کا باعث بن جاتا ہے۔ اور یہ کہ اپنی مسلّمہ غیر نیابتی حیثیت کے باوجود وہ رائے دہندوں (ELECTORATES) کے واضح عزائم آرزوؤں اور فیصلوں کی راہ میں ایک سدِّ سکندری کی طرح حائل ہو جاتا ہے۔ اور ان کے منظور کئے ہوئے پروگرام کو قانونی صورت کے عطا کئے جانے میں مانع اور مزاحم رہتا ہے۔ یہ صورت خصوصاً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ لبرل پارٹی کو دارالعوام میں اکثریت حاصل ہو اور اس کی حکومت برسرِ کار ہو۔ یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح تھا مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایوانِ ثانی کی ضرورت کا جواز ہی یہ ہے کہ وہ عوامی ایوان کی' خطرناک جلد بازیوں' انتہا پسندیوں اور موقتی حالات کے تحت جذباتی مغلوبیت کے سیلاب کے خلاف ایک مضبوط اور قابلِ بھروسہ بند کا کام دے۔ یہاں مسائل پر بڑے ٹھنڈے دل سے غور و خوض کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ زندگی کے ہر شعبہ سے چُنے ہوئے بہترین دماغ، سیاس' مدبّر' عالِم' آرٹسٹ' چوٹی کے تاجر' صنعت کار' ڈپلومیٹ قانون دان' مفکّر' اور اسی نوع کے اَن گنت مشاہیر کی خدمات یہاں دستیاب ہوسکتی ہیں، لہٰذا وہ قوم کے اثاثۂ دانش و خرد کا ایک لازوال خزانہ بن جاتا ہے۔ یوں تو دارالامراء کے اراکین کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں سے بیشتر اس کی کارروائیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ایوان کا پورا کام ایک ایسی چھوٹی سی جماعت انجام دیتی ہے جو اپنی دلچسپی' تجربہ اور صلاحیت کے اعتبار سے قومی مسائل کی عقدہ کشائی کی ہر طرح اہل سمجھی جاسکتی ہے۔ دارالامراء کے مباحث کا معیار عام طور پر بہت بلند ہوتا ہے۔ اس کا طریقۂ کار ایوانِ عام سے جُداگانہ ہے۔ یہاں وقت کی کمی نہیں۔ تمام مسائل کا وہ تفصیلی جائزہ لے سکتے ہیں۔ جزئیات سے بڑھ کر ان کی نظر مسائل کی بنیاد اور اساس پر پڑتی ہے اور وہ قوم کے وسیع تر مفادات کو ملحوظ رکھ سکتے ہیں، گو اس میں ان کی روایتی قدامت پسندی کا رنگ جھلکتا ہے۔ قانون سازی میں وقت کی تنگی کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کے ازالہ میں دارالامراء مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ غیر متنازعہ قانون سازی میں اس سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر دارالعوام کے کام کے بوجھ کو بہت بڑی

حد تک ہلکا کیا جا سکتا ہے ۔ ایسے قابل وزراء جو بوجہ کبر سنی وزارت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ دارالعوام میں لیڈری کے فرائض کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے ان کے لئے دارالامراء کا وجود ایک نعمت غیر مترقبہ ہے ۔ یہاں کی نشست حاصل کرکے وہ کام کے دوہرے بوجھ سے بچ سکتے ہیں ۔ ورنہ کیبنٹ ان کی خدمات سے محروم ہو جاتی ۔ اور خواہی نخواہی وزارتیں صرف ان کا حصہ بن جاتیں جو تازہ واردانِ بساطِ سیاست ہیں ۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ قانون سازی میں امراء کی ترمیمات بعض اوقات قوم کے بہتر مفادات کی ضامن رہی ہیں ۔ ایسی صورتوں میں دارالعوام نے ان ترمیمات کو قبول کرکے اس حقیقت کو گویا تسلیم کیا ہے ۔ 1893ء میں گلیڈسٹن کے دوسرے ہوم رول بل کو مسترد کرکے دارالامراء نے اس معاملہ میں قوم کے منشاء کی زیادہ صحیح طور پر ترجمانی کی ۔ اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ اس موقعہ پر دارالامراء دارالعوام سے زیادہ رائے عامہ کا سچا آئینہ دار ثابت ہوا ۔

ترقی پسند قانون سازی میں مزاحمت

دوسرے قانونِ اصلاح کے بعد سے جب کبھی لبرل حکومت برسرِ اقتدار رہی، دارالامراء اس کی ترقی پسند مجوزہ قانون سازی میں اکثر روڑے اٹکاتا رہا ۔ 1869ء میں قانون مسدودی کلیسائے آئرستان کی مخالفت کی ۔ خفیہ رائے دہی کے قانون کو بھی وہ پاس ہونے سے روکنا چاہتے تھے ۔ 1884ء کے قانونِ اصلاح کے موقعہ پر ایک بڑا قضیہ کھڑا کیا اور بڑی دشواریوں کے بعد دونوں ایوانوں میں مفاہمت ہو سکی ۔ اس قسم کی پیہم معاندانہ روش سے لبرل حلقوں میں یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا تھا کہ یا تو اس ایوان کو سرے سے ختم کر دیا جائے یا اس کے اختیاراتِ قانون سازی پر نظر ثانی کرکے ان کا ازسرِ نو تعین کیا جائے ۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں اپنی اندرونی گروپ بندی اور انتشار کی وجہ سے لبرل پارٹی قدرے کمزور رہی ۔ اور اس کو حکومت بنانے کا بھی نسبتاً کم موقعہ ملتا رہا ۔ لیکن 1906ء کے عام انتخابات میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی ۔ ان کے سامنے قانون سازی کا ایک وسیع پروگرام تھا ۔ اس مرحلہ پر دارالامراء نے اپنی

روایتی مزاحمانہ پالیسی اختیار کر رکھی۔ 1909ء تک بعض ایسے مسودات کو دارالامراء نے مسترد کر دیا جو حکومت کے نزدیک بہت اہمیت رکھتے تھے۔ یا پھر ان میں سے بعضوں کی ایسی ترمیم کی کہ ان کی ہیئت ہی بدل گئی۔ اسکاٹ لینڈ کے لئے "قبضۂ اراضی" سے متعلق چار مسودات "تکثیری رائے دہی (PLURAL VOTING BILL.) کا مسودہ" مسودۂ اجازت نامہ جات" (LICENSING BILL) اور مسودۂ تعلیم (EDUCATION BILL) یہ سب یکے بعد دیگرے دارالامراء کے ہاتھوں تہس نہس ہو کر رہ گئے۔ حکومت ایوان کے اس رویہّ سے سخت ناراض اور غضبناک تھی۔ چنانچہ اس کے ایماء پر 1907ء میں دارالعوام نے ایک قرارداد منظور کی جس میں اس بات کی دھمکی دی گئی تھی کہ دارالامراء کے اختیاراتِ قانون سازی کی تخفیف کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں گے تاکہ ایسے قوانین کی منظوری میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے جن کو عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کی تائید حاصل ہے اور جن کا مقصد رائے دہندوں کے منشاء و مرضی کو قانونی جامہ عطا کرنا ہے۔

دارالامراء کے مالی اختیارات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امراء پر اس دھمکی کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے اب تک عام مسوداتِ قانون (PUBLIC BILLS.) پر دست درازی کی تھی، اس نوع کے مسوداتِ قانون کی حد تک ان کو ترمیم اور استرداد دونوں کا حق حاصل تھا۔ لیکن اب وہ ایک ایسے میدان میں زور آزمائی کرنے چلے جس میں ان کے اختیارات محدود تھے۔ چنانچہ انھوں نے 1909ء میں فینانس بل کو مسترد کر دیا۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جس کی گزشتہ پچاس برسوں میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ بات مسلّمہ ہے کہ 1671ء سے امراء مالی مسودوں میں ترمیم کا حق کھو چکے تھے لیکن اس میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ ان کا حقِ استرداد برابر برقرار ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر انھوں نے اسی حق کا استعمال کیا لیکن دارالعوام کو ہمیشہ امراء کا یہ اختیار کھلتا تھا۔ چنانچہ 1860ء میں اسی قسم کے ایک موقعہ پر دونوں ایوانوں میں جھڑپ ہو گئی تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ گلیڈسٹن نے بحیثیتِ وزیرِ خزانہ کاغذ پر سے محصول برخواست کرنے کے لئے ایک مسوّدہ پیش کیا۔ یہ بل دارالعوام میں پاس ہو گیا۔ لیکن اُمراء نے اسے مُسترد کر دیا۔ اس پر دارالعوام میں بڑا ہنگامہ ہوا اور کئی قراردادیں منظور

کی گئیں جس میں یہ تو نہیں کہا گیا کہ دارالامرا کو کسی مالی مسودے کے مسترد کرنے کا حق نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہا گیا کہ مالی معاملات چونکہ راست دارالعوام سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کسی مالی بل کو مسترد کرنے میں بھی دارالامرا کو سخت احتیاط کرنی چاہئے اور یہ بھی یاد دلایا گیا کہ عام طور پر امرا نے اس اختیار کو ماضی میں بہت کم استعمال کیا ہے۔ 1861ء سے پہلے ٹیکس عاید کرنے سے متعلق متفرق اور علحدہ مسودے پیش کئے جاتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کے مسترد ہو جانے سے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ گلیڈسٹن نے پارلیمنٹ کے دوسرے سشن میں 1861ء میں ایک نیا طریقۂ کار اختیار کیا۔ تمام ٹیکس کی تجاویز ایک جامع بل کی شکل میں پیش کی گئیں۔ اس میں کاغذی محصول کی مسدودی کی تجویز بھی شریک کرلی گئی تھی۔ ایک واحد جامع بل پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ امرا اس میں دست اندازی کی ہمت نہ کرسکیں۔ اب ان کے لئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو بجٹ کو جوں کا توں منظور کرلیں یا اسے یکسر نامنظور کردیں۔ ثانی الذکر راستہ اختیار کرنا ایک پُرخطر بات تھی۔ کیونکہ یہ عمل حکومت کو روپیہ سے محروم کردینے کے مترادف ہوتا۔ اور اس سے نظم ونسق کی پوری مشینری معطل ہوکر رہ جاتی۔ قدرتی طور پر دارالامرا ایسے کسی بحران کے پیدا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لینے سے ہچکچاتا۔ گلیڈسٹن کی تدبیر کارگر ہوئی۔ فینانس بل کو امرا نے منظور کردیا اور اس کے بعد سے آج تک گلیڈسٹن کے اختیار کردہ طریقۂ کار پر ہی عمل ہوتا ہے۔ تمام رقمی مطالبات اور ٹیکس کی تجاویز ایک ہی بل میں پیش کی جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال سے امرا کا مالی مسودات سے متعلق حق استرداد تو متاثر نہیں ہوا۔ لیکن اس حق کا استعمال امکانی طور پر گوناگوں مشکلات اور پیچیدگیوں کا باعث بن سکتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ 1860ء کے بعد سے امرا نے 1909ء تک اس حق کا کبھی استعمال نہیں کیا۔

1909ء کے بجٹ کی نامنظوری

1909ء کے بجٹ کی نامنظوری امرا کا شاید ایک انتہاپسندانہ عمل تھا اور بلاشبہ بجٹ کے نامنظور کرنے کا انھیں پورا دستوری حق حاصل تھا۔ اس بجٹ میں اراضی پر بھاری ٹیکس عاید کیا گیا تھا اور دولت ٹیکس میں بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ قدامت پسند

اس کی وجہ سے بہت چراغ پا تھے۔ دارالامرا کی اکثریت متمول طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے ٹیکس کی نئی تجاویز کی زد راست ان پر پڑتی تھی۔ اس لئے امرا نے یہ ٹھان لی کہ ایک آخری مقابلہ کے بغیر وہ میدان سے نہیں ہٹیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت مستعفی ہو کر رائے دہندوں سے اس مسئلہ کو رجوع کرے۔ اور اس بارے میں ان کی واضح تائید کا ثبوت پیش کرے۔ بعض مبصرین نے یہ محسوس کیا کہ امرا فینانس بل کو مسترد کرکے عملاً دو نئے حقوق کے دعویدار بنا چاہتے تھے۔ ایک یہ کہ اگر حکومت دارالامرا کے اعتراضات کا لحاظ کرکے مُرمّمہ بجٹ پیش کرے تو اسے مالی مسوّدات کو بالواسطہ ترمیم کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا۔ دوسرے اگر حکومت پارلیمنٹ کو تحلیل کر دے تو وہ اس کے موجب ہونے کی وجہ سے بالواسطہ اس اختیار کے حامل ہو جائیں گے۔

بجٹ کی نامنظوری نے ملک میں ایک بحرانی کیفیت پیدا کر دی۔ اب سوال صرف بجٹ کو منظور کرانے کا نہیں تھا بلکہ دارالامرا کے اختیارات کی قطع و برید پر بھی کھلے عام گفتگو کی جانے لگی۔ لبرل حلقوں میں ایک زمانہ سے اس ایوان سے سخت بدظنی تھی۔ ان کے علاوہ ریڈیکل گروپ اور آئرستانی نیشنلسٹ بھی اپنے اپنے مقاصد کے مدنظر اسے سنگِ راہ سمجھتے تھے۔ دارالعوام نے اس موقعہ پر ایک سخت قرارداد منظور کی جس میں اُمرا کے اس فعل کو دستور کی خلاف ورزی کا نام دیا گیا اور ساتھ ہی حکومت پر کامل اعتماد کا اظہار کیا گیا۔

حکومت نے پارلیمنٹ برخواست کرا دی اور نئے انتخابات کا انتظام کیا گیا۔ جنوری سنہ 1910ء کا یہ انتخاب کچھ زیادہ فیصلہ کن ثابت نہیں ہوا۔ مجموعی حیثیت سے لبرل پارٹی کو اکثریت حاصل رہی مگر اس کے ووٹ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ قدامت پسند اتحادی (CONSERVATIVE UNIONIST.) اپنی نشستوں میں اضافہ تو کر سکے مگر اقلیت میں ہی رہے۔ لیبر پارٹی کو اکتالیس نشستیں اور آئرستانی نیشنلسٹوں کو بیاسی نشستیں حاصل ہوئیں۔ یہ دونوں پارٹیاں لبرل پارٹی سے تعاون کر رہی تھیں اور اس بات پر مُصر تھیں کہ دارالامرا کے اختیارات میں تخفیف کے لئے جلد کوئی مسودۂ قانون پیش کیا جائے۔ مسٹر اسکویتھ (ASQUITH.) کی سرکردگی میں لبرل حکومت نے اپنی تشکیل کے فوراً بعد مُسترد شدہ بجٹ کو بجنسہٖ دارالعوام میں پیش کرکے منظوری حاصل کر لی اور

اسے دارالامراء بھیج دیا۔ اُمراء نے اس مرتبہ عوامی فیصلہ کے مدنظر خاموشی سے بجٹ کے مسودہ کو منظور کر دیا۔

مسودہ قانون پارلیمنٹ ۱۹۱۱ء پر کشمکش

بجٹ کی منظوری کے بعد دوسرا مسئلہ دارالامراء کے اختیارات کی تحدید وتخفیف کا تھا۔ اس اثناء میں ملک بھر میں یہ مسئلہ موضوع بحث بنا رہا۔ پارلیمنٹ میں حکومت پر لیبر اور آئرستانی نیشنلسٹوں کا بہت دباؤ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس مقصد کے لئے جلد از جلد کارروائی کا آغاز کیا جائے۔ حکومت اس سے پہلے اس بات کی پابند ہو چکی تھی کہ وہ اس ضمن میں ضروری قانون سازی کا انتظام کرے گی۔

حکومت نے اس تعلق سے ایک مسودۂ قانون کا خاکہ تیار کرلیا۔ اس بات کی مشکل سے توقع کی جاسکتی تھی کہ دارالامراء اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کے لئے آسانی سے تیار ہو جائے گا۔ ایک سخت کشمکش ناگزیر تھی۔ وزیراعظم نے یہ واضح کر دیا تھا کہ مفاہمت کے نہ ہونے کی صورت میں حکومت دوبارہ اس مسئلہ پر رائے دہندوں سے اپیل کرکے ان سے اختیار کُلی (MANDATE.) حاصل کرے گی۔ اسی اثناء میں یہ کوشش کی گئی کہ بات چیت اور کانفرنسوں کے ذریعہ سے دونوں ایوانوں میں کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے مگر یہ کوشش رائگاں گئی۔ دارالامراء ٹس سے مس نہیں ہوا۔ لہٰذا حکومت نے اس مسئلہ پر نئے انتخابات منعقد کرائے لیکن پارلیمنٹ کی تحلیل کی سفارش کرنے سے پہلے وزیراعظم نے بادشاہ سے یہ تحریری وعدہ حاصل کرلیا کہ انتخابات میں کامیابی کی صورت میں حکومت کو اس بل کے پاس کرانے کے لئے اگر نئے اُمراء بنانے کی ضرورت پیش آئے تو بادشاہ اس میں کوئی پس و پیش نہیں کرے گا۔

ڈسمبر ۱۹۱۰ء میں یہ انتخاب لڑا گیا۔ نیا دارالعوام اپنے پیش رو سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ پارٹیوں کا موقف کم وبیش وہی رہا جو پہلے تھا۔ ان کی عددی قوت میں کوئی نمایاں کمی یا بیشی نہیں ہوئی مگر مجموعی حیثیت سے لبرل پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ نئی حکومت نے اپنا تیار کردہ مسودۂ قانون دارالعوام میں پیش کر کے اس کی منظوری حاصل کرلی۔ اس تمام کارروائی میں لیبر اور آئرستانی نیشنلسٹ پارٹیاں

حکومت کی سرگرمی سے تائید کرتی رہیں۔ جب یہ مسودہ دارالامرا بھیجا گیا تو یہاں مخالفت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ انھوں نے اسے مسترد تو نہیں کیا البتہ اس میں ترمیمات کر دیں۔ حکومت ان ترمیمات کو قبول کرنے تیار نہیں تھی۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم نے یہ بات ظاہر کر دی کہ بادشاہ سے حسب ضرورت نئے امرا بنانے کا وعدہ حاصل کر لیا گیا ہے۔ یہ بات اب تک راز میں رکھی گئی تھی۔ اب اس کے افشا پر بڑا شور وغل ہوا۔ یہ کہا گیا کہ حکومت بادشاہ پر ناجائز دباؤ اور تخویف سے کام لے رہی ہے۔ مگر یہ سب چیخ وپکار بے سود تھی اُمرا نے جب یہ محسوس کر لیا کہ ایسے مواقع کے لئے دستور نے جس تلوار کو نیام میں رکھ چھوڑا ہے، وہ اب بے نیام ہونے کو ہے تو انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ بل منظور ہو گیا۔

قانون پارلیمنٹ ۱۹۱۱ء

قانون پارلیمنٹ (۱۹۱۱ء) کے ذریعہ سے مالی مسودات سے متعلق امرا کے اختیارات کا بالکل خاتمہ کر دیا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ دارالامرا اگر کسی "مالی بل" کو دارالعوام سے وصول ہونے کے بعد ایک مہینہ کی مدت میں بغیر کسی ترمیم کے منظور نہ کرے تو اس مدت (ایک ماہ) کے منقضی ہونے کے بعد اسے راست بادشاہ کے حضور پیش کر کے اس کی منظوری حاصل کر لی جائے گی۔ اس طرح اسے اُمرا کے اتفاق کے بغیر قانون کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ جس کسی بل پر اس کے مالی ہونے کے متعلق اسپیکر کی تصدیق ثبت ہو وہ مالی بل متصور ہو گا۔ اسپیکر کی اس تصدیق کے خلاف کہیں کوئی اپیل نہ ہو سکے گی۔

دوسرے عام مسوّدات (PUBLIC BILLS) سے متعلق بھی امرا کے حق استرداد کو عملاً ختم کر دیا گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دارالعوام کے منظور کردہ کسی بل کو صرف دو سال کے لئے روک سکتے تھے۔ اس مدت کے منقضی ہونے کے بعد عام مسودات بھی ان کی منظوری کے بغیر قانون کا درجہ حاصل کر سکتے تھے۔ ان کا حق امتناع (VETO) اب قطعی اور آخری نہیں رہا۔ اس کی حیثیت ایک مدتی اور مشروط امتناع کی ہو گئی۔ اس کے لئے جو طریقۂ کار تجویز کیا گیا وہ یہ تھا کہ اگر کوئی مسودہ بلا کسی ترمیم کے اپنی ابتدائی شکل میں دارالعوام کے تین مسلسل اجلاسوں میں منظور ہوتا رہا ہو۔ اور ہر مرتبہ اُمرا نے اُسے

مسترد کیا ہو تو ان کی منظوری کے بغیر وہ بادشاہ کی دستخط کے بعد قانونی حیثیت اختیار کرے گا، بشرطیکہ دارالعوام میں منظوری کے دوران اس مسودہ کی پہلی سشن میں دوسری خواندگی سے، تیسرے سشن میں آخری خواندگی تک کم از کم دو سال کی مدت منقضی ہو چکی ہو۔ تین مسلسل اجلاسوں میں منظوری کی جو شرط رکھی تھی اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ ایک ہی پارلیمنٹ کے اجلاس ہوں۔ ایک سے زیادہ پارلیمنٹوں کے پیہم (اور بلا فصل) اجلاس اس غرض کے لئے کافی تھے۔ اس کے علاوہ دارالعوام کی میعاد کو سات سال سے گھٹا کر پانچ سال کر دیا گیا۔ اس سے دارالعوام پر رائے دہندوں کے دباؤ کو زیادہ کرنا مقصود تھا۔

اس قانون کے پاس ہونے سے دارالامراء کی حیثیت اور اس کا وقار بہت متاثر ہوا۔ ایوان زیریں بہت طاقتور ہو گیا۔ اس پر ایوانِ بالا کا کوئی دباؤ باقی نہیں رہا حکومت اب اس کی تائید کی محتاج نہیں رہی، اور نہ وہ اس قابل رہا کہ حکومت کے وجود کو خطرہ میں ڈال سکے۔ لیکن جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے اس قانون کی منظوری کے بعد سے 1939ء تک اس طریقۂ کار کے ذریعہ سے صرف دو قوانین منظور کئے جا سکے۔ امراء اب بھی دو سال تک کسی مسودہ کو روک کر اس کی افادیت اور ضرورت کو ختم کر سکتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں خود حکومت اپنا مسودہ واپس لے لے۔ اس قانون کے نتائج کے بارے میں منجملہ اور باتوں کے ایک پیش قیاسی یہ کی جاتی رہی تھی کہ اس سے دارالعوام پر کیبنٹ کا اقتدار اور کنٹرول بہت بڑھ جائے گا۔ کیونکہ کسی مطلوبہ قانون سازی کی تکمیل کے لئے ایوان کی اکثریتی پارٹی کی یہ کوشش ہوگی کہ مدت معینہ سے پہلے کوئی پارلیمنٹ برخواست نہ ہونے پائے۔ اس سے قدرتی طور پر پارٹی کی جانب سے کیبنٹ کو کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اور اس کی پوزیشن دارالعوام کے مقابلہ میں غیر متزلزل اور مستحکم ہو جاتی۔ مگر یہ پیش قیاسی صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ بعد کے زمانہ میں ایسا کوئی رجحان اس قانون کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتا نظر نہیں آیا چاہے اس کی وجوہات کچھ بھی ہوں۔ جو بات دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ 1911ء کے بعد سے 1945ء تک (پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے زمانوں کو چھوڑ کر) صرف ایک پارلیمنٹ پنج سالہ میعاد پوری کر سکی باقی پارلیمنٹیں وقت سے پہلے برخواست ہوتی رہیں۔ اس سے اُوپر کی پیش قیاسی کی صاف نفی ہو جاتی ہے نیز

یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ۱۹۱۱ء کے ایکٹ کے تحت قانون سازی کا جو طریقہ کار رکھا گیا تھا اس کا ان پارلیمنٹوں کی قبل از وقت برخواستگی کی وجہ سے کامیابی کے ساتھ بروئے عمل لایا جانا سخت دشوار تھا۔ خصوصاً ان مختصر المیعاد پارلیمنٹوں کی زندگی کے نصف آخر میں تو یہ طریقۂ کار قطعاً ناقابلِ عمل اور بے فیض ہو جاتا۔

قانون پارلیمنٹ ۱۹۴۹ء

غالباً انہی مشکلات کے مدنظر ۱۹۴۹ء میں ایک اور قانون پاس کیا گیا۔ اس وقت لیبر حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ دارالامراء پہلے قانون کی رُو سے دو سال تک کسی قانون میں رکاوٹ ڈال سکتا تھا۔ اب اس مدت کو گھٹا کر ایک سال کر دیا گیا۔ اس سے دارالامراء کے اختیارات میں مزید تخفیف ہوئی۔ لیکن اہم بات یہ نہیں ہے کہ لیبر حکومت نے اُمراء کے اختیارات میں کچھ اور کمی کر دی، بلکہ، یہ کہ لیبر پارٹی جو امراء کے ہر قسم کے حقِ امتناع کی سخت مخالف تھی وہ جُزوی طور پر ہی سہی لیکن اس امتناع کو برقرار رکھنا گوارا کر سکی۔ وہ تو سرے سے اس ایوان کے مخالف تھے اسے غیر نمائندہ ایوان سمجھتے تھے۔ اس کے وجود کے جواز کے قائل نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کو مٹایا نہیں بلکہ قانون ۱۹۴۹ء کے ذریعہ سے عملاً اس کے وجود کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔

دارالامراء اختیارات میں تخفیف کے باوجود اب بھی ایک موروثی ایوان ہے۔ اس کی ہیئتِ ترکیبی اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ اس کی اصلاح کے لئے تاحال کوئی اقدامات نہیں کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اس سلسلہ میں انیسویں صدی کے اواخر سے مختلف اور متعدد تجاویز پر غور کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں لارڈ برائس (LORD BRYCE.) کی صدارت میں حکومت نے ایک کانفرنس منعقد کی تاکہ وہ ایوانِ بالا کی تشکیل جدید اور اس کے اختیارات کا تفصیلی جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ لارڈ برائس نے بحیثیت چیرمن اپنی سفارشات ۱۹۱۸ء میں حکومت کو پیش کر دیں۔ لیکن آج تک ان پر عمل آوری نہیں ہوئی۔ لیبر پارٹی نے بھی اس خصوص میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی حالانکہ اسے کئی مرتبہ اپنی حکومت بنانے کا موقعہ ملتا رہا ہے۔

بیسواں باب

پارلیمانی اصلاح

بیسویں صدی میں

تیسرے قانونِ اصلاح کے بعد

تیسرے قانونِ اصلاح (1884-85ء) کے بعد انیسویں صدی کے اختتام تک پارلیمانی اصلاح کے مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

اس دور میں قدامت پسند پارٹی[1] (یونینسٹ) کافی طاقتور تھی اور 1895ء سے 1906ء تک مسلسل برسرِاقتدار رہی۔ ان کو اصلاح کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن 1906ء کے بعد لبرل برسرِاقتدار آئے۔ اس سال جو انتخاب ہوا اس میں لیبر پارٹی نے کم و بیش تیس نشستیں حاصل کی تھیں۔ ان نئی قوتوں کے اُبھرنے سے پارلیمانی اصلاح کا مسئلہ پھر جاذبِ توجہ بننے لگا۔ قطع نظر اس کے، ملک کے مختلف حصوں میں آبادی کا تناسب معاشی اور صنعتی سرگرمیوں کی وجہ سے بدلتا جا رہا تھا اور عام طور پر آبادی میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ پچھلے قانونِ اصلاح میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ حلقۂ انتخاب میں ایک مخصوص مدت کے لئے اقامت گزیں ہونے کی شرط غیر ضروری مشکلات کا باعث تھی۔ محض اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ حقِ رائے دہی سے محروم رہ جاتے تھے۔

---

[1] یہ پارٹی اس زمانے میں یونینسٹ (UNIONIST) یا 'اتحادی' بھی کہلاتی تھی۔ کیونکہ وہ اتحادِ آئرلینڈ کے برقرار رکھنے کی حامی تھی۔

اسکاٹ لینڈ اور انگلستان میں اہلیت کے معیار میں فرق رکھا گیا تھا۔ اہلیت کی شرطیں پیچیدہ اور بعض صورتوں میں مبہم تھیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ خامیاں زیادہ واضح طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ ایک اور خرابی تکثیری رائے دہی (PLURAL VOTING۔) کی تھی۔ یہ خیال جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ کسی کو بھی ایک ووٹ سے زیادہ کا حق حاصل نہ رہنا چاہئے۔ لیکن موجودہ قوانین کے تحت تکثیری رائے دہی ایک عام بات تھی۔ ایک ہی شخص کئی کئی جگہ علٰحدہ علٰحدہ ووٹ دے سکتا تھا۔ لبرل حکومت نے 1906ء میں اس کے انسداد کے لئے قانون پاس کرنا چاہا مگر دارالامراء نے اسے مسترد کر دیا۔ بعد میں 1913ء میں بھی اس قسم کی کوشش کی گئی لیکن دوسرے ہی سال جنگِ عظیم کے شروع ہو جانے سے اس مسئلہ کو فی الحال پس پشت ڈال دیا گیا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے بعض گوشوں سے اس کا مطالبہ کیا جانے لگا کہ عورتوں کو بھی حق رائے دہی عطا کیا جانا چاہئے۔ اب تک انھیں اس حق سے محروم رکھا گیا تھا۔ ملک کے ترقی پسند طبقات اس ناانصافی کے مٹانے کے درپے تھے۔ روشن خیال خواتین نے اس مقصد کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کی۔ ان کا یہ مطالبہ دن بدن شدت پکڑتا گیا۔ مگر ان کی یہ تحریک باہمی اختلاف کی وجہ سے کچھ کمزور پڑ گئی۔ اس تحریک کی علمبردار خواتین دو گروہوں میں بٹ گئیں: ایک گروہ دستوری ذرائع اختیار کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، اور دوسرا گروہ تشدد پر اُتر آیا۔ چنانچہ 1914ء میں اس جماعت نے توڑ پھوڑ اور دہشت پسندی کا طریقہ اختیار کر کے جگہ جگہ ہنگامے پیدا کر دیئے۔ لیکن جب جنگِ عظیم چھڑ گئی تو ملک کے وسیع تر مفادات کے مدنظر انھوں نے اپنی پُرتشدد کارروائیاں بند کر دیں، اور اپنی تمام صلاحیتیں ملک اور قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں ان خواتین کی بے بہا خدمات نے قوم کے ذہن کو جذبۂ تشکر سے مملو کر دیا۔

یہ نہیں کہ بیسویں صدی میں ہی پہلی مرتبہ عورتوں کو ووٹ دیئے جانے کی تحریک پیدا ہوئی۔ پچھلی صدی میں بھی ایسے روشن خیال مفکر موجود تھے جو اس خیال کے پُرجوش حامی تھے۔ 1867ء میں جب دوسرا قانونِ اصلاح زیرِ منظوری تھا، جان اسٹورٹ مل نے بڑے شد و مد سے عورتوں کے اس حق کی حمایت کی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس قانون

میں عورتوں کے حق رائے دہی کی بھی کچھ گنجائش نکالی جائے مگر پارلیمنٹ میں اُس کی پُرجوش تقریریں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ قومی ذہن ابھی اس انقلابی تصور کے لئے تیار نہیں تھا۔ 1884ء میں تیسرے قانونِ اصلاح کے پاس کئے جانے کے موقعہ پر بھی اسی نوعیت کی کوشش کی گئی مگر وہ بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن 1914ء تک حالات بدل چکے تھے۔ اس وقت نہ صرف عورتوں کو ووٹ دینے کا سوال تھا، بلکہ عام طور پر انتخابی قوانین کو بدلنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس وقت جنگ شروع ہوگئی تھی مگر اس مسئلہ کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ سب سے زیادہ یہ خیال پیشِ نظر تھا کہ جن نوجوانوں نے جنگ میں اپنا خون بہایا ہے وہ جنگ کے بعد حق رائے دہی سے محروم نہ رہیں۔

کانفرنس کا انعقاد

1916ء میں اس مسئلہ کی جانچ پڑتال کے لئے حکومت کے ایما پر ایک کانفرنس اسپیکر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں دارالعوام کے ستائیس، اور دارالامرا کے پانچ اراکین کے علاوہ تمام سیاسی مکاتب خیال کے نمائندوں کو جگہ دی گئی تھی۔ اس کانفرنس نے اگلے سال اپنی رپورٹ وزیر اعظم کو پیش کر دی۔ دارالعوام نے ان سفارشات کو بہ کثرتِ آراء قبول کر لیا۔ بعد میں حکومت نے ان سفارشات پر مبنی ایک مسودۂ قانون تیار کر کے اس کی منظوری دونوں ایوانوں سے حاصل کر لی۔ اس کو قانونِ پارلیمنٹ 1918ء کہتے ہیں۔

قانونِ پارلیمنٹ 1918ء

اس قانون کی منظوری میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ اس وقت ایک مخلوط حکومت برسر کار تھی اور تمام سیاسی پارٹیاں مجوزہ اصلاح سے کامل طور پر متفق تھیں۔ اس میں پہلی مرتبہ عورتوں کو حق رائے دہی عطا کیا گیا۔ اگرچہ مردوں کے مقابلہ میں ان کے لئے شرائط کسی قدر سخت تھیں۔ مردوں کی حد تک عملاً ہر ایسے شخص کو جو اکیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہو ووٹ حاصل ہوگیا۔ معیارِ اہلیت کے لئے ضلع اور

سشہر میں کوئی فرق یا امتیاز باقی نہیں رکھا گیا۔ یوں تو یہ فرق 1884ء کے قانون کے ذریعہ سے ہی بڑی حد تک ختم کر دیا گیا تھا لیکن کہیں کہیں کچھ استثنائی صورتیں تھیں؛ انھیں اب بالکل ختم کر دیا گیا۔ اب ہر ایسا شخص جو اکیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہے ووٹ کا اہل قرار دیا گیا بشرطیکہ وہ حلقۂ انتخاب میں چھ مہینے سے اقامت گزیں ہو یا بغرضِ کاروبار کسی مکان یا دکان پر قابض ہو جس کی مالیت دس پونڈ سالانہ سے کم نہ ہو۔ اگر کسی شخص نے کسی ایسی یونیورسٹی سے ڈگری لی ہے (اعزازی نہیں) جس کو پارلیمانی حلقۂ انتخاب (CONSTITUENCY) قرار دیا گیا ہے، تو وہ یونیورسٹی کے حلقہ سے بھی ووٹ کا اہل ہوگا، بشرطیکہ اس کی عمر اکیس سال ہو۔

عورتوں کے لئے عمر کی شرط تیس سال رکھی گئی۔ وہ پارلیمانی انتخاب میں رائے دینے کی اسی وقت اہل ہو سکتی ہیں جبکہ وہ خود یا ان کے شوہر مقامی حکومت کے انتخابات میں رائے دینے کے اہل ہوں۔ یہاں اہلیت کا معیار یہ تھا کہ جو شخص بھی پانچ پونڈ سالانہ کی مالیت کے مکان یا جائیداد پر قابض ہو وہ مقامی انتخاب میں رائے دے سکتا تھا۔ اس میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں تھی۔ یونیورسٹی کے حلقے سے بھی عورتیں ووٹ دے سکتی تھیں، بشرطیکہ ان کی عمر تیس سال ہو۔ اور یونیورسٹی کی ڈگری یافتہ ہوں۔

قانون اصلاح سنہ 1918ء کے ذریعہ سے دارالعوام کی نشستوں کی از سرِ نو تقسیم کی گئی۔ سابقہ قانون کے تحت نشستیں چھ سو ستر تھیں، اب انھیں بڑھا کر سات سو سات کر دیا گیا۔ انگلستان اور ویلز کو پانچ سو اٹھائیس نشستیں دی گئیں، اسکاٹ لینڈ کو چہتر اور آئرلینڈ کو ایک سو پانچ۔ لیکن چند سال بعد سنہ 1922ء میں آئرلینڈ کا ایک بڑا حصہ ایک آزاد مملکت بن گیا تو مجموعی نشستوں کی تعداد گھٹا کر (615) کر دی گئی۔ شمالی آئرلینڈ کے چند اضلاع جو انگلستان سے متحد رہے انھیں پارلیمنٹ کے لئے اراکین کو منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔

عام طور پر تمام حلقہ ہائے انتخاب یک رکنی قرار دیئے گئے۔ اس میں البتہ بعض مستثنیات تھے۔ ان مستثنیات میں سشہر لندن، چند خاص شہر (BOROUGH) آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں اور ایسی چند یونیورسٹیاں جنھیں ملا کر ایک حلقۂ انتخاب بنایا گیا تھا یہ سب اپنی طرف سے دو دو نمائندے منتخب کرتے تھے۔ چار اسکاچ یونیورسٹی

یونیورسٹیوں کا ایک گروپ متحدہ طور پر تین نمائندے منتخب کرتا تھا۔

تکثیری رائے دہی (PLURAL VOTING.) کا پوری طرح خاتمہ نہیں کیا گیا۔ کسی حد تک اس میں کمی ضرور کی گئی۔ اب کوئی رائے دہندہ (چاہے مرد ہو یا عورت) دو سے زیادہ حلقہ ہائے انتخاب میں رائے نہیں دے سکتا۔ یا ایک ہی قسم کی اہلیت کی بنا پر وہ ایک سے زیادہ حلقوں میں رائے دہی کا مجاز نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ایک حلقہ میں مقیم ہے اور دو یا دو سے زیادہ حلقوں میں بغرض کاروبار مکان یا "جگہ" پر قابض ہے تو اول الذکر حلقہ میں ووٹ دینے کے بعد وہ ثانی الذکر حلقوں میں سے کسی ایک جگہ ووٹ دے سکتا ہے، دو یا تین جگہ نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ایک حلقہ میں مقیم ہے، دوسرے میں کاروباری حیثیت رکھتا ہے اور ڈگری یافتہ ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی میں بھی وہ ووٹر ہے تو پہلے حلقہ میں رائے دینے کے بعد دوسرے میں بھی وہ رائے دے سکتا ہے تیسرے میں نہیں یا اگر وہ تیسرے رائے دینا پسند کرے تو دوسرے حلقہ میں اس کا حق ساقط ہو جائے گا۔

ایک علٰحدہ قانون کے ذریعے 1918ء میں عورتوں کو پہلی مرتبہ دارالعوام کی رُکنیت کا حق حاصل ہوا۔ اس قانون کے تحت سب سے پہلی خاتون جو دارالعوام کی ممبر بنی وہ لیڈی آسٹر تھی۔ دارالامراء کے دروازے البتہ عورتوں پر ہنوز بند رہے۔ 1922ء میں دارالامراء نے لیڈی رہنڈا (RHONDA.) کے کیس میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر کوئی خاتون اپنی شخصی حیثیت میں رُتبۂ امارت کی حامل ہو جائے تو بھی وہ ایوان میں نشست کی مستحق نہیں ہوگی۔

قوانین پارلیمنٹ بابتہ 1928ء 1948ء

1928ء میں رائے دہی کی حد تک عورتوں اور مردوں کے حقوق میں یکسانیت پیدا کی گئی۔ اس قانون کی رُو سے ہر بالغ شخص جس کی عمر اکیس سال ہو (بلا لحاظ صنف) ووٹ دینے کا مجاز ہوگا بشرطیکہ وہ حلقۂ متعلقہ میں سکونت پذیر ہو یا پھر "کاروباری جگہ" پر قبضہ کی شرط پوری کرتا ہو اور اس "جگہ" یا "مکان" کی مالیت سالانہ دس پونڈ ہو۔ یا پھر ایسے فرد سے شادی کی ہو جس کو متذکرہ اہلیت حاصل ہے۔ سکونت کی مدت گھٹا کر تین مہینے کر دی گئی۔ کاروباری "جگہ" پر قبضہ کی بنا پر کسی شخص کو ووٹ کا حق تو پیدا

ہوگا، لیکن وہ سکونت اور کاروبار کے دو حلقوں میں ایک ساتھ رائے دینے کا مجاز نہ ہوگا اب دوہری ووٹنگ صرف یونیورسٹیوں کے حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ سے باقی رہ گئی تھی۔ اس کو 1948ء کے "قانون نمائندگی عوام" کے ذریعہ سے دُور کیا گیا۔ یونیورسٹیوں کے انتخابی حلقے ختم کر دیئے گئے اور دوہرے کاروباری ووٹ کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ دو رُکنی حلقہ ہائے انتخاب کا خاتمہ عمل میں آیا۔ اس طرح "ایک فرد ایک ووٹ" کے اصول کو انتخابات کی بُنیاد بنایا گیا۔

1949ء میں ایک قانون کے ذریعہ سے نشستوں کی از سرِ نو تقسیم کی گئی۔ دارالعوام کی کُل رُکنیت چھ سو پچیس قرار دی گئی۔ انگلستان کو ان میں سے پانچ سو چھ، ویلز کو چھتیس، اسکاٹ لینڈ کو اکہتر اور شمالی آئرستان کے اضلاع کو بارہ نشستیں دی گئیں۔ جہاں تک رائے دہی کی عمر کا تعلق ہے ابھی حال میں اس میں کمی کی گئی ہے۔ جدید ترین قانون کی رُو سے 18 سال کی عمر رکھنے والے بھی رائے دینے کے مجاز قرار دیئے گئے ہیں۔

اکیسواں باب

کیبنٹ عہدِ حاضر میں

دستور پر جنگِ عظیم کے اثرات

تاج اور کابینہ اوائل بیسویں صدی میں

پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ اپنے ایسے اختیارات کے استعمال میں ہمیشہ اٹل اور مصمم رہی جن کو وہ اپنا دستوری حق سمجھتی تھی۔ تاج کے دستوری اختیارات سے متعلق وہ جس نقطۂ نظر کی حامل تھی اور جس پر وہ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی رہی، اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ بیج ہاٹ نے تاج اور کابینہ کے تعلقات کی جو تصویر کھینچی تھی اور اس کا جو تجزیہ کیا تھا وہ انیسویں صدی کے حالات میں من و عن صحیح نہیں تھا لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا وہ ایک صحیح پیش قیاسی ثابت ہوئی۔ ملکہ اپنے عہد میں صرف ان تین اختیارات کے استعمال کرنے پر قانع نہیں رہنا چاہتی تھی جو بیج ہاٹ نے بیان کئے تھے۔ وہ اپنے دائرۂ عمل کو اس سے زیادہ وسیع سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس کی متعدد مثالیں اس سے پہلے دے دی گئی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بعض اوقات حالات سے وہ مجبور ہو جاتی تھی اور کیبنٹ کے آگے مصلحتاً ہی سہی اسے ہتھیار ڈال دینے پڑتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس خیال کی حامی تھی کہ پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ بالکل تاج کے اختیارِ تمیزی پر منحصر ہے وہ سمجھتی تھی کہ اس معاملہ میں کیبنٹ کی رائے کو وہ مسترد کرنے کی مجاز ہے۔ چنانچہ 1892ء میں وہ اپنے وزراء کی مخالفت میں پارلیمنٹ کی تحلیل کی خواہاں تھی مگر اس اقدام سے

اُسے بروقت روک گیا[1] ملکہ نے بھی اس موقعہ پر یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنائے ۔ ملکہ کے آخری زمانے میں اس قسم کی مجبوریاں بڑھتی ہی گئیں اور یہ مجبوریاں کابینی ارتقار کے تعلق سے ہوا کا رُخ بتاتی ہیں ۔

ملکہ وکٹوریہ کے بعد اس کے جانشینوں نے اس موقف کو ترک کردیا۔ انھوں نے تاج کو سیاسی فیصلوں کی سطح سے یکلخت بالاتر کردیا ۔ ایڈورڈ ہفتم نے اپنے عہد میں سیاسی معاملات میں سخت غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کی۔ مسٹر بالفر (BALFOUR) کی حکومت جب اپنے اندرونی اختلافات کی وجہ سے ٹوٹ گئی تو بادشاہ نے مخالف پارٹی کے لیڈر مسٹر ہنری کیمپبل بنرمن (Mr. HENRY CAMPBELL BANNERMAN) کو وزیراعظم کی حیثیت سے قبول کرلیا ۔ اس کے وزرار کے انتخاب میں کوئی دخل اندازی نہیں کی ۔ اور اس کی درخواست پر پارلیمنٹ کو تحلیل کردیا ۔ یہی عمل اس کا مسٹر اسکویتھ (ASQUITH .) کے ساتھ بھی رہا جب وہ بنرمن کی سبکدوشی پر 1908ء میں وزیراعظم ہوا ۔ 1909ء میں دارالامرار نے جب بجٹ کو مسترد کردیا تو اسکویتھ کی درخواست پر بادشاہ نے پارلیمنٹ تحلیل کردی ۔ ان موقعوں پر تاج کا طریقۂ عمل ٹھیٹ دستوری حکمران کا سا رہا ۔ ایک موقعہ پر جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ وہ آزاد تجارت کی پالیسی میں کسی تبدیلی کا مخالف ہے تو بادشاہ کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ بادشاہ سیاسی معاملات میں وہی رائے رکھتا ہے جو اس کے وزرار کی ہو ۔ اس میں اس کی ذاتی رائے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا لہٰذا اس سلسلہ میں جو بات اس سے منسوب کی گئی ہے صحیح نہیں ہوسکتی ۔

جارج پنجم کا طریقۂ عمل بھی ایک ٹھیٹ دستوری حکمران کا سا رہا ۔ اس کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اسے ایک مشکل فیصلہ کرنا پڑا ۔ پارلیمنٹ کو منتخب ہوئے ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا لیکن حالات ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ دوسرا انتخاب بھی ناگزیر نظر آرہا تھا۔ دارالامرار اور دارالعوام کے درمیان "پارلیمنٹ بل"[2] پر بُری طرح ٹھن گئی تھی ۔ حکومت مجوزہ قانون

---

[1] CONSTITUTIONAL HISTORY OF MODERN BRITAIN by D.L KEIR. P. 490

[2] ۔ اس کی تفصیل پچھلے ایک باب "دارالامرار کے اختیارات میں تخفیف" میں دی گئی ہے ۔

کو منظور کرانے پر تُلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دست وبازو کو مضبوط کرنے کے لئے ایک اور انتخاب کی خواہاں تھی۔ چنانچہ بادشاہ سے پارلیمنٹ کے تحلیل کئے جانے کی درخواست کی گئی۔ اس نے یہ درخواست منظور کرلی۔ یہ نہیں کیا کہ حزب مخالف کو حکومت بنانے کی دعوت دے اور بعد میں ان کی درخواست پر پارلیمنٹ کو تحلیل کرے۔ ایسا عمل خطرناک ہوتا۔ ایسی صورت میں اس مسئلہ کا وہ خود ایک فریق بن جاتا اور انتخابات میں شکست کی صورت میں اس کی پوزیشن بُری طرح متاثر ہوجاتی اور اس کو ندامت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسکو بیتھ کی درخواست منظور کرکے اس نے سیاسی تنازعہ سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اس سے بڑھ کر اسے ایک اور مشکل فیصلہ کرنا پڑا۔ وزیر اعظم نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی قوم کے سامنے اسی وقت جانے کے لئے تیار ہوں گے جب انھیں اس بات کا یقین ہو کہ ان کی کامیابی کی صورت میں بادشاہ اس مسودہ کو پاس کرانے کی غرض سے نئے امراء کے بنانے میں کوئی پس وپیش نہیں کرے گا۔ یہ فیصلہ جارج پنجم کے لئے بہت زیادہ دشوار تھا۔ چونکہ اس وقت آئین کے زمانہ کی طرح بارہ اُمراء سے کام نکلنے والا نہیں تھا یا پہلے قانونِ اصلاح 1832ء کے موقعہ پر اگر اُمراء سازی کی ضرورت پیش آتی تو زیادہ سے زیادہ پچاس اُمراء بنانے پڑتے۔ موجودہ صورت یہ تھی کہ مسودہ کی کامیابی کے لئے کم وبیش چار سَو اُمراء درکار تھے۔ اتنی بھاری تعداد میں اُمراء بنانے کا وعدہ کرنا بادشاہ کے لئے محلِ تذبذب ہوسکتا تھا۔ لیکن دوسری کوئی متبادل صورت نہیں تھی۔ بادشاہ نے یہ مطالبہ قبول کرلیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس موقعہ پر بادشاہ اپنے وزراء کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی تھا۔ اس نے حالات کا صحیح تجزیہ کیا اور آزادانہ طریقہ پر اس فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ بحرانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے اور اس غرض سے کہ بہرحال حکومت کی مشینری تعطّل سے دوچار نہ ہوجائے، دستور نے بادشاہ کو اس محفوظ اختیار کا امین بنا رکھا ہے۔ جارج پنجم نے اس موقعہ پر اپنے اختیارِ تمیزی سے اس محفوظ دستوری طاقت کا صحیح استعمال کیا۔ حکومت کی خواہش پر پارلیمنٹ برخواست کردی گئی۔ حسبِ ضرورت امراء بنانے کا وعدہ کرلیا گیا۔ یہاں یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ بعد میں اس مسودۂ قانون کے منظور کرانے کے لئے نئے اُمراء بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مخالف اُمراء نے ایوان میں رائے دہی

کے وقت غیر حاضر ہوکر اس مسودۂ قانون کو پاس ہونے کا موقعہ عطا کردیا ۔ چنانچہ سترہ ووٹوں کی اکثریت سے یہ مسودہ پاس ہوگیا ۔

مخلوط حکومت اور جنگی کمیٹی کا قیام

سنہ 1914ء میں جنگِ عظیم کے شروع ہونے کی وجہ سے انگلستان کے لئے ایک طویل کشمکش اور آزمائش کا دور شروع ہوا ۔ اس سے کابینی نظامِ حکومت پر دُور رس اثرات مترتب ہوئے ۔ جس وقت جنگ شروع ہوئی اسکویتھ (ASQUITH.) کی سرکردگی میں لبرل پارٹی برسراقتدار تھی ۔ ایک سال تک تو حکومت میں کوئی تبدیلیاں عمل میں نہیں لائی گئیں لیکن یہ محسوس کیا جانے لگا کہ قوم کو جو عظیم چیلنج درپیش ہے اس کا بوجھ صرف ایک پارٹی اُٹھا نہ سکے گی ۔ ایسے نازک موقعہ پر ہمہ جہتی قومی تعاون ازبس ضروری تھا ۔ اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ ایک مخلوط حکومت قائم کی جائے جس میں تمام قومی پارٹیوں کو متحد کیا جاسکے ۔ چنانچہ سنہ 1915ء میں یونینسٹ (UNIONIST.) اور لیبر پارٹی کے نمائندوں کو حکومت میں شریک کرلیا گیا ۔ آئرستانی نیشنلسٹوں نے حکومت میں شریک ہونے سے انکار کیا لیکن حکومت کے ساتھ کامل تعاون پر اپنی آمادگی ظاہر کی ۔ یہ تبدیلیاں کچھ کارگر ثابت نہیں ہوئیں ۔ ایسی عظیم الشان جنگ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے موجودہ انتظامات ناکافی اور غیر موثر ثابت ہو رہے تھے ۔ ایک ایسی کیبنٹ جو کم و بیش بیس افراد پر مشتمل ہو اور جس کا وقت اور جس کی توانائیاں مختلف اور متعدد ذمہ داریوں میں بٹی ہوئی ہوں ۔ اس کام کو عمدگی سے انجام دینے کے قابل نظر نہیں آتی تھی ۔ کیبنٹ کے اراکین پر کام کا بھاری بوجھ تھا ۔ انھیں اپنے اپنے محکموں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی ، پارلیمنٹ میں اپنے فرائض انجام دینے پڑتے تھے ۔ پھر کیبنٹ میں جنگ کے مسائل سے نمٹنے کی ذمہ داری الگ تھی ۔ اس منقسم اور منتشر ذمہ داری کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی کام بھی عمدگی سے انجام نہیں پارہا تھا ۔ حکومت کی جو مشینری پرامن حالات سے نمٹنے کے لئے وضع کی گئی تھی وہ جنگ کے سیمابی حالات کا مقابلہ کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی ۔ اخبارات میں حکومت کی غیر موثر کارکردگی پر سخت نکتہ چینی کی جانے لگی ۔ رائے عامہ کے اس دباؤ کے تحت ، اور جنگی کارروائیوں کو زیادہ موثر بنانے کے لئے حکومت نے

"ایک جنگی کمیٹی" (WAR COMMITTEE) تشکیل دی جس میں بشمول وزیر اعظم کابینہ کے چھ ارکان تھے۔ جنگ سے متعلق تمام اعلیٰ ترین اختیارات اس کمیٹی کے سپرد کئے گئے تھے۔ کیبنٹ کے دوسرے اراکین اس میں شرکت نہیں کرسکتے تھے۔ ان کا کام محکمہ جاتی ذمہ داریوں کو انجام دینا تھا۔ "جنگی کمیٹی" جو کچھ فیصلے کرتی ان کی عمل آوری کا کام ان وزرائے کیبنٹ کے سپرد تھا جو محکمہ جات کے صدور تھے اور جو اب اس "اندرونی کیبنٹ" کے رکن نہیں تھے۔ اس تقسیم کار سے یہ توقع تھی کہ جنگ سے متعلق انتظامات بہتر طریقہ سے انجام پاسکیں گے۔

جنگی کیبنٹ ۱۹۱۶ء

لیکن یہ انتظام بھی کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ لائیڈ جارج نے اس کو درہم برہم کردیا۔ یہ اس وقت جنگی کمیٹی کا رکن تھا اور عام طور پر کابینہ پر چھایا ہوا تھا۔ لائیڈ جارج لبرل پارٹی کے نہایت طاقتور لیڈروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ وزیر اعظم اسکویتھ کے موجودہ انتظام سے خوش نہیں تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اس نے مطالبہ کیا کہ "وار کمیٹی" (WAR COMMITTEE) کی ازسرنو اس طرح تشکیل کی جائے کہ اس کے اراکین کی تعداد تین یا چار سے زیادہ نہ ہو اور اس کمیٹی کی صدارت وزیر اعظم کی بجائے کسی اور وزیر کے سپرد کی جائے۔ نیز یہ کہ وزیر اعظم اس کا ممبر نہ ہو۔ اسکویتھ، ظاہر ہے اس مطالبہ کو قبول نہیں کرسکتا تھا جو کھلے طور پر اس کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس پر لائیڈ جارج نے استعفیٰ دے دیا۔ لائیڈ جارج کی علٰحدگی نے موجودہ حکومت کی برقراری ناممکن بنادی۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر عام طور پر ملک میں لائیڈ جارج کو وسیع تائید اور بے پناہ ہردلعزیزی اور مقبولیت حاصل تھی۔ اسکویتھ کو ان حالات میں مستعفی ہونے کے سوائے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی حکومت کا استعفیٰ پیش کردیا۔ بادشاہ نے پہلے یونینسٹ (قدامت پسند) لیڈر بونرلا (BONAR LAW.) کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ اس کے انکار پر لائیڈ جارج کو طلب کیا۔ لائیڈ جارج نے یہ دعوت قبول کرلی اور نئی حکومت تشکیل دی۔ جب نئی حکومت کا اعلان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کیبنٹ اب بالکل بدل گئی ہے۔ اب یہ پہلے کی طرح بیس یا بائیس افراد پر مشتمل نہیں تھی۔ کیبنٹ کے اراکین کی تعداد صرف پانچ تھی۔ اس میں دوسری پارٹیوں کے نمائندوں

کو جب سابق شامل رکھا گیا تھا۔ مخلوط حکومت کا ڈھانچہ برقرار رکھا گیا۔ کیبنٹ میں لبرل پارٹی کی نمائندگی خود وزیراعظم لائیڈ جارج کرتا تھا۔ لیبر پارٹی سے آرتھر ہنڈرسن کو لیا گیا، اور اس میں تین یونینسٹ پارٹی کے اراکین تھے (۱) لارڈ کرزن (۲) لارڈ ملنر (MILNER) اور (۳) بونرلا — نئی کیبنٹ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اراکین سوائے ایک رکن کے محکمہ جاتی ذمہ داریوں سے آزاد رکھے گئے تھے۔ البتہ بونرلا کو محکمۂ خزانہ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ چانسلر آف دی اکسچیکر بھی تھا اور جنگی کابینہ کا رکن بھی۔ وزارت کے دوسرے اراکین جن میں اہم محکمہ جات کے صدور بھی شامل تھے کیبنٹ کے رکن نہیں تھے۔ انھیں صرف وزرار کا درجہ دیا گیا تھا کابینی وزرار کا نہیں۔ کابینہ صرف جنگی مسائل سے نمٹنے کے لئے اس طرح تشکیل دی گئی تھی کہ وہ دوسری ذمہ داریوں میں پھنس کر اپنا وقت ضائع کئے بغیر صرف جنگ کے انتظامات کے لئے اپنے آپ کو وقف کرسکے۔ اس تقسیم کار سے کافی اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ جو لوگ جنگی کابینہ کے رکن تھے اپنا تمام تر وقت جنگی حکمتِ عملی کو معین کرنے اور اس پر عمل آوری کے ذرائع دریافت کرنے کے لئے مختص تھے۔ ان سے باقی تمام ذمہ داریاں لے لی گئی تھیں۔ نظم ونسق سے وہ بالکل آزاد رکھے گئے تھے۔ دوسرے سینئر وزرار محکمہ جاتی صدور کی حیثیت سے نظم ونسق کے ذمہ دار گردانے گئے۔ ان سے کابینی ذمہ داریاں لے لی گئی تھیں۔ اس طرح ان کے وقت کی بچت بھی ہوتی اور ان کی توجہ متعدد اور مختلف ذمہ داریوں کی وجہ سے منقسم نہ ہوسکتی۔ مجموعی طور پر ان انتظامات سے حکومت کی کارکردگی میں نمایاں بہتری کے آثار نمودار ہوئے۔ نئی حکومت میں وزرار کی حیثیت سے ایسے لوگوں کو شریک کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو فنی ماہرین کی حیثیت (TECHNICAL EXPERTS.) رکھتے تھے۔ وزارت کے لئے عام سیاست دان کی بجائے فنی ماہر کو منتخب کرنے کا خیال یہ اس زمانے کی پہلی جدت ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے ایسے نئے محکمے جنگی ضروریات کے مدنظر وجود میں آرہے تھے جن کے کام کی نوعیت فنی مہارت کی طلبگار تھی۔ حکومت کی ذمہ داریاں دن بدن بڑھتی جارہی تھیں۔ اس کے فرائض کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ ان بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے مدنظر نئی نئی وزارتیں بنائی جارہی تھیں جن میں "جہازرانی" "ہوائیہ" اور "تعمیر جدید" کی وزارتیں قابل ذکر ہیں۔ ایسی متعدد اور وزارتیں وجود میں آتی رہیں، حتیٰ کہ ۱۹۱۸ء تک وزارت تقریباً سو اشخاص پر مشتمل ہوگئی تھی۔

کابینی رازداری

پہلی جنگِ عظیم سے پہلے کیبنٹ کے طریقۂ کار میں رازداری پر بڑا زور دیا جاتا تھا. اس کے جلسوں کی نوعیت غیر رسمی ہوا کرتی تھی۔ اس کا نہ کوئی ایجنڈا ہوتا اور نہ اس کے مباحث اور کارروائیوں کا کوئی ریکارڈ۔ اس کی کارروائیوں کو قلم بند کرنا معیوب اور خلافِ قاعدہ سمجھا جاتا تھا. جو وزراء اس میں شریک ہوتے انھیں کوئی کاغذ، پنسل یا قلم فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ اور نہ ہی ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہاں جو کچھ باتیں ہوتیں انھیں وہ اپنے طور پر نوٹ کریں یا انھیں قلم بند کرنے کی کوشش کریں بلکہ اگر اتفاقاً کوئی شخص ایسا کرتا ہوا پایا جاتا تو وزیراعظم اسے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ یہ سب احتیاطیں اس لئے کی جاتی تھیں کہ کیبنٹ کے تمام فیصلوں اور کارروائیوں کو ہمیشہ سے راز میں رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا۔ یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ کیبنٹ کا آغاز ہی ایک خفیہ جماعت کی شکل میں ہوا تھا. شاید یہ اس کا ہی اثر تھا کہ بیسویں صدی کے اوائل تک کیبنٹ ایک خفیہ جماعت کی حیثیت سے کام کرتی رہی اور رازداری کو اپنا شعار بنائے رکھا. مگر یہ بات کچھ عجیب سی ہے کہ انیسویں صدی میں کابینہ کی رازداری میں غیر معمولی اضافہ ہوا ورنہ اٹھارویں صدی میں یہ رازداری اتنی سخت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی میں بھی اس کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا۔ لیکن اس میں زیادہ لچک تھی۔ حسبِ ضرورت کابینہ کے مشوروں میں ایسے لوگوں کو بھی شریک کیا جاتا تھا جو اس کے ممبر نہ ہوتے۔ اور اراکینِ کیبنٹ اپنی یادداشت کے لئے جلسوں کی کارروائیوں کا کچھ خلاصہ لکھ لیا کرتے تھے۔ مگر انیسویں صدی میں رازداری پر زیادہ سختی سے عمل کیا جانے لگا۔ اس رازداری کے چاہے دوسرے فوائد کچھ ہی ہوں لیکن اس طریقۂ کار سے بعض اوقات انتظامی دشواریاں اور خرابیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ چونکہ جو کچھ فیصلے کیبنٹ میں طے پاتے ان کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ہوتا۔ اس لئے کیبنٹ کے اراکین خود بعض اوقات ان فیصلوں کی کوئی صحیح یادداشت اپنے ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکتے۔ بعض اوقات اس بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتیں اور مختلف اراکین فیصلوں سے متعلق مختلف تاثرات لے کر وہاں سے اُٹھتے۔

کابینی کارروائی کے قلم بند ہونے کی صرف ایک صُورت تھی۔ وزیراعظم کے فرائض میں

یہ بات داخل تھی کہ ہر کابینی جلسہ کے بعد وہ بادشاہ کو اس کی تفصیلات اور اس کے فیصلوں سے آگاہ کرے۔ چنانچہ وزیراعظم ایک مکتوب کے ذریعہ سے ان کاروائیوں کی مجمل روئیداد بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا کرتا تھا۔ مگر یہ مکتوب بھی سخت راز میں رکھا جاتا۔ اور اس کے کبھی منظرِ عام پر آنے کا امکان نہیں تھا۔

کابینی سکریٹریٹ کا قیام

جنگِ عظیم نے اس طریقۂ کار کو فرسودہ اور از کار رفتہ بنا دیا۔ خود کیبنٹ کی ہیئت بدل گئی تھی۔ کیبنٹ میں اب محکموں کے صدر نشست نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ کیبنٹ کے فیصلوں سے انھیں آگاہ کیا جائے۔ یوں بھی کام کی اتنی بہتات تھی اور متعلقہ محکموں کو فیصلوں کی عاجلانہ ترسیل کی ایسی شدید ضرورت تھی کہ پرانا طریقۂ کار کسی طرح برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے کابینہ کے لئے ایک دفتر معتمدی (SECRETARIAT.) کا قیام عمل میں آیا۔ کابینہ سے متعلق تمام دفتری کام اس محکمہ کے سپرد ہوا۔ کیبنٹ کا ایجنڈا تیار کرنا، اس کے جلسوں کا انتظام کرنا اور اس کے مباحث کی روئیداد کو ضبطِ تحریر میں لانا، کابینہ کے لئے ضروری مواد، معلومات اور سرکاری کاغذات کی فراہمی، بیرونی اشخاص کو کابینی جلسوں میں شرکت کے لئے حسبِ ضرورت طلب کرنا یہ سب کام اب دفترِ معتمدی انجام دینے لگا۔ اور جب ایک مرتبہ کیبنٹ اپنے فیصلے صادر کر دیتی یا حکمتِ عملی کا تعین کر دیتی تو اس کی اطلاع متعلقہ محکموں کو اسی دفتر کے ذریعہ سے بہم پہنچائی جانے لگی۔ غرض محکمۂ معتمدی کے قیام سے بہت سی انتظامی دشواریوں پر قابو پایا جا سکا۔ اور یہ طریقۂ کار اس قدر مفید ثابت ہوا کہ کابینی سکریٹریٹ نے حکومت کی مشینری میں اپنے لئے ایک جگہ پیدا کر لی اور یہ قدرتی بات تھی کہ ان بدلے ہوئے حالات میں کابینی رازداری کی وہ پہلی سی سختیاں باقی نہیں رہیں۔ چنانچہ کابینہ نے خود سنہ 1917ء اور سنہ 1918ء کی کابینی روائداد کو شائع کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کابینہ کے فیصلے فوراً ہی منظرِ عام پر آسکتے ہیں یا انھیں کوئی وزیر طشت از بام کر سکتا ہے۔ اب بھی ارکین کابینہ پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ ان فیصلوں کو کھلے عام ظاہر کرتے نہ پھریں، حسبِ ضرورت

ان کا جستہ جستہ افشا ہوتا رہتا ہے وہ بھی بہ شکلِ "حدیثِ دیگراں"۔ ؎

کابینہ پر جنگ کے اثرات

جنگ کے زمانہ میں کابینہ کے جلسوں کے انعقاد میں معتد بہ اضافہ ہوا سنہ 1916ء میں نئی جنگی کابینہ کے قیام کے زمانے سے سنہ 1918ء کے اختتام تک کیبنٹ کے 495 اجلاس منعقد ہوئے۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ ملک جن مفاجاتی حالات سے گزر رہا تھا اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ کیبنٹ کے جلسوں کا جلد جلد انعقاد عمل میں آتا رہے۔ نیز یہ بات بھی سیاسی مبصّرین کے لئے باعثِ دلچسپی ثابت ہوئی کہ جنگ کے زمانے میں دو مرتبہ وزارتیں ٹوٹیں اور دو مرتبہ نئی حکومتیں تشکیل پائیں لیکن دونوں موقعوں پر دارالعوام کے مخالف ووٹ کے نتیجہ میں یہ تبدیلیاں عمل میں نہیں آئیں۔ پہلی مرتبہ مسٹر اسکویتھ کو دارالعوام میں کافی اکثریت حاصل تھی لیکن جنگ کے مسائل سے نمٹنے کے لئے اس نے دوسری پارٹیوں کا تعاون حاصل کیا، اور ایک مخلوط حکومت قائم کی۔ دوسری مرتبہ مسٹر اسکویتھ کی سبکدوشی کی اصل وجہ دارالعوام نہیں تھا بلکہ رائے عامّہ لائیڈ جارج کو وزیراعظم دیکھنا چاہتی تھی۔ اس قوت نے عملاً اسکویتھ کو برطرف کیا اور لائیڈ جارج کو وزیراعظم بنایا۔ ایک ہمعصر تبصرہ نگار نے اس موقعہ پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ—

> "اس تبدیلی میں دارالعوام کا کوئی حصہ نہیں۔ اس سے اس بارے میں کسی نے استمزاج نہیں کیا۔ لائیڈ جارج کی طاقت کا منبع پارلیمنٹ میں نہیں بلکہ اس کی چار دیواری کے باہر ہے۔ اس کا وزارتِ عظمٰی پر فائز ہونا ایک قسم کی غیر رسمی اور بے ضابطہ رفرنڈم کا نتیجہ ہے۔ دارالعوام

؎ ۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں وزیراعظم چرچل نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ کیبنٹ کے جلسہ میں اس کو بحیثیتِ وزیراعظم سر اسٹافورڈ کرپس کی سرزنش کرنی پڑی اور عملاً اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا کہ جس کے بارے میں سر اسٹافورڈ کرپس نے اختلاف کیا تھا۔ سر اسٹافورڈ نے اس پر نہایت برہمی سے کہا کہ "اگر وزیراعظم کابینی مباحث کی رازداری کی رعایت کو توڑنا ہی چاہتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ کابینہ کی اس وقت کی پوری کارروائی سے ایوان کو آگاہ کریں۔" یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ کابینہ کے مباحث رازداری کے حامل ہوتے ہیں۔

نے نہ اسے وزیراعظم بنایا ہے اور نہ شاید وہ اس عہدہ سے اسے ہٹا سکے"۔ دارالعوام کی اس تنزل پذیر حیثیت سے متعلق پچھلے صفحات میں بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ کیبنٹ کے برقرار رہنے یا نہ رہنے میں عموماً اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ صورت اب تک ویسی ہی برقرار نظر آتی ہے۔

امپیریل کابینۂ جنگ

جنگ سے پہلے کابینہ کی تشکیل کا ایک بنیادی اصول یہ تھا کہ اس کے اراکین دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک کے رکن ضرور ہوں۔ کابینہ کے لئے جو وزراء منتخب کئے جاتے تھے، وہ یا تو دارالامراء کے ممبر ہوتے یا دارالعوام کے۔ وزیراعظم اگر دارالامراء کا ممبر نہ ہو تو قاعدہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف دارالعوام میں اپنی نشست رکھتا ہو بلکہ اس ایوان کا وہ قائد بھی ہو۔ جنگ کے زمانے میں بھی کیبنٹ کے اراکین دونوں ایوانوں سے ہی لئے جاتے تھے۔ مگر ایک استثنائی صورت جنرل اسمٹس (GENERAL SMUTS) کی نظر آتی ہے۔ جنگ میں جنوبی افریقہ کی قلمرو (DOMINION —) نے انگلستان کی تائید میں شرکت کی تھی۔ جنرل اسمٹس کو ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک "وار کیبنٹ" کا ممبر مقرر کیا گیا۔ جنگی کابینہ میں وہ جنوبی افریقہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ لیکن انگلستان کی پارلیمنٹ کا وہ ممبر نہیں تھا۔ اس کی پوزیشن کچھ عجیب و غریب سی تھی۔ اس قسم کی کوئی نظیر اس سے پہلے کے زمانے میں نہیں ملتی۔ جنگ کے غیر معمولی حالات کے زیر اثر کابینی نظام کے طریقۂ کار میں کچھ اور تبدیلیاں بھی پیدا ہونے لگیں۔ کابینی وزراء اب پارلیمنٹ میں بہت کم نظر آتے تھے۔ پارلیمانی مباحث میں وہ شاید ہی شرکت کر سکتے تھے۔ وزیراعظم جو دارالعوام کا رکن تھا ایوان کی قیادت کے فرائض سے اپنے آپ کو سبکدوش کر چکا تھا۔ ایوان میں اس کی نیابت کے لئے وزیر خزانہ البتہ موجود رہتا۔ مجموعی طور پر ایوان میں وہ حکومت کے ترجمان کی حیثیت رکھتا اور حکومت کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا۔ وزیراعظم کی بجائے سوالات کی جواب دہی بھی اسی کے سپرد تھی۔ لیکن پارلیمنٹ کام کے اس ڈھنگ سے کچھ خوش نہیں تھی۔ اکثر اوقات دونوں ایوانوں میں وزراء کے اس طرز عمل پر سخت اعتراضات کئے جاتے تھے اور ان کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا۔

اس دور کی ایک اور دستوری جدت قابل ذکر ہے۔ "جنگی کابینہ" کو ایک وسیع تر "امپیریل کیبنٹ" میں تبدیل کیا گیا۔ اس میں برطانیہ کی کابینہ جنگ کے ارکین کے علاوہ خودمختار برطانوی قلمروؤں (DOMINIONS.) کے وزرائے اعظم کو شریک کیا گیا۔ لائیڈ جارج نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد برطانوی امپائر کی ان خودمختار قلمروؤں کی تائید کو موثر بنانے کے لئے ان کے وزرائے اعظم کو برطانوی جنگی کابینہ میں شرکت کی دعوت دی۔ اب برطانیہ کی کابینہ جنگ ایک وسیع تر ادارہ بن گئی جس میں امپائر کے تمام اجزار اور عناصر کو نمائندگی دی گئی۔ اس میں قلمروؤں کے وزرائے اعظم کے علاوہ وزیر ہند اور وزیر نوآبادیات کو بھی جگہ دی گئی۔ موخرالذکر دو وزراء ہندوستان اور باقی تمام برطانوی نوآبادیات کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ وسیع تر کیبنٹ برطانوی وزیراعظم کی صدارت میں منعقد ہوتی تھی۔ اور اس کے جلسے ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں مختلف مواقع پر یہ سلسلہ چند ماہ کے لئے منعقد ہوتے رہے۔ اسی زمانہ میں یہ بات واضح کی گئی کہ "سمندر پار کے جو نمائندے امپیریل کیبنٹ میں شرکت کرتے ہیں وہ مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے برطانوی ارکین کیبنٹ کے ہم پلہ اور مساوی رتبہ کے حامل ہیں۔ ان کی شرکت کامل مساوات کی اساس پر مبنی ہے۔ اور انھیں وہی اختیارات حاصل ہیں جو کیبنٹ کے کسی برطانوی رکن کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران ان تمام کاغذات، دستاویزات اور معلومات پر کامل دسترس رکھتے ہیں جو برطانوی حکومت کے قبضہ میں ہوں"۔

امپیریل جنگی کابینہ فی الواقعہ جنگی ضروریات کا نتیجہ تھی۔ شہنشاہیت پسند حلقوں میں اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اور یہ توقع ظاہر کی جانے لگی تھی کہ یہ نیا ادارہ جو جنگی ضروریات کے مدنظر وجود میں آیا ہے وہ بعد میں زمانہ امن میں بھی برقرار رہے گا اس کے ذریعہ سے برطانیہ اور اس کی دختر سلطنتیں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو جائیں گی اور یہ باہمی تعاون "شہنشاہیت برطانیہ" کی استواری، پائیداری اور دائمی برقراری کا ایک زینہ ثابت ہوگا۔ غرض اس سے بڑی خوش آئند اُمیدیں وابستہ کی جانے لگی تھیں۔ مگر بہت جلد یہ توقعات ایک نظر فریب سراب کی طرح بے حقیقت ہو کر رہ گئیں۔

"امپیریل کابینہ جنگ" عام کابینہ سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے ارکین برطانوی

پارلیمنٹ کے رکن نہیں تھے۔ اس کو ایک بین الملکی اور بین حکومتی ادارہ تصور کیا جاسکتا ہے اس کے ایک رکن کنیڈا کے وزیراعظم مسٹر بورڈن (.BORDEN) نے اس کے متعلق کہا تھا کہ "یہ ادارہ عام کیبنٹس کی طرح وزراء پر نہیں بلکہ حکومتوں پر مشتمل ہے۔"

جنگ کے اختتام کے بعد اس کو زندہ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور شاید ایسی کوشش کچھ کامیاب بھی ثابت نہ ہوتی۔ عارضی التوائے جنگ (.ARMISTICE) کے بعد ایک سال تک حسب ضرورت اس کے جلسے ہوا کئے۔ بعد میں وہ یکسر معدوم ہوگئی

جنگی کابینہ کا خاتمہ

سنہ 1918ء کے اواخر میں جو انتخاب عمل میں آیا اس میں لائیڈ جارج کی مخلوط حکومت کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ عام طور پر عوام اس بات کے متوقع تھے کہ نئی کیبنٹ کی تشکیل قدیم مروّجہ اصولوں پر ہوگی۔ اور زمانۂ جنگ کی کیبنٹ کو خیرباد کہا جائے گا۔ لیکن جب نئی کیبنٹ کا اعلان ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ زمانۂ جنگ کی کابینہ کو ہنوز برقرار رکھا گیا ہے۔ نیز حکومت نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس طرز کی کابینہ اس وقت تک برقرار رکھی جائے گی جب تک صلحناموں کا کام مکمل نہ کرلیا جائے۔

لیکن اس کا عام طور پر ملک میں کچھ اچھا اثر نہیں ہوا۔ لوگ جنگ کے زمانے کے آمرانہ طرزِ حکومت سے بیزار ہوگئے تھے۔ وہ مروّجہ دستوری طریقوں کی طرف لوٹنا چاہتے تھے۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں حکومت پر تشنیع و تعریض کی بوچھاڑ کی جانے لگی۔ سنہ 1919ء میں متعدد ضمنی انتخابات کی ضرورت پیش آئی۔ ان انتخابات میں یہ دیکھا گیا کہ حکومت کی مقبولیت بُری طرح متاثر ہوگئی ہے۔ اس کے ووٹ میں نمایاں کمی واقع ہوگئی تھی۔ عام طور پر ملک میں اور پارلیمنٹ میں وزراء کی، پارلیمنٹ سے غیرحاضری، وہاں کے مباحث میں عدم شرکت اور ان سے بے پروائی، کابینی ذمہ داری کے اُصولوں کی پامالی پر سخت بے چینی اور بددلی کا اظہار کیا جانے لگا تھا۔ جنگ کے زمانے میں تو یہ باتیں برداشت کرلی گئی تھیں لیکن اب انھیں کوئی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

روایتی کابینہ کی بحالی

حکومت کے خلاف بددلی اور بیزاری کا جو مواد پک رہا تھا وہ بالآخر پھوٹ پڑا۔

دارالعوام میں حکومت کو اس کے ایک پیش کردہ بل پر شکست ہوگئی ۔ یہ جنگی کابینہ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار تھا ۔ لائیڈ جارج نے اس شکست کے بعد فوراً ہی ایک نئی مخلوط حکومت تشکیل دی ۔ دارالعوام نے ایک زمانہ دراز کے بعد اپنے اختیارات سے کام لیا تھا ایک عرصہ سے وہ مجہول اور بے جان سا معلوم ہونے لگا تھا مگر اچانک وہ اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ جی اٹھا اور جس کیبنٹ کی محکومیت کا وہ عادی ہو چکا تھا اسے ایک پر کاہ کی طرح باہر نکال پھینکا ۔ کیبنٹ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی ۔ دارالعوام کی مرضی کے مطابق ایک ایسی حکومت وجود میں آئی جس کی تشکیل سابقہ کابینی اصولوں کے مطابق تھی ۔ نئی کابینہ اُنیس اراکین پر مشتمل تھی اور تمام اہم محکموں کے صدور کو اس میں جگہ دی گئی تھی ۔ دارالعوام نے اس موقعہ پر کیبنٹ کے مقابلہ میں جو جاں بازی دکھائی تھی وہ اس بات کی علامت نہیں کہ پھر سے وہ اپنا وہ موقف بحال کرنے میں مصروف ہے جو اسے انیسویں صدی کے وسطی دَور میں حاصل تھا ۔ اس وقت ایک مخلوط حکومت برسر کار تھی ۔ اس کو مختلف پارٹیوں کی تائید حاصل تھی لیکن یہ سب اپنی علٰحدہ علٰحدہ انفرادیت کی وجہ سے جسدِ واحد نہیں تھیں ۔ ان میں پھوٹ اور افتراق آسانی سے پیدا ہو سکتا تھا اور ان کی وفاداریاں پارٹی ڈسپلن کے شکنجہ میں کسی ہوئی نہیں تھیں ۔ ان حالات میں کیبنٹ کی عمارت قدرے کمزور بنیادوں پر قائم تھی ۔ ایسے میں اس کو کسی وقت بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ موجودہ شکست کو ان ہی اسباب کا نتیجہ سمجھنا چاہئے ۔

غرض جنگ کے خاتمہ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم طرز کی کابینہ پھر سے بحال ہوگئی ۔ جنگ کے زمانہ میں کابینہ کی تشکیل کے ضمن میں جو تجربات کئے گئے تھے وہ پُرامن زندگی کے تقاضوں کے مطابق ثابت نہیں ہوئے ۔ اس تبدیلی کی سب سے طاقتور محرک رائے عامہ تھی ۔ اور حکومت کو اس کے آگے سر جھکانا پڑا ۔ ۱۹۱۹ء میں جنگی کابینہ تو ختم ہوگئی ، لیکن کابینی سیکریٹریٹ کو جوں کا توں بحال رکھا گیا ۔ حکومت کے فرائض کی وسعتوں اور پیچیدگیوں نے سکرٹریٹ کی برقراری ناگزیر کردی تھی ۔ یہ ادارہ بہت سود مند ثابت ہوا تھا اور خود کابینہ کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں اس سے نہ صرف غیر معمولی سہولت حاصل ہوتی تھی بلکہ اس کی وجہ سے کام میں ایک باقاعدگی اور نظم و ضبط بھی پیدا ہوگیا تھا ۔ سکریٹریٹ کی برقراری کی وجہ سے کابینی جلسوں کی روئیداد (MINUTES.) کے قلمبند کرنے کا طریقہ

جاری رہا، لیکن ان کو شائع نہیں کیا جاتا تھا۔ جنگ سے پہلے کابینی رازداری پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اب وہ صورت باقی نہیں رہی۔ کابینہ میں جو کچھ بحثیں ہوتی ہیں، یا جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ان کو تو اب بھی منظرِ عام پر لانا خلافِ قاعدہ اور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ان تفصیلات سے ہٹ کر اکثر اوقات اس کے فیصلوں کا ایک مکمل خلاصہ اخباروں میں شائع کر دیا جاتا۔ عموماً ایسے بیانات کسی واقفکار یا "ترجمان" کے حوالہ سے منظرِ عام پر لائے جاتے تھے۔ سرکاری ذرائع سے ان "قیاسی" بیانات کی توثیق یا تردید نہیں کی جاتی تھی۔

سیاسی پارٹیوں کا موقف

جنگ کے بعد کے دور میں انگلستان کی سیاسی پارٹیوں کے موقف میں بڑی اہم تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ یہ زمانہ لبرل پارٹی کے لئے بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ جنگ کے خاتمہ کے فوراً بعد ۱۹۱۸ء کے اواخر میں جو انتخاب ہوا اس میں قدامت پسندوں کا پلہ بھاری رہا۔ لبرل پارٹی نسبتاً کمزور موقف کی حامل رہی۔ لیکن ان دونوں پارٹیوں نے مل کر لبرل پارٹی لیڈر لائیڈ جارج کی سرکردگی میں ایک مخلوط حکومت بنائی۔ اس کے بعد سے آج تک لبرل پارٹی کو ان کی اپنی حکومت بنانے کا کبھی موقعہ نہیں مل سکا۔ یہ قدیم سیاسی پارٹی جس کا آغاز چارلس دوم کے زمانہ سے ہوا تھا جنگِ عظیم کے بعد سے انتشار اور کمزوری کا شکار ہوگئی۔ آج تک وہ اسی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے امکانات بظاہر بہت کم نظر آتے ہیں۔ گزشتہ تیس چالیس سال سے تو اس کا حال یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں اس کے نمائندوں کی تعداد دس بارہ سے کبھی زیادہ نہیں رہی۔ گو یہ صحیح ہے کہ انتخابات میں اسے کافی بھاری ووٹ ملتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ زیادہ نشستیں حاصل نہیں کرسکتی۔ اس کی وجہ موجودہ انتخابی نظام کا نقص ہے۔ ان ہی اسباب کی بنا پر بعض سیاسی مبصرین اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ متناسب اصول رائے دہی (PROPORTIONAL REPRESENTATION) کو رائج کیا جانا چاہئے تاکہ کثیر تعداد میں ووٹ ضائع ہونے سے بچیں۔ اور ہر ووٹ کسی نہ کسی کو منتخب کرانے میں کارآمد ہوسکے۔

لبرل پارٹی کی تباہی کا سبب کچھ تو اس کا اندرونی اختلاف تھا اور کچھ لیبر پارٹی کا عروج۔ اندرونی اختلاف لائیڈ جارج کے وزیراعظم بننے کے بعد سے شروع ہوا۔ جنگ کے زمانہ میں جب لائیڈ جارج نے اپنی پہلی حکومت بنائی تو اسکویتھ اور اس کے متبعین، پارٹی سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے۔ دوسری طرف لیبر پارٹی کے عروج نے لبرل پارٹی اور اس کے نظریات کو عجب مخمصہ میں ڈال دیا۔

لبرل پارٹی کے وجود کا جواز اس کی ترقی پسندی تھی۔ لیکن لیبر جب اپنی انقلابی ترقی پسندی کو لے کر آگے بڑھے تو لبرل ترقی پسندی بازیچۂ اطفال نظر آنے لگی۔ لہٰذا قوم کے انقلاب پسند، ترقی کے دلدادہ، موجودہ سیاسی اور سماجی نظام سے برگشتہ اور باغی عناصر تمام کے تمام اس کو "طلوع صبح انقلاب" سمجھ کر اس کے پرستار اور حلقہ بگوش ہو گئے۔ لبرل پارٹی اب ایسے عناصر کے لئے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی تھی۔ یہ سب ٹوٹ ٹوٹ کر لیبر سے جا ملے۔ دوسری طرف لبرل پارٹی کے قدامت پسند عناصر لیبر کے انقلابی نظریات اور ان کی روز افزوں ہر دلعزیزی اور مقبولیت کو دیکھ کر ایسے خوفزدہ ہوئے کہ وہ قدامت پسندوں کی آغوش میں جا گرے۔ اس طرح لبرل پارٹی دونوں محاذوں پر پٹتی رہی اور اب دورِ حاضر میں اس کی حیثیت سیاسی بساط کے ایک پٹے ہوئے مہرہ کی سی ہے۔

جنگ کے بعد کے حالات نے "قدامت پسندوں" کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ 1918ء کے قانون اصلاحِ پارلیمنٹ نے حقِ رائے دہی کو اتنا عام کر دیا تھا کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس سے جمہوریت کی بنیادیں بہت مضبوط ہو گئیں۔ مالی اعتبار سے کمزور اور دبے ہوئے طبقات اور افراد بھی اب رائے دہی میں حصہ لے سکتے تھے۔ اس سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ قدامت پسندوں کے ووٹ اور ان کی مقبولیت میں شاید کچھ کمی واقع ہوگی۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کو نہ صرف کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ جنگ کے اختتام کے بعد دوسری جنگِ عظیم تک انتخابات کے نتائج ان کے لئے عموماً حوصلہ افزا رہے، بلکہ ان میں سے چند انتخابات میں انھوں نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن اس دور میں سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ لیبر پارٹی کا عروج ہے۔ 1906ء میں اس پارٹی نے دارالعوام کی تیس نشستوں پر قبضہ کیا تھا۔ یہ شاید اس

کی سب سے پہلی بڑی کامیابی تھی۔ 1910ء کے انتخاب میں انھوں نے اکتالیس نشستیں حاصل کیں۔ جنگ عظیم کے چیلنج سے نمٹنے کے لیے 1915ء میں جب مخلوط حکومت قائم ہوئی تو لیبر پارٹی کو بھی حکومت میں شریک کیا گیا۔ جنگ کے اختتام کے بعد وہ اس تحالف سے دست بردار ہوگئے اور 1918ء کے انتخاب میں انھوں نے اپنے طور پر علٰحدہ حصّہ لیا۔ اور ساٹھ نشستوں پر اپنا قبضہ جمایا۔ انتخاب کے بعد جب لبرل اور قدامت پسند پارٹیوں نے پھر مخلوط حکومت بنائی تو لیبر نے دارالعوام میں سرکاری مخالف پارٹی (OPPOSITION) کا موقف اختیار کیا۔ اس کے بعد سے ہر انتخاب میں ان کی عددی قوت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس دَور میں ہر وقت ان کو لبرل پارٹی سے زیادہ نشستیں حاصل ہوتی رہیں۔ لبرل پارٹی تیزی سے مائل بہ تنزل تھی۔ اکتوبر 1924ء کے انتخاب میں انھوں نے صرف چالیس نشستیں حاصل کیں جبکہ لیبر اسی انتخاب میں ایک سو اکاون نشستیں حاصل کر سکے۔ 1929ء میں لیبر پارٹی کی تعداد دارالعوام میں دو سو اٹھاسی ہوگئی۔ اس دَور میں غالباً یہ ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

سہ جماعتی نظام اور مخلوط حکومتیں

جنگ کے بعد پارٹیوں کے اس موقف کی وجہ سے مخلوط اور اقلیتی حکومتیں بعض اوقات ناگزیر ہوگئیں۔ ڈسمبر 1923ء کے انتخاب میں قدامت پسند 258، لبرل 159۔ اور لیبر 191 نشستیں حاصل کر سکے۔ چونکہ کسی پارٹی کو بھی کامل اکثریت حاصل نہیں تھی اس لیے جنوری 1924ء میں لیبر پارٹی نے لبرلوں کے تعاون کے ساتھ ایک اقلیتی حکومت قائم کی۔ 1929ء میں پھر یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ لبرل پارٹی کی تائید اور تعاون سے پھر لیبر حکومت قائم ہوئی۔ لیکن دونوں مرتبہ اس کی حیثیت ایک اقلیتی حکومت کی تھی۔ لیبر پارٹی کے عروج کی وجہ سے انگلستان میں سہ جماعتی فرقہ بندی کا نظام وجود میں آرہا تھا۔ اس کی وجہ سے کوئی ایک پارٹی تنہا اپنی طاقت کے بل بوتے حکومت پر قبضہ کرنے سے قاصر رہی۔ چنانچہ اس قسم کے مواقع پیش آتے رہے جن کی اُوپر مثالیں دی گئی ہیں۔ بعض سیاسی مبصّرین کے نزدیک یہ ایک صحت مندانہ رجحان ہے۔ عموماً دو جماعتی نظام میں کابینی آمریت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیبنٹ پر کسی قسم کی دستوری تحدید باقی نہیں رہتی۔

پارٹی بندی کے سخت ڈسپلن کی وجہ سے دارالعوام کے اراکین اپنے وزراء کے اشاروں پر ناچنے کے لئے مجبور رہتے ہیں۔ وہ ان کی تجاویز کی مخالفت نہیں کرسکتے، اور حکومت کو ناپسندیدہ اقدامات پر بھی شکست دینے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کا انفرادی مفاد بھی متاثر ہوسکتا ہے۔ کیبنٹ کے آمرانہ رجحانات کے اسباب پر اس سے پہلے کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ اس آمریت کا واحد علاج سہ جماعتی فرقہ بندی کا نظام اور مخلوط یا اقلیتی حکومتیں ہیں۔ اقلیتی حکومت اپنی برقراری کے لئے دوسری پارٹی کی تائید کی محتاج رہتی ہے۔ جب دو یا دو سے زیادہ پارٹیاں آپس میں مل کر حکومت بناتی ہیں تو وہ اشتراک و تعاون کا ایک اقل ترین پروگرام آپس میں قبول کرلیتی ہیں۔ ایسے میں حکومت کے لئے اس پروگرام کے مقررہ حدود سے باہر قدم رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ کابینی آمریت اکثریتی حکومتوں کا نتیجہ ہے۔ اقلیتی حکومت اس کا خواب نہیں دیکھ سکتی۔ اسے ہر وقت دیکھ دیکھ کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ دوسری پارٹی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی تجویز اس وقت تک قانون کا درجہ حاصل نہیں کرسکتی جب تک ہر موافق اور مخالف زاویہ سے اس کا جائزہ نہ لیا گیا ہو۔ اور شریک حکومت پارٹی کو بھی اس کیلئے رضامند نہ کرلیا گیا ہو۔ جمہوریت کی اس سے بہتر ضمانت کیا ہوسکتی ہے، بعض صاحب نظر اشخاص[1] نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اقلیتی حکومت ہی جمہوری حکومت کی ضامن ہے۔ کسی ایک پارٹی کے حکومت پر قابض ہونے کی وجہ سے حقیقی جمہوریت کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلّمہ ہے کہ پارلیمنٹ میں اگر کسی پارٹی کو اکثریت حاصل بھی ہو جائے تو وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ اسے ملک کے رائے دہندوں کی اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ اس وقت جو انتخابی نظام رائج ہے اس کا عموماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رائے دہندوں کی اقلیت، دارالعوام کی اکثریت کو منتخب کرسکتی ہے۔ مثال کے طور پر 1922ء میں قدامت پسندوں نے صرف 38 فیصد ووٹ کی بنا پر دارالعوام کی 344 نشستیں حاصل کرلیں۔ 1924ء میں انھوں نے صرف 47 فیصد ووٹ حاصل کیا لیکن کم و بیش 462 نشستوں پر قبضہ کرلیا جو ایوان کی جملہ تعداد کی تین چوتھائی نشستیں ہیں۔ ایسی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہ اب

---

[1] HOW BRITAIN IS GOVERNED — By RAMSAY MUIR. P. 181.

کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ رائے دہندوں کی اقلیت، پارلیمانی اکثریت کو منتخب کرسکتی ہے ایسی صورت میں کوئی ایک پارٹی حکومت پر قابض ہو تو وہ رائے دہندوں کی اقلیت کی نمائندہ ہوگی۔ اس کی حکومت، خالص جمہوری نقطۂ نظر سے ایک اقلیتی حکومت ہوگی اور وہ اپنے اقلیتی کردار کے باوجود اپنی عظیم پارلیمانی اکثریت کی بنا پر اپنے فیصلے ملک کی اکثریت پر مسلط کرنے کے قابل ہوگی۔ یہ حقیقی جمہوریت کی نفی متصور ہوگی۔

جنگ کے بعد کچھ عرصہ تک سہ جماعتی نظام کا رجحان برقرار رہا۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ہی لبرل پارٹی کے پارہ پارہ ہونے کی وجہ سے ملک میں صرف دو بڑی پارٹیاں رہ گئیں۔ ایک تو قدامت پسند اور دوسرے لیبر۔ لیبر پارٹی دوسری جنگِ عظیم کے بعد اتنی طاقتور ہوگئی کہ اس نے دوسروں کے سہارے کے بغیر صرف اپنی طاقت کے بل بوتے 1945ء میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ یہ انتخاب اس نے بھاری اکثریت سے جیتا تھا۔ لبرل پارٹی اب صرف نام کی پارٹی رہ گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے گزشتہ تیس برسوں میں وہ اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ مشکل سے دس بارہ نشستوں پر وہ اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتی ہے۔ لبرل پارٹی کی اس زبوں حالی نے سہ جماعتی نظام کی برقراری یا اس کے احیاء کے امکانات کو بہت موہوم کردیا ہے۔

1931ء کا دستوری بحران

1931ء میں کیبنٹ ایک عظیم بحران سے دوچار ہوگئی۔ اس وقت مسٹر میکڈانلڈ کی قیادت میں ایک لیبر حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ یہ کابینی بحران ایک عظیم تر مالیاتی بحران کا نتیجہ تھا۔ انگلستان اس وقت سخت معاشی مشکلات میں گھر گیا تھا۔ اس کی بین الاقوامی تجارت خسارہ میں چل رہی تھی۔ سونے کا محفوظ ذخیرہ تیزی کے ساتھ گھٹتا چلا جارہا تھا۔ اس بحران سے نمٹنے کے لئے حکومت کو اپنے خرچ پر سخت کنٹرول عاید کرنے کی ضرورت درپیش تھی۔ اس بات پر سب متفق تھے کہ معیشت کو تباہی سے بچانے کے لئے سخت کفایت شعاری کی پالیسی پر کاربند ہونا پڑے گا۔ مگر کیبنٹ اس بات پر متفق نہیں ہوسکی کہ معیشت کو قابو میں لانے کے لئے کن تجاویز پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوگا۔ ایک تجویز یہ تھی کہ منجملہ اور کفایتی اقدامات کے "بیمۂ بے روزگاری" (UNEM- -YMENT INSURANCE) کو یکلخت ختم

کردیا جائے، جس پر حکومت کثیر رقم صرف کررہی تھی۔ وزیراعظم، وزیرِ خزانہ اور ان کے دو اور ساتھی اس تجویز کے حامی تھے لیکن کیبنٹ کی اکثریت اس کی مخالفت پر تُل گئی۔ اس اختلاف نے شدید بحرانی صورت اختیار کرلی۔ ان حالات میں لیبر حکومت کے ٹوٹ جانے کا قوی احتمال پیدا ہوگیا تھا اور اس بات کا بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ دارالعوام میں لیبر پارٹی کی اکثریت بے روزگاری کے انشورنس کو ختم کرنے کی سخت مخالف ہے۔ اس اثنا میں وزیراعظم نے بادشاہ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ اور غالباً اسی کے ایما پر جارج پنجم نے مسٹر بالڈون اور مسٹر ہربرٹ سیموئل سے جو اس وقت قدامت پسند اور لبرل پارٹیوں کے علی الترتیب رہنما تھے، اس نازک صورتِ حال پر بات چیت کی۔ ان تمام مشوروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر میکڈانلڈ نے اپنی حکومت کا استعفیٰ پیش کردیا اور دوسرے روز یہ اعلان کیا گیا کہ بادشاہ کے ایما پر مسٹر میکڈانلڈ نے ایک قومی حکومت کی تشکیل کی ذمہ داری قبول کرلی ہے۔

اس کے بعد ہی بہت جلد ایک قومی حکومت مسٹر میکڈانلڈ کی سرکردگی میں تشکیل پاگئی۔ اس میں مسٹر بالڈون اور مسٹر ہربرٹ سیموئل دونوں کو شریک کیا گیا تھا۔ مجموعی حیثیت سے قدامت پسندوں کے چار اور لبرل پارٹی کے دو نمائندوں کو اس میں جگہ دی گئی تھی اور مسٹر میکڈانلڈ کے تین ساتھی بھی اس میں شریک تھے جو اس تمام قضیے میں اس کے ہم خیال تھے۔ لیبر پارٹی نے حالات میں اس اچانک تبدیلی کے بعد مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے چند گنے چنے ساتھیوں کو جن کی تعداد بارہ تیرہ سے زیادہ نہیں تھی پارٹی سے خارج کردیا پارٹی کے ایک سینئر رکن مسٹر آرتھر ہنڈرسن کو مسٹر میکڈانلڈ کی جگہ اپنا لیڈر نامزد کیا۔ اور دارالعوام میں نئی حکومت کی تشکیل کے ساتھ ہی پارٹی نے "حزبِ مخالف" کا موقف اختیار کیا۔ ان تمام واقعات نے اس وقت ایک سیاسی قضیے کی صورت اختیار کرلی۔ مسٹر میکڈانلڈ پر اپنی پارٹی سے انحراف کا الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ وزارتِ عظمیٰ کو بچانے کیلئے اس نے پارٹی بندی کے اصول اور اس کے ڈسپلن کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اور تو اور پروفیسر لاسکی نے بھی مسٹر میکڈانلڈ کے رویّہ کو مذموم اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے۔

اس سلسلہ میں بادشاہ پر بھی اعتراضات کئے گئے اور اس شبہ کا اظہار کیا جانے لگا

کہ مسٹر میکڈانلڈ کو وزیر اعظم برقرار رکھنے میں بادشاہ کا بڑا ہاتھ تھا[1]۔ ورنہ ایک ایسا شخص جس کو خود اس کی پارٹی نے اسے خارج کر دیا ہو اور جس کے ہمنواؤں کی تعداد دارالعوام میں دس بارہ سے زیادہ نہ ہو وہ کسی ایسی حکومت کا سربراہ کیسے ہو سکتا ہے جس کی برقراری کا انحصار صرف قدامت پسند اور لبرل پارٹیوں کی تائید پر مبنی ہو بقول پروفیسر لاسکی میکڈانلڈ کی وزارت " اس کے دوستوں کی بجائے اس کے مخالفین کی تائید پر قائم ہو سکی[1]"

حالیہ زمانے میں یہ ایک مسلّمہ دستور تھا کہ وزارتِ عظمیٰ صرف ایسے شخص کو سونپی جائے جو کسی پارٹی کا قائد منتخب کیا گیا ہو یا جس کی قیادت کو متعلقہ پارٹی عام طور پر تسلیم کرتی ہو۔ میکڈانلڈ نے جب اپنی حکومت تشکیل دی تو اس کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کسی پارٹی کا قائد تھا۔ لیکن اس کی تائید میں یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ ایسے بحرانی حالات میں مسٹر بالڈون اور مسٹر ہربرٹ سیموئل جو دو بڑی پارٹیوں کے لیڈر تھے اس کی قیادت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے اور شاید اس کی شخصیت کو ان بحرانی حالات سے نمٹنے کے لئے ضروری سمجھتے ہوں۔ ایسی صورت میں مسٹر میکڈانلڈ کی سرکردگی میں اس قومی حکومت کی تشکیل کو دستوری روایات کی خلاف ورزی نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہی استدلال بادشاہ کی پوزیشن کو صاف کرنے کے لئے کافی ہے۔

وزیر اعظم کیلئے دارالعوام کی رکنیت کا لزوم

بیسویں صدی کے آغاز سے یہ روایت پیدا ہو چلی تھی کہ وزیر اعظم دارالعوام سے چُنا جانا چاہئے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ عہدہ عموماً دارالامراء کے حصے میں آتا رہا لیکن اس کی آخری مثال لارڈ سالبری کی ہے۔ 1902ء میں اس کی سبکدوشی کے بعد سے کسی امیر (PEER) کو وزارتِ عظمیٰ تک پہنچنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ تک یہ روایت اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ اس سے انحراف دشوار نظر آنے لگا۔

---

[1] ۔ اس قضیہ کے لئے دیکھو THE CRISIS OF THE CONSTITUTION : 1931. P.16 BY LASKI.

1923ء میں مسٹر بونرلا (BONAR LAW) نے خرابیٔ صحت کی بنا پر وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ اس وقت اس عہدہ کے لئے موزوں ترین شخصیت لارڈ کرزن کی تھی۔ قدامت پسند پارٹی میں قابلیت، تجربہ اور وجاہت کے اعتبار سے اس کا کوئی ہمسر نہیں تھا لیکن جارج پنجم نے حکومت کی تشکیل کے لئے کرزن کو نظر انداز کرکے مسٹر بالڈون کو طلب کیا۔ یہ فیصلہ اس وقت اور بعد میں بالکل درست سمجھا گیا۔ اگرچہ اس وقت تک بالڈون کو پارٹی کا لیڈر منتخب نہیں کیا گیا تھا لیکن اس کے واضح آثار موجود تھے کہ اسی کو پارٹی اپنا لیڈر منتخب کرے گی۔ چنانچہ پارٹی کا جب اجلاس ہوا تو خود کرزن نے مسٹر بالڈون کے انتخاب کے لئے تحریک کی۔ اس موقعہ پر اپنی تقریر کے دوران میں اس نے مسٹر بالڈون کی جو خوبیاں گنوائیں اس میں خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ مسٹر بالڈون کا دارالامرا کا رکن نہ ہونا ان کے استحقاق کی اہم بنیاد ہے۔ یوں بھی اس زمانے کے حالات کے نظر کرتے وزیر اعظم کا دارالامرا میں نشست رکھنا اس کے لئے طرح طرح کی دشواریوں کا باعث بن سکتا تھا۔ نیز ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ لیبر پارٹی جو اس وقت "حزبِ مخالف" کی حیثیت رکھتی تھی اس کی کوئی نمائندگی دارالامرا میں نہیں تھی۔ اس روایت سے آج تک انحراف کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب رائے عامہ کے دباؤ کے تحت مسٹر چیمبرلین کو وزارتِ عظمیٰ سے ہٹنا پڑا تو جارج ششم کی بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا جانشین لارڈ ہیلی فاکس کو بنایا جائے جو قدامت پسند پارٹی اور حکومت کا ایک طاقتور اور قابل ممبر تھا۔ اس بارے میں جو صلاح مشورے ہوئے وہ اب منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس وقت یہ بھی کہا گیا تھا کہ لارڈ ہیلی فاکس کا دارالامرا سے متعلق ہونا اس کے وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہونے کی راہ میں حائل نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود ہیلی فاکس کو نظر انداز کرکے مسٹر چرچل کو وزیر اعظم بنایا گیا کیونکہ وہ دارالعوام کا ممبر تھا اور یوں بھی ملک میں اسے وسیع تائید حاصل تھی۔ ابھی حالیہ اور قریب تر زمانے میں جب مسٹر میکملن (MACMILLAN.) نے وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی حاصل کی تو اس عہدہ کے لئے لارڈ ہیوم (LORD HOME) کو پسند کیا گیا لیکن اس خدمت پر فائز ہونے کے لئے اس کو اپنی "موروثی امارت" (PEERAGE.) سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس سے پہلے ایک قانون پاس کیا جا چکا

تھا کہ اگر کوئی شخص دارالامراء کی رکنیت سے دست بردار ہونا چاہے تو وہ اس قانون کے تحت ایسا کرسکتا ہے۔ چنانچہ لارڈ ہیوم نے امارت کے رتبہ کو خیرباد کہہ کر دارالامراء کی ممبرشپ سے خلاصی حاصل کی۔ اور مسٹر الگز نڈر ڈگلس ہیوم کے نام سے وزیراعظم ہوا۔ اس قانون کے پاس ہونے سے پہلے کوئی شخص دارالامراء کی ممبرشپ سے نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ جس کو امارت ارثاً مل جاتی وہ ہمیشہ کے لئے امیر رہتا۔ اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔ دارالامراء کی حد تک یہ ایک اہم دستوری تبدیلی ہے۔ غرض اس بات میں اب کوئی شک و شبہ نہیں کہ وزیراعظم لازماً دارالعوام کا ممبر ہوا کرے۔

بائیسواں باب

دستور کے جدید رُجحانات

(ا) مفوّضہ قانون سازی اور انتظامی دادرسی، نیم آزاد حکومتی ادارے

(ب) دولتِ مُشترکہ، قانون ۱931ء سے پہلے اور بعد

(ا)

فلاحی مملکت کا تصوّر

پچھلی صدیوں میں مملکت کی ذمہ داریاں محدود اور گنے چُنے فرائض پر مبنی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زندگی کے مسائل نہ تو ایسے پُرپیچ تھے، اور نہ ان میں زمانۂ حال کی سی گھما گھمی پائی جاتی تھی۔ موجودہ دَور میں سماج صنعتی ترقی کی وجہ سے گوناگوں پیچیدگیوں کا حامل ہوگیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تضاد اور تصادم کے امکانات زیادہ وسیع ہوگئے۔ ان سب متضاد اور متصادم مفادات کو ان کے اپنے دائروں میں محدود رکھنا اور ان سب کو قومی اور اجتماعی بھلائی کے لئے ترقی کے راستے پر لگائے رکھنا مملکت کا ایک اہم فریضہ بن گیا۔ پچھلے زمانے میں ایک سادے سیدھے سماج کے لئے قانون سازی کا عمل کچھ ایسا دشوار نہیں تھا۔ مملکت کی اہم ترین ذمہ داری امن وضبط کی برقراری تک محدود تھی۔ وہ زیادہ تر پولیس کے فرائض انجام دیتی تھی، اسے عوامی زندگی کی صلاح وفلاح سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ "فلاحی مملکت" کا تصوّر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسے کمزور طبقات کی فلاح وبہبود کا ضامن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ "انفرادیت" کا ایسا زور تھا کہ معاشی سرگرمیوں میں حکومت کی مداخلت کو فرد کی آزادی کے اصول کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے اواخر سے "عدم مداخلت" (LAISSEZ – FAIRE.) کے نظریہ کو خیرباد کہا گیا۔ کیونکہ اس عرصہ میں صنعتی ترقی کی وجہ سے بعض ایسی سماجی خرابیاں پیدا ہوگئیں جو مملکت کی مداخلت کے بغیر دُور نہیں کی جاسکتی تھیں۔

اب "عدم مداخلت" کی بجائے "اجتماعیت" (COLLECTIVISM.) کے نظریہ پر زور دیا جانے لگا۔ انفرادی آزادی کے تصور نے جو پھل دیا تھا وہ سب کے سامنے تھا۔ سماج کی بہت سی گھناونی بیماریاں اسی نظریہ کی آڑ میں نشوونما پائی تھیں۔ اس لئے اب یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ تھوڑی سے انفرادی آزادی کو بھینٹ چڑھا کر ایسا مداوا دریافت کیا جائے جس سے سماجی جسد کے یہ ناسور دُور ہو سکیں۔ دوسرے الفاظ میں مملکت پر یہ لازم گردانا جاتا تھا کہ ضروری اور مناسب قانون سازی کے ذریعہ سے قوم کے زیادہ سے زیادہ طبقات کی فلاح کا تحفظ کیا جائے اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں محض "انفرادی آزادی" کے کھوکھلے تصور کو سنگِ راہ سمجھ کر اس سے دست کشی اختیار نہ کی جائے۔ سماج کے ان بدلتے ہوئے رجحانات نے مملکت کی ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ زندگی کا اب کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں اس کی مداخلت ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس مداخلت کے بغیر موجودہ زندگی کا پیچیدہ نظام شاید ہی بغیر مضرت کے چل سکے۔ مملکت کی ان بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں سے نمٹنے کے لئے وسیع پیمانہ پر قانون سازی کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ پارلیمنٹ پر اس کی وجہ سے کام کا اتنا بوجھ پڑنے لگا کہ وہ اس سے سر بر ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ ان حالات میں پارلیمنٹ نے اپنے اختیاراتِ قانون سازی عاملہ کو سپرد کرنے شروع کئے۔ اس کو "مفوضہ قانون سازی" کہتے ہیں۔

مفوضہ قانون سازی

مفوضہ قانون سازی کوئی نئی یا انوکھی چیز نہیں۔ پچھلے زمانوں میں بھی اس کی نظیریں ملتی ہیں۔ ٹیوڈر زمانے میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ خصوصاً ہنری ہشتم کے زمانے میں پارلیمنٹ نے کئی مرتبہ قانون سازی کا اختیار عاملہ کو سونپا۔ اٹھارویں صدی میں بھی اس طریقہ سے کام لیا گیا۔ پارلیمنٹ ذیلی قانون سازی کا اختیار کبھی بادشاہ کو، کبھی پریوی کونسل کو، اور کبھی کسی وزیر کے سپرد کرتی ہے۔ اختیارات چاہے کسی کو بھی دیئے جائیں، ان کا استعمال عموماً وزراء ہی کرتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر سے اس قسم کی قانون سازی میں بہت اضافہ ہوا۔ 1893ء سے ان ذیلی قوانین کو شائع بھی کیا جانے لگا۔ یہ قوانین، قواعد، "احکام" اور "ضابطوں" (REGULATIONS.) کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

پارلیمنٹ قانون کا ایک خاکہ منظور کر دیتی ہے اور وزیر متعلقہ کو اس قانون کے چوکھٹے میں تفصیلی قانون سازی کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ذیلی قوانین تعداد میں اصل قوانین سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 28-1926ء کے درمیان پارلیمنٹ نے ایک سال میں اوسطاً پچاس قوانین منظور کئے، لیکن اسی مدت میں ضوابط، قواعد اور احکام کی تعداد چودہ سو تھی۔ یہ قواعد اور ضوابط اصل قوانین کا تکملہ اور تتمہ ہوتے ہیں۔ ان کو سامنے رکھے بغیر پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کو سمجھنا دشوار ہوگا۔ مفوضہ قانون سازی کے ذریعہ سے ہی اصلی قوانین کی توضیح و تشریح ہوتی ہے۔ ورنہ وہ فی نفسہٖ غیر مکمل اور تشنہ رہتے ہیں۔ اصل قوانین کو ہڈیوں کا ڈھانچہ سمجھنا چاہئے۔ مفوضہ قانون سازی کے ذریعہ سے اس ڈھانچہ کو گوشت پوست فراہم کیا جاتا ہے۔

مفوضہ قانون سازی کے بارے میں اس نکتہ کو نہیں بھولنا چاہئے کہ عدالتیں اس میں مداخلت کر سکتی ہیں، اور ان کی جانچ پڑتال کی مجاز ہیں۔ انگلستان کے دستور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پارلیمنٹ کا قانونی اقتدارِ اعلیٰ غیر محدود ہے۔ اس لئے پارلیمنٹ جو قانون بناتی ہے اس کو عدالتیں مسترد نہیں کر سکتیں۔ انگلستان میں عدلیہ، پارلیمنٹ کے وضع کردہ قانون کو ناجائز یا خلافِ دستور نہیں قرار دے سکتا۔ برخلاف اس کے ایسے قواعد و ضوابط جو مفوضہ اختیارات کے تحت بنائے جاتے ہیں انھیں عدالتیں مسترد کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ یہ محسوس کریں کہ ان کے وضع کرنے میں پارلیمنٹ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا گیا ہے۔ ایسے قوانین کو غیر مجاز (ULTRA VIRES) قرار دیا جا سکتا ہے۔

مفوضہ قانون سازی کی دو شکلیں

تفویضِ اختیارات کی عموماً دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جس میں پارلیمنٹ معین اور واضح حدود کے اندر عاملہ کو اختیار سپرد کرتی ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں ہوتا اور اس بات کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ کسی پارلیمانی قانون کی ترمیم ٹیکس کا عاید کرنا یا کسی اصولی مسئلہ سے متعلق قانون بنانا، ان اختیاراتِ مفوضہ کی دسترس سے باہر ہوگا اور یہ کہ "مفوضہ قوانین" کسی صورت میں بھی ان حدود کو توڑ نہ سکیں گے۔ اگر پارلیمنٹ ہمیشہ

ان واضح تحدیدات کے ساتھ اختیارات سونپتی تو کوئی بات تشویش کی نہ ہوتی مگر عموماً ایسا نہیں کیا گیا۔ تفویضِ اختیارات کی ایک اور شکل بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس میں پارلیمنٹ غیر معمولی اختیارات عاملہ کو سونپ دیتی ہے۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ اس سے فرد کی آزادی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ اصل قانون مبہم اور غیر واضح ہوتا ہے اس لئے عدالتیں پارلیمنٹ کے حقیقی منشار کے سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے مفوضہ قانون سازی پر ان کا کنٹرول نسبتاً کمزور ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو یہاں تک کیا گیا ہے کہ خود پارلیمنٹ ایسے فقرے اصل قانون میں شریک کر دیتی ہے کہ جن کا مقصد عدالتوں کو ذیلی قوانین کی جانچ سے باز رکھنے کا معلوم ہوتا ہے۔

غیر معمولی اختیارات کا سونپا جانا

پارلیمنٹ نے جو غیر معمولی اختیارات عاملہ کو وقتاً فوقتاً بخشے ہیں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔ 1932ء میں "قانون محصول درآمد" جب پاس کیا گیا تو اس میں محکمۂ خزانہ کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ پارلیمنٹ نے اس محصول کی جو شرح مقرر کی ہے اس میں محکمۂ مذکور حسب ضرورت اضافہ کر سکتا ہے۔ اس اضافہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ محصول اندازی سے متعلق عاملہ کو ایسے اختیارات کے عطا کئے جانے کی یہ ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر نہیں ملتی ٹیکس کا عاید کرنا ہمیشہ سے پارلیمنٹ کا الیاحق سمجھا جاتا تھا جس کی بڑی سختی سے نگرانی اور نگہداشت کی جاتی تھی۔ اس میں حکومت کی مداخلت کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اب پارلیمنٹ خود اس اختیار کو عاملہ کے حوالہ کرنے میں کوئی پس و پیش محسوس نہیں کرتی۔ بعض قوانین میں تفویضِ اختیارات کے ضمن میں پارلیمنٹ بعض ایسی دفعات رکھ دیتی ہے جو "فرمانِ نادری" کا حکم رکھتی ہیں۔ ایسی دفعات کو "ہنری ہشتمی[1] دفعہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے متعلقہ وزیر یا محکمہ کو ذیلی قانون کے بنانے میں عملاً ایک غیر محدود اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ وزیر کو اس بات کا اختیار دے دیا جاتا ہے کہ اگر اس قانون کی عمل آوری میں کچھ دشواریاں پیش آئیں تو وہ اپنے اختیارِ تمیزی سے اصل قانون میں رد و بدل کرنے کا مجاز ہوگا۔ اور ایسا رد و بدل کسی صورت میں بھی خلافِ قانون یا غیر مجاز متصور نہ ہوگا۔ اس قسم کی دفعات کو قانون میں شامل

[1] ہنری ہشتم کی مطلق العنانی کے مدنظر یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

کرنے سے پارلیمنٹ کا یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ عدالتیں ذیلی یا مفوضہ قانون کو ناجائز قرار نہ دے سکیں۔ 1925ء کے قانون "تعین مالیت و تشخیص محصول" میں (RATING & VALUATION ACT, 1925) اسی نوع کا ایک فقرہ شامل کر دیا گیا تھا۔ ایسے نادری اختیارات اگر وزراء کو دے دیئے جائیں تو ظاہر ہے کہ اس سے انفرادی حقوق پر مضر اثرات کے مترتب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔

بعض اوقات وزراء کو جب مفوضہ قوانین کے بنانے کا اختیار دیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہ وضاحت کر دی جاتی ہے کہ وزیرِ متعلقہ اس قانون کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو بھی قواعد و ضوابط مرتب کرے ان کی حیثیت بالکل پارلیمنٹ کے وضع کردہ قانون کی ہوگی۔ چنانچہ 1927ء میں "قانونِ غرباء" (POOR LAW ACT, 1927) میں یہ صراحت کر دی گئی تھی کہ وزیرِ صحت اس قانون کے تحت جو بھی ذیلی قانون سازی کرے وہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کا درجہ رکھے گی۔ اس کا مقصد صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عدالتیں اس قبیل کے مفوضہ قوانین میں مداخلت نہ کر سکیں۔ یہ رجحان بعض مبصرین کے نزدیک جمہوری اقدار کے منافی ہے اور وہ اس کو غارت گرِ جمہوریت سمجھتے ہیں۔

چیف جسٹس لارڈ ہیوارٹ کی تنقید

اس سلسلہ میں انگلستان کے چیف جسٹس لارڈ ہیوارٹ (. LORD HEWART) نے اپنی مشہور کتاب "آمریتِ جدیدہ" (THE NEW DESPOTISM) میں اس نوع کی قانون سازی پر سخت اعتراضات کئے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ رجحان جمہوری طرزِ حکومت کے لئے تباہ کن ہوگا۔ قانون سازی کا اختیار مقننہ کے ہاتھ سے نکل کر عاملہ کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور اس سے جمہوریت کا وہ اہم تحفظ ختم ہو جائے گا جو صرف قانون کی حکمرانی (. RULE OF LAW) کے بنیادی اصول پر عمل پیرا ہونے سے برقرار رہ سکتا ہے۔ انگلستان قانون کی حکمرانی پر ہمیشہ نازاں رہا۔ اب اس کی یہ خصوصیت ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق بعض گوشوں میں یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ پارلیمانی اور جمہوری ادارے ناکام ہو چکے ہیں۔ اب ایسے حکام کی ضرورت ہے جو فنی اہلیت رکھتے ہوں اور یہ کہ جب تک حاکم مخلص اور فیض رساں ہو اس کو آمرانہ اختیارات کے سپرد کرنے میں

کوئی تامّل نہ ہونا چاہئے ۔ لارڈ ہیوارٹ کی جب یہ کتاب چھپی تو ملک میں یہ مسئلہ خاص طور پر موضوع بحث بن گیا ۔ حکومت نے بھی ان مسائل کا جائزہ لینے کے لئے ایک "وزارتی کمیٹی" ۱۹۲۹ء میں قائم کی ۔

اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں صاف طور پر اعلان کیا کہ چیف جسٹس نے جن خطرات کا اظہار کیا ہے وہ بے بنیاد ہیں اور اس کے خیالات زیادہ تر مبالغہ آمیزی پر مبنی ہیں ۔ اور یہ کہ " مفوضہ قانون سازی " اور " انتظامیہ " کو عدالتی اختیارات کا سونپا جانا موجودہ حالات میں ایک امر ناگزیر ہے ۔ اس سے روگردانی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ۔ البتہ کمیٹی نے اس بات پر زور دیا کہ ہر ایسے قانون میں جو مفوضہ قانون سازی کا اختیار بخشتا ہے ، پارلیمنٹ غیر مبہم اور واضح تحفظات کے اندراج کا پورا اہتمام کرے ۔ اگر یہ احتیاط برتی جائے تو اس ضمن میں جو خرابیاں پیدا ہوتی رہی ہیں ان کا انسداد ہو جائے گا ۔

مفوضہ قانون سازی کا ناگزیر ہونا

مفوضہ قانون سازی کو اب بہت سی وجوہات کی بنا پر ناگزیر سمجھا جاتا ہے ۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے سامنے قانون سازی کا اتنا وسیع پروگرام ہوتا ہے کہ اس کو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی وقت میسر نہیں آتا ۔ اسی لئے پارلیمنٹ قانون کا صرف ایک خاکہ منظور کر کے تفصیلی قانون سازی کا کام انتظامیہ یا عاملہ کے سپرد کرتی ہے ۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آج کل قانون سازی کے ضمن میں بہت سے فنی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ عام طور پر پارلیمنٹ کے ارکین اس فنی مہارت کے حامل نہیں ہوتے ۔ لہٰذا پارلیمنٹ قانون کا ایک چوکھٹا تیار کر کے باقی فنی اور ماہرانہ تفصیلات کی تکمیل کا کام محکمۂ متعلقہ کے ماہرین کے سپرد کر سکتی ہے ۔ اس سے قوانین کی حقیقی غرض و غایت پوری ہو سکے گی ۔ اور پارلیمنٹ شاید اس نوعیت کے قوانین اس طرح پاس نہ کر سکے گی کہ وہ عیب سے پاک ہوں ۔

پارلیمنٹ ہر وقت نشست نہیں کرتی ۔ بسا اوقات وہ چھٹیوں پر ہوتی ہے یا کسی اور وجہ سے اس کے اجلاس بند رہتے ہیں ۔ ایسی صورت میں اگر اچانک قانون کی ضرورت لاحق ہو یا کوئی مفاجاتی حالات پیش آ جائیں تو سوائے اس کے کیا چارہ کار ہے کہ پارلیمنٹ کا

رغیر موجودگی میں عاملہ ضروری قانون سازی کا کام انجام دے۔ نیز یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پارلیمنٹ قانون کے وضع کرنے میں اپنے مقررہ طریقۂ عمل کی وجہ سے کافی وقت لیتی ہے۔ بعض اوقات فوری قانون سازی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان حالات میں یہ کام صرف عاملہ ہی بطریق احسن انجام دے سکتی ہے۔ غرض ان اسباب کی بنا پر اگر مفوضہ قانون سازی ایک بُرائی ہے تو اسے ناگزیر برائی سمجھنا چاہئے۔ اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ اس طریقہ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ایسے قوانین بے حد لچکدار اور آسانی سے ترمیم پذیر ہوتے ہیں۔

وزارتی کمیٹی کی سفارشات

وزارتی کمیٹی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان وجوہات کی بنا پر مفوضہ قانون سازی کو ضروری تو سمجھتی ہے لیکن اس نے چند تحفظات اور احتیاطی تدابیر کی سفارشات کی ہیں اس کی تجاویز یہ ہیں کہ جو بھی اختیارات وزراء کو سونپے جائیں ان کی حدبندی واضح اور غیر مبہم ہو اور ان کا دائرۂ عمل ایسا معین کیا جائے کہ وہ ہر قسم کے اشتباہ سے بالاتر ہو۔ قوانین میں ایسے نامردی فقرے" شریک نہ کئے جائیں جنھیں" ہنری ہشتم دفعات" کا نام دیا جاتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مفوضہ قوانین کو عدالتوں کی جانچ پڑتال سے بالاتر رکھنے کی ہرگز کوشش نہ کی جائے۔ ایسے کوئی فقرے اصل قانون میں درج نہ کئے جائیں جن سے عدالتوں کا حق نگرانی ساقط ہو جائے۔

"قانون اشاعت قواعد وضوابط (RULES PUBLICATION ACT, 1893) بابتہ سنہ 1893ء میں مناسب ترمیمات کی جائیں۔ اس طرح سے کہ ایسے تمام مفوضہ قوانین جن کی پارلیمنٹ میں پیش کشی کا لزوم ہے نفاذ سے پہلے کافی استقدامی نشر و اشاعت پا سکیں۔ اس سے مجوزہ قوانین کے بارے میں قبل از قبل رائے عامہ کا ردعمل معلوم ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ متعلقہ افراد و طبقات کو جن پر یہ مجوزہ قانون اثر انداز ہو سکتا ہے اس بات کا موقع ملے گا کہ وہ ان میں مناسب ترمیمات کی سفارش اور رہبری کریں۔ پارلیمنٹ کے ہر سیشن کے آغاز کے موقعہ پر دونوں ایوانوں میں الگ الگ ایک اسٹانڈنگ کمیٹی قائم کی جائے۔ اس کا کام " مفوضہ قانون سازی" کی جملہ تجاویز کا جائزہ لینا ہوگا۔ وہ ایسی مجوزہ قانون سازی کے حسن و قبح کی جانچ نہیں کرے گی بلکہ صرف یہ دیکھے گی کہ مسودہ کو جس طرح مرتب کیا گیا ہے،

اس میں ایسے نقائص تو نہیں ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ ان میں کوئی ایسی دفعات یا ایسے فقرے تو درج نہیں ہیں جن سے عدالتوں کا حق نگرانی اور حق سماعت متاثر ہو سکتا ہے۔

عاملہ اور عدالتی اختیارات (ADMINISTRATIVE JUSTICE.)

زمانۂ حال کے دستوری رجحانات میں ایک نیا رجحان عاملہ کو دادرسی کے اختیارات کا سونپا جانا ہے۔ جن حالات و اسباب میں مفوضہ قانون سازی کی ضرورت لاحق ہوئی وہی " انتظامی دادرسی " (ADMINISTRATIVE JUSTICE.) کے بھی موجب ہوئے۔ انگلستان میں ہمیشہ انصاف رسانی اور دادرسی کا کام صرف عدلیہ انجام دیتا تھا۔ عدلیہ کو اس بنا پر کہ وہ انفرادی آزادی کا محافظ ہے عاملہ کے اثر و نفوذ سے محفوظ رکھنے کے لئے انگریزوں نے کیا کیا جدوجہد نہیں کی اور کیسے کیسے جتن نہ کئے۔ عدلیہ کو انھوں نے ہمیشہ عاملہ سے جُدا رکھا۔ فرانس اور بعض دوسرے ممالک کی طرح یہاں کبھی " انتظامی عدالتوں ADMINISTRATIVE COURTS.) کا قیام عمل میں نہیں آیا۔ ایسے مقدمات بھی ہمیشہ عام عدالتوں میں فیصل ہوتے تھے جن میں حکومت کے عہدہ دار فریق کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعض براعظمی ممالک میں دوہرا عدالتی نظام پایا جاتا ہے، ایک تو عام عدالتیں، دوسرے انتظامی عدالتیں۔ انتظامی عدالتوں کا طریقۂ کار اور ان کے قواعد وضوابط عام عدالتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ انگلستان میں عدلیہ سے متعلق اس قسم کا رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ایسے کسی نظریہ کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ لیکن انیسویں صدی کے اواخر سے حکومت کے فرائض کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ لامحالہ مفوضہ قانون سازی کی طرح " انتظامی دادرسی " کے لئے گنجائش پیدا کرنی پڑی۔ سماج کی حالت کے بہتر بنانے کے لئے مملکت کو وسیع پیمانے پر فلاحی قوانین بنانے پڑے۔ فلاحی خدمات کے انتظام میں فرد پر متعدد پابندیاں عاید کی جاتی ہیں۔ اس سے فرد کا دائرۂ عمل تنگ ہونے لگتا ہے۔ حکومت اور فرد کے تعلقات کا بعض جدید بنیادوں پر تعین عمل میں آتا ہے۔ اس سلسلہ میں دونوں کے حدود و عمل میں تصادم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس تصادم کو دُور کرنے کے لئے کسی ایسی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے جو بہ عجلت ممکنہ اس نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ کر سکے۔ " انتظامی دادرسی " اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے وجود میں آئی۔

انتظامی دادرسی کی ضرورت

پارلیمنٹ نے 1870ء کے بعد سے سماجی فلاح کے قوانین پر عمل آوری کے ضمن میں عاملہ کو انفصالِ مقدمات کا اختیار دینا شروع کیا۔ یہ اختیار صرف ان مقدمات میں دیا جاتا ہے جس میں کسی شہری کے مقابلہ میں حکومت یا حکومت کا کوئی محکمہ یا اس کا قائم کردہ کوئی ادارہ فریق کی حیثیت رکھتا ہو۔ ان قوانین کے تحت عاملانہ ادارے، یا بعض اوقات عاملہ کے عہدہ دار دادرسی کے فرائض کی انجام دہی کے حامل ہوگئے۔ چونکہ تمام انتظامی دادرسی کا نظام موقتی ضروریات کی تکمیل اور مشکلات کے فوری حل کے لئے وجود میں لایا گیا تھا اس لئے اس کے ارتقاء میں نہ تو کوئی یکسانیت پائی جاتی ہے اور نہ کسی معین دستوری اصول یا ضابطہ کی پابندی نظر آتی ہے۔ پارلیمنٹ نے عاملہ کو ان اختیارات کے سپرد کرنے میں کسی خاص احتیاط کو بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ اکثر قوانین ایسے بنائے گئے جن میں عاملہ کے فیصلوں کو قطعی اور مختتم قرار دے کر عدلیہ کا حق نگرانی اور مرافعہ بھی ساقط کردیا گیا۔

خصوصاً جنگ کے زمانے میں "انتظامی دادرسی" کو بہت وسعت دی گئی۔ دادرسی کے اختیارات، پارلیمنٹ کبھی کسی وزیر کو، کبھی کسی محکمہ کو اور کبھی کسی ایسے عاملانہ ادارے کو سپرد کرتی رہی ہے جو حکومت کا قائم کردہ ہو۔ انگلستان میں عام طور پر جیسا کہ بتایا جاچکا ہے فرانس کی طرح کبھی "عاملانہ عدالتوں" کا نظام ترویج نہیں پاسکا۔ یہاں شہری اور حکومت کے کسی عہدہ دار کے مابین مقدمہ کی سماعت بھی عام عدالتوں میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب اس قسم کے مقدمات کے لئے پارلیمنٹ نے انتظامی ٹرابیونل (ADMINISTRATIVE TRIBUNALS) قائم کرنے شروع کئے ہیں یا پھر مختلف قسم کے عہدہ داروں کو انفصالِ مقدمات کا اختیار دے دیا ہے۔ یہ ادارے دادرسی کا کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن ان کا طریقۂ کار، عام عدالتوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور یہ کہ ان کو انگلستان کے نظام عدلیہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عدالتوں میں انفصالِ مقدمات کا جو کام ہوتا ہے، اس میں بعض خاص معیارات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ سب سے پہلی شرط اس ضمن میں یہ ہے کہ عدالت کے حکام قانونی تعلیم و تربیت سے بہرہ مند ہوں۔ نیز یہ کہ حاکمِ عدالت

بالکل آزاد ہو۔ اس پر کسی بیرونی دباؤ یا اثر کا شائبہ نہ ہو۔ دونوں فریق کو حقِ شنوائی حاصل رہے۔ تمام کاروائی عدالت کے کھلے اجلاس میں ہر دو فریق کی موجودگی میں انجام پائے۔ گواہوں پر جرح کا حق حاصل رہے اور فیصلہ کنندہ حاکم کی شخصیت پس پردہ مستور نہ رہے بلکہ جانی پہچانی ہو۔

انتظامی ٹرابیونلس کا طریقۂ کار

برخلاف اس کے پارلیمنٹ نے جہاں جہاں انفصالِ مقدمات کا اختیار وزراء یا عاملانہ عہدہ داروں کے سپرد کیا ہے اس میں متذکرہ صدر معیارات کے ملحوظ رکھنے کا کوئی لزوم نہیں رکھا۔ انتظامی ٹرابیونلس عام عدالتوں کی طرح کام انجام نہیں دیتیں یا اگر وزراء یا دیگر عہدہ دار حاکم مجاز بنائے گئے ہوں تو وہ مقدمات کی سماعت میں ان بیان کردہ اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھتے اور عام خیال یہ ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس خیال کو دارالامراء کے ایک فیصلہ سے بڑی تقویت پہنچی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دارالامراء پارلیمنٹ کا ایک ایوان ہوتے ہوئے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت بھی ہے۔ اس نے صاف طور پر کہا ہے کہ انتظامی ٹرابیونلس یا اس قسم کے اداروں کے لئے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ وہ انفصالِ مقدمات میں عدالتی طریقۂ کار اور ان کے قواعد و ضوابط کی پیروی کریں۔

وزارتی کمیٹی کی سفارشات، انتظامی دادرسی کے بارے میں

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ انتظامی دادرسی کے کام میں کوئی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ لیکن چند باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ مقدمات کی کارروائیاں کھلے اجلاس میں انجام نہیں پاتیں۔ جو فیصلے صادر کئے جاتے ہیں ان کی وجوہات کو ظاہر نہیں کیا جاتا اور نہ ان فیصلوں کی اشاعت کا کوئی انتظام کیا جاتا ہے۔ اور اس بات کا شبہ رہ جاتا ہے کہ فریق کے ساتھ شاید صحیح انصاف نہیں کیا گیا۔ حالیہ زمانہ میں انتظامی دادرسی کی وسعت اور بعض اس کی خامیوں کی وجہ سے اس پر مختلف گوشوں سے سخت اعتراضات کئے جانے لگے۔ خصوصاً اس لئے کہ اس سے قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW.) کے تصور کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے۔ اور یہ وہ تصور ہے، نہیں، بلکہ وہ طرزِ حیات ہے جس پر

انگلستان ہمیشہ نازاں رہا ۔ لارڈ ہیوارٹ (LORD HEWART ـــ) نے "مفوضہ قانون سازی" کے ساتھ ساتھ "اس انتظامی دادرسی" پر بھی خوب دل کھول کر حملے کئے تھے ۔ انتظامی دادرسی" کو اس نے "انتظامی لاقانونیت" کا نام دیا ۔ حکومت نے ان اعتراضات کی بنا پر ایک "وزارتی کمیٹی" اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لئے قائم کی جس کا اوپر ذکر کر دیا گیا ۔ اس کمیٹی نے "انتظامی دادرسی" کو بھی ناگزیر قرار دیا ، البتہ اس سلسلہ میں بعض اصلاحات کی سفارشات پیش کیں ۔ ان سفارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ وزرا یا وزارتی اور انتظامی ٹرابیونلس جب کبھی کوئی فیصلہ صادر کریں تو اس فیصلہ کے مدلل اسباب و وجوہ سے فریقِ متعلقہ کو آگاہ کیا جائے ۔ اہم مقدمات میں جو فیصلے کئے جائیں ان کے خلاصوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا جائے ۔ مقدمہ کے قانونی نکات پر فریقِ متعلقہ کو اپیل کا حق حاصل رہے ۔ اور یہ کہ ہائی کورٹ اس بات کا نگراں رہے کہ وزرا یا وزارتی ٹرابیونلس اپنے اختیاراتِ حاصلہ کی حدود سے باہر قدم نہ رکھیں ۔ اس قسم کے انحراف کی سختی سے روک تھام کی جائے ۔

فرانک کمیٹی کی سفارشات 1957ء

مذکرہ صدر وزارتی کمیٹی کی یہ سفارشات 1932ء میں پیش کی گئیں جن کو حکومت نے قبول کر لیا تھا ۔ لیکن 1957ء تک مختلف قوانین کے ذریعہ سے انتظامی دادرسی کو اور زیادہ وسعت دی گئی ۔ اور بہت سی انتظامی ٹرابیونلس قائم کی گئیں ۔ ان کے اختیارات میں بھی اضافہ کیا گیا اور ان ٹرابیونلس کی حیثیت اور مرتبہ کو بھی بلند کیا گیا ۔ اس سے سماجی زندگی کے مختلف اور متعدد پہلو اور سرگرمیاں ان "انتظامی عدالتوں" کے زیرِ نگرانی آنے لگیں ۔ ان حالات میں پھر یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ان اداروں کے طریقۂ کار کو شکوک و شبہات سے بالاتر رکھنے کے لئے ان کے لئے کوئی مکمل لائحہ عمل مرتب کیا جائے ۔ یہ کام "فرانک کمیٹی" کے سپرد کیا گیا ۔ سر آلیور فرانک کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا ۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ اور سفارشات 1957ء میں پیش کیں ۔ ان سفارشات میں کہا گیا ہے کہ انتظامی ٹرابیونلس کے صدور (CHAIRMEN ـــ) کا تقرر بالالتزام لارڈ چانسلر کیا کرے ۔ اس میں کسی دوسرے وزیر کا کوئی دخل نہ ہو ۔ ٹرابیونلس کی کارروائیاں

کھلے اجلاس میں ہوا کریں۔ جس کسی شہری کے خلاف کوئی مقدمہ دائر کیا جائے اس کو مقدمہ کی نوعیت سے بر وقت لازمی طور سے آگاہ کیا جائے۔ تمام متعلقہ شہادت کے ساتھ مقدمہ کی روئیداد تیار کی جائے۔ فریقِ مقدمہ کو فیصلہ کے اسباب و وجوہ سے واقف کرایا جائے اگر کوئی وزیر فیصلہ کنندہ حاکم کی حیثیت رکھتا ہو تو وہ اپنے فیصلہ کے مدلّل وجوہ کا اظہار کرے۔ ان فیصلوں کے خلاف عام عدالتوں میں فریق کو مرافعہ کا حق حاصل رہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مقدمہ میں کچھ قانونی نکات توضیح طلب ہوں۔ حتی الامکان وزرار کو مقدمات کے فیصل کرنے کا سوائے غیر معمولی اور استثنائی صورتوں کے حق نہ دیا جائے۔ اور یہ کہ وزرار کے بجائے یہ کام ٹرابیونلس کے سپرد کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "انتظامی دادرسی" موجودہ پیچیدہ سماجی زندگی کی ایک اٹل ضرورت بن گئی ہے۔ اس سے کوئی مفر نظر نہیں آتا۔ انگلستان میں اس کے خلاف ہمیشہ جو بدظنی پائی جاتی تھی وہ اب رفتہ رفتہ دور ہوتی نظر آتی ہے۔ اس سے چھٹکارا تو ممکن نہیں اس لئے اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کو نقائص اور خامیوں سے پاک رکھا جائے۔

نیم آزاد حکومتی ادارے QUASI GOVERNMENTAL BODIES

جن سماجی اور معاشی اسباب کی بنا پر "مفوضہ قانون سازی" اور "انتظامی دادرسی" کو معرضِ وجود میں لایا گیا وہی نظم ونسق اور حکومت کی مشینری میں بعض انقلابی تبدیلیوں کا باعث ہوئے۔ بیسوی صدی کے ربع اول تک بھی حکومت کا ڈھانچہ عام طور پر دو بڑی شقوں پر منقسم تھا۔ ایک مرکزی حکومت، دوسرے مقامی حکومت۔ نظم ونسق کے ان دو دائرو کے باہر بلاشبہ بعض ایسے بااختیار اور خود مختار اجساد (AUTONOMOUS BODIES) یا اتھارٹیز (AUTHORITIES) بھی ہوا کرتی تھیں، جو کسی جامع قانون کے تحت بعض مخصوص انتظامی اغراض کے لئے وجود میں لائی گئی ہوں۔ یہ ادارے راست نہ تو مرکزی حکومت کے ماتحت ہوتے اور نہ مقامی حکومت کے۔ بلکہ قانوناً انھیں ایک نیم آزادانہ اندرونی خود اختیاری حاصل رہتی۔ اس قسم کے بااختیار ادارے پچھلی صدیوں میں بھی کوئی انوکھی چیز نہیں تھے۔ اور نہ ہی ان کو صرف بیسویں صدی کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔ اٹھارویں صدی میں اس قسم کے متعدد بورڈس اور ادارے پائے جاتے تھے اگلی صدی میں 1834ء کے قانونِ مفلسان

(POOR LAW ACT _ 1934) کے تحت جو ذی اختیار باڈی قائم کی گئی تھی وہ اس نوع کے نیم آزاد اداروں کی ایک اچھی مثال ہے۔ لیکن اس دور میں ان اداروں کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی کہ وہ جلد یا بدیر رفتہ رفتہ دستور کے کسی مسلّمہ دائرہ اقتدار، مرکزی یا مقامی حکومت سے وابستہ ہوکر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے اس میں جذب ہوجاتے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر ان کی علٰحدہ، جداگانہ اور غیر معمولی حیثیت ختم ہوجاتی اور ان کا دستوری مشینری میں کامل انجذاب عمل میں آجاتا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سماجی فلاح کے بے شمار اور اَن گنت مسائل کے حل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت داعی ہوئی کہ ایسی ذی اختیار اتھارٹیز وجود میں لائی جائیں جو نظم ونسق کے عام ڈھانچے سے علٰحدہ رہ کر اپنے مفوضہ فرائض تیزی اور اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ انجام دیں۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے بے شمار عارضی بورڈس اور شخصی CORPO-RATION وجود میں آنے لگے۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ محسوس کیا گیا کہ یہ با اختیار اجساد نظم ونسق سابق کی طرح مرکزی یا میونسپل حکومت کے دائرہ میں جذب ہوتے نظر نہیں آتے۔ ان کی جُداگانہ اور غیر معمولی حیثیت عموماً جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ اس قسم کے اداروں کی بیسویں صدی کے دوسرے ربع سے اس قدر کثرت ہوگئی اور وہ ایسی متنوع حیثیتوں کے حامل ہیں کہ نہ صرف ان کا شمار کرنا مشکل ہے بلکہ ان کی کوئی اصولی زمرہ بندی بھی ممکن نہیں۔ نظم ونسق کے اِن غیر معمولی اجساد (BODIES) کی یہاں پر صرف چند مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی مخصوص انتظامی ضرورت کے لئے وجود میں لائے گئے تھے۔ مثلاً مرکزی مجلس اراضی (CENTRAL LAND BOARD) جو 1947ء میں قائم کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ اراضی کو بہتر بنانے کے لئے اخراجات اور اس کے حصول کے معاوضہ کے تشخص سے متعلق جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا انتظام و انصرام کرے۔ 1948ء میں قائم کردہ ایک "نیشنل اسسٹنس بورڈ" (NATIONAL ASSISTANCE BOARD) بھی اسی قبیل کی ایک مثال ہے۔ اس کا مقصد، ضرورت مند اور بے روزگار افراد کو مالی امداد فراہم کرنا تھا۔

لیکن ان سے زیادہ اہم وہ متعدد بورڈس ہیں جو معاشی اور صنعتی دائرے میں کام کرتے ہیں۔ مثلاً مارکٹنگ بورڈ (MARKETING BOARD)، کاٹن بورڈ

(COTTON BOARD.)، ڈیویلپمنٹ بورڈ (DEVELOPMENT BOARD.) اور مارٹگیج کارپوریشن (MORTGAGE CORPORATION.) وغیرہ۔ یہ مجالس عموماً ان صنعتوں کی عام نگرانی کا کام انجام دیتی ہیں جن کے لئے انھیں قائم کیا گیا ہے۔ یہ خود نہ تو صنعتیں چلاتی ہیں اور نہ ان کا مینیجمنٹ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ملکیت اور مینیجمنٹ میں دست اندازی کئے بغیر ان کا کام یہ ہے کہ مختلف صنعتوں کو اپنے مشوروں اور نگرانی سے ان کی ترقی میں مدد کریں۔

آخر میں کچھ بورڈس ایسے بھی ہیں جو کسی بڑی قومی "خدمت" یا انڈسٹری کے چلانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی بہترین مثال بی بی سی (برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن) ہے۔ یا وہ علاقائی مجالس ہیں جو ملک کے تمام ہسپتالوں اور صحتِ عامہ کی خدمات کے چلانے کی ذمہ دار قرار دی گئی ہیں۔ اسی قبیل میں نیشنل کول بورڈ (NATIONAL COAL BOARD) الکٹری سٹی اتھارٹی، گیس کونسل (GASS COUNCIL)، ٹرانسپورٹ کمیشن اور برٹش اوورسیز ایرویز کارپوریشن (BRITISH OVERSEAS AIRWAYS CORPORATION) کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

دستور میں تا حال ان نئے اور ذی اختیار اداروں کی زمرہ بندی کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکل سکی ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ معاشی و سماجی حالات میں یہ ادارے ناگزیر ہیں۔ اصل میں جو کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے وہ بے حد فنی اور تکنکی قسم کا ہوتا ہے۔ ان وسیع اداروں کا انتظام اور انصرام بھی ایسے مسائل پیدا کرتا ہے جن سے نمٹنا ایک وزیر یا اس کے محکمہ کے لئے عملاً ناممکن ہوتا ہے۔ وزرا پر یوں بھی کام کا بہت بار رہتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا مزید اضافہ ان کے لئے گوناگوں مشکلات کا باعث ہوگا۔ اسی مجبوری کے تحت ان خدمات یا ان صنعتوں کو علٰحدہ بورڈوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ عام نظم و نسق سے ان کو علٰحدہ رکھنے کا مقصد ان کی اعلیٰ کارکردگی کو برقرار رکھنا ہے۔ اس طرزِ انتظام سے وزیرِ متعلقہ کام کے راست اور بھاری بوجھ سے تو بچ سکتا ہے لیکن آخری مرحلہ میں پارلیمنٹ کے سامنے اپنی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔ بورڈس کی تشکیل ان کے صدور یا ان کے ممبروں کا عزل و نصب اس کے اختیار میں ہوتا ہے لیکن جہاں ممبروں کے طریقۂ تقرر اور ان کی مدتِ ملازمت کی صراحت خود بورڈ سے متعلق قانون یا منشور میں کر دی

گئی ہو، وہاں وزیرِ متعلقہ کا اختیار اس خصوص میں محدود ہوگا۔ اس قسم کی مثال برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے ممبروں کی ہے۔ وزیر اس بات کا عموماً مجاز گردانا جاتا ہے کہ وہ بورڈس کو ان کی حکمتِ عملی کے بارے میں عام ہدایات دیتا رہے۔ ان کو قرض پر روپیہ حاصل کرنے کی بھی اجازت دے سکتا ہے۔ اور پارلیمنٹ نے اگر اس سلسلہ میں کوئی رقمی منظوری دے رکھی ہو تو اس کے خرچ کی نگرانی کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ ان چند امور پر وزیر کی نگرانی برقرار رہتی ہے۔ اور وہ اپنے اختیارات کو کام میں لاسکتا ہے۔ لیکن روزمرّہ کے کاروبار کی انجام دہی کے بارے میں وہ ذمہ داری سے آزاد رہتا ہے۔ یہ امور بالکلیہ بورڈس کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور حکومت بورڈس کی روزمرّہ کی کارروائیوں میں نہ تو مداخلت کرتی ہے اور نہ ان سے کوئی بازپرس کرتی ہے۔ اس سے ان اتھارٹیز پر کنٹرول کی کمی کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ اور پارلیمنٹ بھی اس نئی صورتِ حال میں بے بس نظر آنے لگی ہے۔ ان حالات میں اہم سوال یہی ہے کہ ایسے ادارے جو شہریوں کی زندگی کے مختلف گوشوں پر راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کو پارلیمنٹ کے راست اور روزمرہ کے کنٹرول سے کب تک اور کہاں تک آزاد رکھا جاسکتا ہے اور اس تفصیلی ذمہ داری کے فقدان سے خود دستور کی مشینری پر کیا اثر پڑے گا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتظامی سہولتوں کے لئے دستوری تحفظات کو پسِ پشت ڈالا جارہا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا فی الوقت کوئی حل نظر نہیں آتا۔

(ب)

برطانوی دولتِ مشترکہ قانون ویسٹ منسٹر سے پہلے اور بعد

برطانوی امپائر

انگریزوں نے سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ایک وسیع اور کم و بیش عالمگیر امپائر قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ دنیا کے ہر حصہ میں ان کی نوآبادیات قائم ہوگئیں لیکن ان کا نوآبادیاتی نظام صرف ان کی اپنی قومی منفعت کی اغراض پر قائم کیا گیا تھا۔ ان کو نوآبادیوں کی ترقی اور استحکام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف ان کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ ان نوآبادیات کی آبادی بیشتر صورتوں میں انگریزی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے آبا و اجداد مختلف زمانوں میں انگلستان سے ترکِ وطن کرکے ان دُور دراز علاقوں میں جا جا کر بس گئے تھے۔ اس نسلی تعلق کی بنا پر ان کے سیاسی تصورات، اور نصب العین وہی تھے جو انگریزوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں قدرتی طور پر یہ خواہش پائی جاتی تھی کہ ان کو اپنے علاقوں کی حکومت میں موثر نمائندگی اور اختیارات حاصل رہیں لیکن انگریزی حکومت ان پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کی وجہ سے انگریزوں نے امریکہ میں اپنی تیرہ نوآبادیات کھو دیں۔ اٹھارویں صدی کے رُبع آخر میں امریکیوں نے اس مسئلہ پر انگریزوں سے جنگ کرکے کامل آزادی حاصل کرلی۔ یہ نہیں کہ انگلستان میں اس وقت ایسے مدبّر موجود نہیں تھے جنھوں نے اس غلط حکمتِ عملی کے خلاف اپنی حکومت کو متنبّہ نہ کیا ہو، لیکن ان کی صدائے احتجاج جارج سوم کی ضد کے مقابلہ میں بے اثر ثابت ہوئی۔ فاکس نے صاف طور پر کہا تھا — کہ ان نوآبادیوں کو "ملکِ مادری" سے وابستہ رکھنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ

ان کو اس بات کا اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی حکومت کی ذمہ داری آپ ہی سنبھالیں۔ نوآبادیات چاہتی بھی یہی تھیں۔ اگرچہ اس وقت اس پالیسی پر عمل نہیں کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ نوآبادیات کی بڑھتی ہوئی ناراضگی اور بددلی اور شدتِ مطالبہ کے آگے انگریزی حکومت کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ۱۸۳۹ء میں لارڈ ڈرہم کی معرکۃ الآرا رپورٹ نے نوآبادیاتی نظامِ حکومت کے تصور کو سرے سے بدل کر رکھ دیا۔ لارڈ ڈرہم نے اپنی رپورٹ میں صرف شمالی امریکہ (کنیڈا) کے مختلف صوبوں کی حکومت کا جائزہ لیا تھا۔ اور ان کی حکومت کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کی تھیں۔ ان سفارشات کا سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ ان نوآبادیات میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔ صرف نمائندہ حکومت کا قیام کافی نہیں۔ اگرچہ یہ سفارشات صرف کنیڈا سے متعلق کی گئی تھیں، لیکن ان کا اثر دوسری نوآبادیات پر پڑنا ناگزیر تھا۔

ڈرہم رپورٹ نوآبادیات کا ایک منشور ثابت ہوئی۔ اس کے زیرِ اثر مختلف نوآبادیات میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی غرض سے ضروری اقدامات کئے گئے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل تک نیو فاؤنڈلینڈ کے منجملہ پانچ نوآبادیات کو ذمہ دارانہ حکومت عطا کر دی گئی تھی۔ ۱۹۰۷ء کی نوآبادیاتی کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق ان کے لئے قلمرو (DOMINION) کا مخصوص نام تجویز کیا گیا۔ ان سب میں ایک نمائندہ مقننہ اور ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ دستوری ترقی برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی حکومت کے تعاون اور رضامندی سے ممکن ہو سکی۔ امپیریل پارلیمنٹ کے قوانین کے تحت نوآبادیات کو ذمہ دارانہ حکومت کے اختیارات دیئے گئے۔ نیوزی لینڈ، کنیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے دساتیر امپیریل پارلیمنٹ کے وضع کردہ ہیں۔ ان میں سے بعض وحدانی قسم کے ہیں اور بعض وفاقی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ ہر قلمرو کے دستور کو امپیریل پارلیمنٹ نے وضع کیا ہے لیکن اس کو قلمرو (DOMINION) متعلقہ کی خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

قلمروؤں کے اختیاراتِ قانون سازی پر تحدیدات

قلمروؤں (DOMINIONS) کی دستوری ترقی نے انھیں نمائندہ مقننہ اور ذمہ دارانہ انتظامیہ (EXECUTIVE.) تو عطا کر دیا تھا مگر ان کی ماتحتانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں

آیا۔ برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی حکومت کی سیادت ان پر مسلّم تھی۔ اگرچہ اکثر امور قانون سازی میں ان کو آزادی دی گئی تھی، لیکن بعض امور میں وہ امپیریل پارلیمنٹ کے دست نگر تھیں۔ ایک بات تو یہ تھی کہ "جواز قوانین نوآبادیات" (COLONIAL LAWS VALIDITY ACT) بابتہ 1865ء کے ذریعہ سے ان پر یہ تحدید عاید کی گئی تھی کہ وہ کوئی ایسا قانون نہ بنائیں جو ان کی قلمرو میں نافذہ کسی امپیریل قانون یا اس کے کسی جزو کے منافی ہو۔ دوسرے وہ اپنے حدودِ ارضی سے باہر کے مفادات کے لئے کوئی قانون بنانے کی مجاز نہیں تھیں۔ یعنی ان کے قوانین صرف ان کی ریاست کے طول و عرض میں موثر ہو سکتے تھے۔ بیرونی معاملات کے لئے وہ کسی قسم کی قانون سازی نہیں کر سکتی تھیں۔

ان قانونی تحدیدات کے علاوہ کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی گئی کہ قلمروؤں کے اختیارات قانون سازی کی سخت حدبندیاں قائم کی جائیں۔ اوپر کی مستثنیات کو چھوڑ کر وہ ہر قسم کا قانون بنا سکتی تھیں۔ البتہ امپیریل مفادات کے تحفّظ کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ گورنر جنرل بعض قوانین کو اپنے اختیارِ تمیزی سے مسترد کر سکتا تھا۔ لیکن عام طور پر وہ حق استرداد کے ہتھیار کو استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی بعض خاص خاص مسودے بادشاہ کی منظوری کے لئے محفوظ کر دیئے جاتے تھے۔ قانون سازی پر امپیریل کنٹرول کی اسی کو ایک شکل سمجھنا چاہیئے۔

قلمروؤں کی عاملہ

قلمروؤں میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے نتیجہ کے طور پر گورنر جنرل کے لئے یہ لازمی ہو گیا کہ وہ اپنے وزراء کے مشورے پر کام کرے۔ اس سے انحراف اصولاً ناممکن ہے۔ لیکن گورنر جنرل کی ذمہ داری دوہری قسم کی ہے۔ وہ برطانوی حکومت اور بادشاہ کا نمائندہ بھی ہے۔ اس کا تقرّر امپیریل کیبنٹ کے مشورہ پر بادشاہ کی جانب سے عمل میں آتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں برطانوی حکومت متعلقہ قلمرو سے ضروری استمزاج کر لیتی ہے۔ وہ دونوں حکومتوں کے درمیان ایک واسطۂ اتّصال کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ قلمرو میں بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے وہ اس کے اختیارِ تمیزی (PREROGATIVE) کا حامل بن جاتا ہے اور اس کے استعمال میں اسے ان روایتوں (CONVENTIONS) کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے جن کا کہ

بادشاہ خود پابند ہے۔ لیکن اپنے وزراء کے مشورے کو قبول کرنے کے معاملہ میں اس کی پوزیشن قدرے مشکل ہی رہی۔ چنانچہ بعض اوقات اس مسئلہ پر کینیڈا میں بعض سیاسی تنازعات پیدا ہوتے رہے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ قلمرویں (DOMINIONS —) پوری طرح آزاد نہیں تھیں۔ اور بعض اوقات امپیریل مفادات کے پیشِ نظر گورنر جنرل کو اپنے وزراء کے مشوروں پر عمل کرنے میں تامل ہو سکتا تھا۔ اس پر قلمروؤں میں بددلی پیدا ہوتی رہی، اور کبھی کبھی یہ بددلی تنازعات کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھی۔ بیرونی معاملات میں قلمرویں مطلق آزادی نہیں رکھتی تھیں۔ اس لئے وہ اپنے طور پر دوسرے ممالک سے کوئی ڈپلومیٹک تعلقات پیدا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ نہ اپنے سفیر مقرر کر سکتی تھیں اور نہ قونصل۔ یہ تمام کام ان کی جانب سے برطانوی حکومت انجام دیتی تھی۔ ان معاملات میں قلمروؤں سے مشورہ ضرور کیا جاتا تھا۔ 1907ء اور 1911ء میں قلمروؤں نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ دفاع اور تعلقات خارجہ کے بارے میں برطانوی حکومت ان سے ہمیشہ قریبی ربط برقرار رکھے اور ان کے مشوروں کا زیادہ لحاظ رکھا جائے۔ لیکن خارجہ حکمتِ عملی کا تعین بالکلیہ برطانوی حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا اور اس دور میں (سوائے بعض استثنائی مثالوں کے) یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی کے متعین کرنے میں آزاد رہیں۔ حکومتِ خود اختیاری کے معنیٰ کبھی یہ نہیں لئے گئے کہ امن و جنگ کی حالت کے اختیار کرنے میں برطانیہ کے فیصلوں کا ساتھ نہ دیا جائے یا ان سے انحراف کیا جائے۔

عدلیہ

قلمروؤں کے اقتدارِ اعلیٰ پر ایک اور تحدید عدلیہ سے متعلق تھی۔ اسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور کینیڈا کی تینوں قلمروؤں سے مقدمات کی اپیل پریوی کونسل میں ہو سکتی تھی ان کے دساتیر میں جو برطانوی پارلیمنٹ کے موضوعہ تھے مرافعہ بہ اجازتِ کونسل کی گنجائش رکھ دی گئی تھی۔ اس لحاظ سے قلمروؤں کا عدلیہ مکمل طور پر بیرونی سیادت سے آزاد نہیں تھا۔ قلمروؤں (DOMINIONS -) کے لئے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ یکطرفہ قانون سازی کے ذریعہ سے اس صورتِ حال کا خاتمہ کر دیں۔ کیونکہ "جواز قوانین نوآبادیات" (COLONIAL LAWS — VALIDITY ACT) اس کے مانع تھا۔ نیز یہ بات بھی تھی کہ ڈومینینس کوئی ایسا قانون

نہیں بنا سکتی تھیں جس کا اثر ان کے ارضی حدود کے باہر پڑتا ہو ۔

جنگِ عظیم اور ڈومی نین اسٹیٹس (WORLDWAR & DOMINION STATUS.)

پہلی جنگِ عظیم تک قلمروؤں (DOMINIONS.) کی یہ ماتحتانہ حیثیت برقرار رہی ۔ لیکن جنگ کے زمانے میں ناگزیر طور پر برطانیہ اور اس کی ان دختر ریاستوں کے درمیان ایسا پُرجوش ربط و اتصال اور تعاون و اتحاد پیدا ہوا کہ جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے ۔ جنگی کارروائیوں کی پیش رفت کے لئے برطانیہ نے اپنی کیبنٹ کی ہیئت کو بدل کر اسے امپیریل وار کیبنٹ کی شکل دے دی ۔ اس میں ڈومینینس کے وزرائے اعظم کو بھی شریک کر لیا گیا ۔ پچھلی تاریخ میں ایسا پُرجوش ربط و تعاون کبھی پیدا نہیں ہوا تھا ۔ ڈومی نینس سے حکومتی سطح پر باہمی صلاح و مشورے کے لئے ربط و اتصال کی تاریخ کافی پرانی ہے ۔ 1887ء سے وقتاً فوقتاً نوآبادیاتی کانفرنسیں (COLONIAL CONFERENCES.) منعقد کی جانے لگی تھیں تاکہ ملکِ مادری اور دختر ریاستیں مشترکہ دلچسپی کے مسائل پر صلاح و مشورہ کر سکیں ۔ ان کانفرنسوں میں برطانوی وزراء اور ان ریاستوں کے وزراء یا گورنر شریک ہوا کرتے تھے ۔ 1907ء میں ان کانفرنسوں کو ایک معین شکل دی گئی ۔ اس کو امپیریل کانفرنس کا نام دیا گیا اور ہر چار سال میں ایک مرتبہ اس کے انعقاد کا انتظام کیا گیا ۔ اس کے فیصلے یا مشورے کسی کو پابند نہیں کر سکتے تھے ۔ ان کی حیثیت صرف سفارشات کی سی تھی ۔ اس کے باوجود جنگ سے پہلے تک بعض مشترکہ مفادات کے مسائل مثلِ دفاع، ٹیرف، ترکِ وطن، رسل و رسائل اور کاپی رائٹ سے متعلق بعض متفقہ اقدامات کئے گئے جو بہت فائدہ مند ثابت ہوئے ۔ لیکن ان کانفرنسوں نے ایک بات اچھی طرح واضح کر دی، وہ یہ کہ باوجود متعدد مسائل میں ہم خیالی اور یک جہتی کے اس خیال کی ہمیشہ مزاحمت کی گئی کہ امپائر میں کسی قسم کی کوئی وفاقی تنظیم یا اقتدار قائم کیا جائے ۔

جنگ کے زمانے میں قلمروؤں (DOMINIONS.) نے برطانیہ کی جو خدمت انجام دی تھی اس کا صلہ ان کو ترتیبِ صلح نامہ جات کے وقت ملا ۔ برطانوی حکومت نے ان کو صلح ناموں کی گفت و شنید میں برابر کا شریک رکھا اور صلح کے لئے جو برطانوی وفد تشکیل دیا گیا تھا اس میں قلمروؤں کو نمائندگی عطا کی گئی اور بعد میں صلح ناموں پر انھوں نے اپنی انفرادی اور آزاد حیثیت میں اپنے دستخط ثبت کئے اور ان کی باضابطہ توثیق کی ۔ یہی نہیں بلکہ جب "لیگ آف

نیشنز (LEAGUE OF NATIONS —) قائم کی گئی تو قلمرویں (باستثنائے نیوفاؤنڈلینڈ) اس کی ممبر بن گئیں ۔ یہاں یہ بات ذکر کرنے کے قابل ہے کہ ہندوستان اگرچہ ابھی تک ڈومی نین کا درجہ حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن اس کو بھی لیگ آف نیشنز کے ممبر کی حیثیت عطا کی گئی ۔

ڈومی نینس کی اس تدریجی ترقی کا یہ نتیجہ نکلا کہ عملاً ان کی آزادانہ حیثیت مسلّم ہوتی چلی گئی ۔ بالخصوص معاملاتِ خارجہ میں ان کی آزادی کو تسلیم کیا جانے لگا ۔ 1923ء میں کینیڈا نے اپنے طور پر برطانوی حکومت کے توسط یا مداخلت کے بغیر ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ایک باضابطہ معاہدہ کیا ۔ عام طور پر اس کے بعد سے قلمرووں نے ڈپلومیٹک میدان میں اپنی علٰحدہ اور آزاد حیثیت میں بین الاقوامی ذمہ داریاں قبول کرنی شروع کیں ۔ اس طرح بین قومی معاملات میں امپائر کی سابقہ "وحدت" کا خاتمہ عمل میں آنے لگا ۔

1926ء کی امپیریل کانفرنس تک ڈومی نینس (DOMINIONS .) کی آزادی کا تصور بہت ترقی کر چکا تھا ۔ چنانچہ اس کانفرنس میں یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ "ڈومی نینس برطانوی امپائر میں آزاد اور خود مختار ریاستوں کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اور یہ کہ مرتبہ کے لحاظ سے ان میں سے کوئی کسی کا ماتحت نہیں بلکہ اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں کامل مساوات کی اساس پر اپنی آزاد مرضی کے ساتھ برطانوی دولتِ مشترکہ کی ممبر ہیں —" برطانوی حکومت کا یہ اعلان اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ قلمرویں اب بیرونی معاملات میں آزاد اور خود مختار ہیں ۔ ان کی اندرونی خود مختاری تو پہلے سے ہی تسلیم کی جا چکی تھی لیکن اس خود مختاری پر بعض تحدیدات عاید تھیں ۔ اس لئے اسی کانفرنس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ان کے اقتدارِ اعلیٰ پر ماسبق تحدیدات کو ختم کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں ۔ چنانچہ پانچ سال بعد جو قانون ویسٹ منسٹر بابتہ 1931ء پاس کیا گیا وہ اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا ۔

قانون ویسٹ منسٹر بابتہ 1931ء

قانون ویسٹ منسٹر نے صرف ان ہی روایات (CONVENTIONS.) کو قانونی جامہ پہنا دیا جو پہلے سے موثر اور نافذ العمل ہو چکی تھیں ۔ اس قانون کو نو آبادیات کی تاریخ کا ایک

اہم سنگِ میل سمجھنا چاہئے۔ اور اس سے ڈومی نین اور برطانیہ کے تعلقات کو ایک قانونی حیثیت دے دی گئی۔ قانون ویسٹ منسٹر، مجموعی طور پر تمہید (PREAMBLE) اور بارہ دفعات پر مشتمل ہے۔ تمہید میں کہا گیا ہے کہ برطانوی دولتِ مشترکہ میں مختلف ڈومی نینس صرف تاج کے وجود سے ایک دوسرے سے متحد اور منسلک ہیں۔ ان سب کی وفاداری تاج سے وابستہ ہے اور "تاج" برطانوی دولتِ مشترکہ کے قوموں کے درمیان ان کی آزاد مرضی سے قائم کردہ اتحاد کا مظہر اور اس کی علامت ہے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وراثت یا القابِ شاہانہ میں کوئی تبدیلی کی ضرورت ہو تو اس کی قبل از قبل منظوری دولتِ مشترکہ کے تمام اراکین کی مجالس قانون ساز سے حاصل کی جانی چاہئے۔ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد سے "جواز قوانین نوآبادیات 1865ء" کے تحت ڈومی نین کی مجالس قانون ساز پر جو تحدید عاید تھی اس کو منسوخ العمل قرار دیا گیا۔ نیز قانون سازی میں "حدودِ ارضی" کی جو تحدید تھی وہ بھی منسوخ کر دی گئی۔ وہ اب ایسے قوانین بنا سکتی ہیں جو اُن کے حدودِ ارضی کے باہر بھی ان کے مفادات کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ قلمروئیں (DOMINIONS.) بیرونی معاملات میں بھی کامل طور پر آزاد ہو گئیں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ برطانیہ کسی ڈومی نین کے لئے کوئی قانون سازی کا کام انجام نہیں دے گا۔ اِلّا اس صورت کے ایک یا اس سے زیادہ ڈومی نینس ایسے کسی قانون کے بنانے کی امپیریل پارلیمنٹ سے درخواست کریں۔ ایسی ڈومی نینس میں جہاں وفاقی طرز کا دستور کارفرما ہے مجلسِ قانون ساز (لیجسلیچر) کو ترمیم دستور کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے سوائے وہ ہر قسم کا قانون بنا سکتی ہیں اور ان کی عدالتیں ان کو غیر مجاز قرار نہیں دے سکتیں۔

برطانوی امپائر قانون ویسٹ منسٹر ۱۹۳۱ء کے بعد

قانون ویسٹ منسٹر کو ڈومی نینس (قلمروں) کے ایک چارٹر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد ان کی کامل آزادی میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔ وہ بین الاقوامی قامت کی حامل ہو گئیں۔ لیکن برطانوی امپائر میں ابھی بہت سے ایسے توابع اور نوآبادیاں موجود تھیں جو یہ درجہ حاصل نہیں کر سکی تھیں۔ ان کی حیثیت ماتحتانہ تھی۔ ہندوستان بھی اسی زمرہ میں شریک تھا۔ دوسری جنگِ عظیم نے برطانوی امپائر کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ وہ عظیم الشان

"شہنشاہیت" جس کا غرور عز وناز "آسمانوں سے ہم کلام تھا دوسری جنگ عظیم کے سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ کر رہ گئی۔ وہ امپائر جس میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا آج اس کا پتہ تک باقی نہیں ہے۔ اب جو باقی ہے تو صرف ایک "سلطنتِ متحدہ برطانیہ" جو یورپ میں دوسرے درجہ کی طاقت ہو کر رہ گئی ہے ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ہندوستان اور پاکستان کو آزادی حاصل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ برطانیہ کی تمام نوآبادیات آزاد ہوگئیں۔ اس عظیم الشان انقلاب کے باوجود انگریزوں نے کمالِ تدبر سے بیشتر آزاد ہونے والی قوموں کو کسی نہ کسی طرح اس ادارے سے وابستہ کر رکھا جو پہلے برٹش کامن ویلتھ آف نیشنز (BRITISH COMMON WEALTH OF NATIONS) کہلاتا تھا۔ اور اب صرف کامن ویلتھ یا دولتِ مشترکہ کے نام سے موسوم ہے۔ دولتِ مشترکہ کی رُکنیت کا ان آزاد ہونے والی قوموں پر کوئی لزوم نہیں۔ یہ اب ایک ایسا ادارہ ہے جس کا ہر رُکن اپنی آزاد مرضی سے اس میں شریک ہے۔ اور اس سے علٰحدگی بھی نہایت آسان ہے۔ کسی وقت بھی کوئی رُکن ملک اس سے علٰحدہ ہوسکتا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دولتِ مشترکہ کی برادری سب کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اور بہت سے باہمی مسائل آسانی سے طے پاسکتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی کسی کا ماتحت ہے اور نہ کسی کو کسی پر سیادت حاصل ہے۔ ہر قوم اپنے معاملات میں کامل طور پر آزاد ہے۔ سابق میں دولتِ مشترکہ کی رُکنیت کے لئے یہ ضروری تھا کہ تاج کی سیادت کو تسلیم کیا جائے اور اس سے وفاداری رُکنیت کی ایک اہم شرط تھی۔ لیکن موجودہ صورت یہ ہے کہ تاج سے وابستگی بھی ضروری نہیں۔ اس لئے ایسی قومیں جو ری پبلک ہوچکی ہیں وہ بھی دولتِ مشترکہ کی رُکن ہوسکتی ہیں۔ افریقی اور ایشیائی قوموں کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا سابقہ نام برٹش کامن ویلتھ آف نیشنز سے بدل کر صرف "کامن ویلتھ" آف نیشنز کر دیا گیا ہے۔ یہ کہا جاچکا ہے کہ دولتِ مشترکہ

سے علٰحدگی نہایت آسان ہے۔ چنانچہ پاکستان نے ابھی حال ہی میں اس کی رُکنیت سے دست برداری حاصل کرلی ہے۔ بعضوں نے مثل برما کے شروع سے ہی اس کی رُکنیت حاصل کرنے کو پسند نہیں کیا۔

دولتِ مشترکہ کے وقفہ وقفہ سے کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ شرکائے کانفرنس سبھی محفل سے یہ کہہ کر اُٹھتے ہیں کہ یہ مشورے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ کسی حد تک ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن زیادہ تر تو یہ کیفیت ہے کہ ؎

نشستند و گفتند و برخاستند

تیئسواں باب

دستورِ انگلستان کی خصوصیات

غیر مکتوبی دستور

دستور انگلستان کی خصوصیات پر جب کبھی کچھ لکھا جاتا ہے تو "ڈی ٹاک ویل" (DE TOCQUEVILLE -) کا وہ مشہور مقولہ کہ " انگلستان کا کوئی دستور نہیں ہے " یاد آئے بغیر نہیں رہتا ۔ یہ حرفِ شکایت صرف ٹاک ویل کی زبان پر ہی نہیں آیا بلکہ اکثر بیرونی مبصرین اس معاملہ میں اس کے ہمنوا نظر آتے ہیں ۔

انگلستان کے دستور کے سوائے دیگر ممالک کے دساتیر اپنا ایک ٹھوس اور ناقابلِ انکار وجود رکھتے ہیں ۔ ان کو کہیں سے بھی کتابی شکل میں حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ ان کا مطالعہ ان کے نظامِ حکومت کے خدوخال سے مکمل طور پر روشناس کرا سکتا ہے ۔ انگلستان کا دستور ایسی مکمل اور وضع شدہ شکل میں دستیاب نہیں ہوتا ۔ اس کا وجود اگر کہیں ٹھوس ہے تو کہیں غیر مرئی ۔ وہ دیکھنے میں کچھ ہے اور حقیقت میں کچھ ۔ وہ موجود بھی ہے اور (ایک خاص مفہوم میں) معدوم بھی ۔ دستورِ انگلستان کی یہ خصوصیت زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ وہ تحریری یا مکتوبی شکل میں نہیں پایا جاتا ۔ انگلستان کی صدیوں پرانی تاریخ میں کبھی ایسا موقعہ نہیں آیا کہ قوم نے یا قوم کے نمائندوں نے اپنے لئے کسی مکمل دستور کے وضع کرنے کی کوشش کی ہو ۔ ایک مرتبہ ایسی کوشش ضرور کی گئی لیکن وہ ناکام ثابت ہوئی ۔ انگلستان کا دستور جزواً جزواً بنتا رہا ۔ اور مختلف زمانوں میں بلا ارادہ اس کی تدوین ہوتی رہی ۔ بنیادی طور پر یہ ایک ارتقائی دستور ہے ۔ اور اس ارتقاء کا سلسلہ صدیوں پرانی تاریخ پر پھیلا ہوا ہے ۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب بھی اس کے ارتقاء کا سلسلہ جاری ہے یہ دستور ساکت اور جامد نہیں بلکہ مثل ایک دریا کے رواں دواں ہے ۔ اس کی اس روانی میں تموّج و تلاطم نہیں بلکہ گہرے پانی کا سکون پایا جاتا ہے ۔

انگلستان کے دستور کو غیر مکتوبی کہنا بڑی حد تک درست ہے لیکن اس خصوصیت کو تمام و کمال حقیقت سمجھ لینا سخت غلطی ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ پورا دستور کبھی ضبطِ تحریر میں نہیں آیا لیکن اس کے بہت سے اجزا تحریری شکل میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں ان میں سے صرف چند کے گنوانے پر اکتفا کیا جاتا ہے :

- منشورِ اعظم (1215ء)
- عرضداشتِ حقوق (1628ء)
- مسودۂ قانونِ حقوق (1689ء)، اور
- قانونِ وراثت (1701ء)

یہ ایسے بنیادی دستاویز ہیں جن سے تاج کے اختیارات کی حد بندی کی گئی ہے۔

- قانون رہائی از حبس بے جا (1679ء) کے ذریعہ سے فرد کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔
- 1832ء، 1867ء، 85-1884ء اور 1918ء کے قوانین نے نہ صرف دارالعوام کے اصولِ نیابت کو بدل دیا بلکہ ملک میں حقیقی جمہوریت قائم کردی۔
- موجودہ مقامی حکومت کی تنظیم کا انحصار 1835ء، 1888ء، 1894ء، 1933ء اور 1946ء کے منظور کردہ قوانین پر ہے۔
- 1911ء اور 1949ء کے "قوانین پارلیمنٹ" نے دارالامرا کے اختیارات کی حد بندی کردی ہے۔

یہ سب موضوعہ قوانین ہیں اور انگلستان کے مروّجہ دستور میں ان کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر قوانین دستور میں ایک طرح سے ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتے ہیں۔ دستور میں ان قوانین کو جو اساسی اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ لیکن اگر ایسے تمام قوانین کو یکجا کرکے ان کا مطالعہ کیا جائے تو انگلستان کے دستور کی کوئی واضح شکل سامنے نہیں آسکے گی۔

اس قسم کے مطالعہ کے بعد بھی دستور کے ایسے جوڑ بند نظروں سے مستور رہیں گے جو فی الحقیقت اس کل کو ترتیب و تنظیم اور ربط و ضبط کے ساتھ حرکت میں رکھتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح نہیں ہوگی کہ عاملہ اور مقننہ کے تعلقات کی دستوری اساس کیا ہے؟

کیبنٹ کا دستور میں کیا مقام ہے؟ اور اس کے اختیارات و فرائض کیا ہیں؟ اور وزیر اعظم کی پوزیشن اور اس کے اقتدار کی بنیاد کیا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے اَن گنت امور جو دستور کی اصل جان ہیں ان کا کہیں کوئی ذکر قوانین میں نہیں مل سکے گا۔ بات یہ ہے کہ کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی گئی کہ ان مبہم اور غیر مرئی اجزائے دستور کو قانونی جامہ پہنایا جائے۔ ان اہم امور سے متعلق دستور کی یہ خاموشی باہر کے مبصرین کے لئے ہمیشہ حیرت اور اچنبھے کا باعث رہا کی ہے۔

لچکدار دستور

غرض یہ بات مزید کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ انگلستان کا دستور بڑی حد تک غیر مکتوبی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی ایک اور خصوصیت بھی سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ لچکدار (FLEXIBLE.) اور آسانی سے ترمیم پذیر ہے۔ یہ دونوں خصوصیات ایک دوسرے سے قریب تر ضرور ہیں لیکن لازم و ملزوم نہیں۔ عموماً تحریری دساتیر میں ترمیم کا کوئی خاص طریقہ کار معین کر دیا جاتا ہے جو عموماً پیچیدہ اور دشوار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی ترمیم قدرے مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر تحریری دستور میں ترمیم کے لئے مخصوص اور پیچیدہ شرائط کا رکھا جانا ضروری نہیں۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے اسپین اور اٹلی کے دساتیر مکتوبی ہونے کے باوجود انگلستان کی طرح لچکدار تھے۔ مجلس قانون ساز وہاں جس طرح عام قوانین منظور کرتی تھی اسی طرح وہ دستور میں بڑی سے بڑی تبدیلی لانے کی بھی مجاز تھی۔ عام قانون سازی اور دستوری ترمیم دونوں کے طریقۂ کار (PROCEDURE.) میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا تھا۔ انگلستان میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہاں دستوری قانون اور عام قانون میں کوئی فرق نہیں۔ دستوری ترمیم کے لئے یہاں نہ صرف کوئی علٰحدہ مشینری نہیں ہے بلکہ ہر آن دستور میں تغیر کا عمل غیر محسوس طریقہ سے برابر جاری رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ ترمیم دانستہ طور پر کی جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت پارلیمنٹ ایسے قوانین منظور کرتی ہے، جن کا مقصد دستور کے کسی اہم حصہ یا جزو میں تبدیلی لانا ہوتا ہے۔ پچھلے صفحات میں ایسے متعدد قوانین کی نظیریں دی گئی ہیں۔ جو تبدیلی کہ قوانین کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے وہ بیک نظر ہر وقت دکھائی پڑتی ہے، لیکن دستورِ انگلستان میں تبدیلی ایک اور طرح سے بھی ہوتی ہے۔ یہ تغیر

پس پردہ جاری رہتا ہے ، اور آہستہ آہستہ رونما ہوتا ہے ۔ اس تغیر کے واقع ہونے کا کوئی معین وقت نہیں بتایا جا سکتا لیکن وقفہ وقفہ سے دستور کا مطالعہ کیا جائے تو یہ پتہ لگتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض مخصوص سمتوں اور گوشوں میں دستور میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے ۔ حالانکہ یہ تبدیلی کسی دانستہ قانون سازی کا نتیجہ نہیں ۔ انگلستان میں انتہائی اہم قسم کی تبدیلیاں اسی طرح واقع ہوائیں ۔ اس کی بہترین مثال کیبنٹ کا ارتقاء ہے ۔ اس کے لئے کبھی کوئی قانون نہیں بنایا گیا لیکن اس کے باوجود کم و بیش دو سو سال کے عرصہ میں کابینی نظام کے خاموش ارتقاء کی وجہ سے دستور میں ایک انقلابی تبدیلی واقع ہوگئی ۔ نظامِ حکومت کچھ سے کچھ ہوگیا ۔ دستور کی خاموش ترمیم پذیری کی اس سے بہتر کیا مثال ہو سکتی ہے ؟ اسی قسم کی ایک اور مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے ۔ بیج ہاٹ نے دستورِ انگلستان پر اپنی مشہور اور بے مثل کتاب دوسرے قانونِ اصلاح سے پہلے پامرسٹن کے زمانہ میں لکھی ۔ اس میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ مروّجہ آئین کے لحاظ سے عاملہ کلیتہً مقننہ یا پارلیمنٹ کی زیر دست اور محکوم ہے ۔ اس اظہارِ رائے کے کم و بیش چالیس سال بعد بیسویں صدی کے اوائل میں دستورِ انگلستان پر ایک اور معرکتہ الآرار کتاب لکھی گئی ۔ لکھنے والا پریسیڈنٹ لوویل (LOWELL) تھا جو تاریخ و سیاسیات کا ایک عالم بے بدل مانا جاتا ہے ، اس نے دستور کا جو تجزیہ پیش کیا اس میں یہ بات ثابت کر دکھائی کہ مقننہ کی سابقہ بالادستی تو کہاں ، اُلٹے وہ عاملہ کی تابع اور محکوم ہوگئی ہے ۔ کیبنٹ ایک مرتبہ تشکیل پا جانے کے بعد مقننہ کی زیر دست نہیں رہتی ۔ خصوصاً قانون سازی میں تمام اختیار کھینچ کر کیبنٹ کے ہاتھ میں آگیا ہے ۔ پارلیمنٹ صرف کابینہ کے فیصلوں کو روبہ عمل لانے کی مشین بن کر رہ گئی ہے ۔ دستور میں یہ عظیم الشان انقلابی تبدیلی انیسویں صدی کے اواخر ۔ ظہور میں آنے لگی ۔ بیسویں صدی کے ممتاز اور صاحب الرائے مبصرین نے اس حقیقت کو ے طور پر تسلیم کیا ہے کہ اس تبدیلی سے دستور کے مختلف اعضاء کے توازن میں بڑا فرق پیدا ہوگیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے لئے نہ کوئی قانون بنایا گیا اور نہ کسی طرح بالارادہ ترمیم کیلئے کوئی اقدامات کئے گئے ۔ دستور نے بہ اقتضائے حالات آپ ہی آپ رسوم اور کنونشن کے سہارے اپنا چولا بدل ڈالا ۔ یہ اس کے لچکدار اور آسانی سے ترمیم پذیر ہونے کا بیّن ثبوت ہے ۔ دستور کی اس لچک سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو ضرورت کے مطابق ڈھال لیا

جا سکتا ہے ۔ اس میں ایسی سختی اور استواری نہیں کہ غیر معمولی حالات کے دباؤ کے تحت اس کی کل ٹوٹ کر رہ جائے ۔ اس کی لچک اس کو ہر صورتِ حال سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے ۔ نپولین سوم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ " ہم لوگ فرانس میں انقلابات برپا کرنا جانتے ہیں مگر اصلاحات سے کام لینا نہیں جانتے " انگلستان میں صورتِ حال برعکس ہے ۔ یہاں انقلابات واقع نہیں ہوتے کیونکہ اصلاحات کے ذریعہ سے بروقت بلائیں ٹل جاتی ہیں ۔ یہ دستور کے لچکدار ہونے کا کرشمہ ہے ۔

پارلیمنٹ کا لامحدود اقتدارِ اعلیٰ (SUPREMACY OF THE PARLIAMENT)

انگلستان کے دستور کی ایک اور نمایاں خصوصیت، پارلیمنٹ کا لامحدود اقتدارِ اعلیٰ ہے ۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جو اسے دوسرے دساتیر سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے ۔ پارلیمنٹ اپنے سے بالاتر کسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتی ۔ اندرونِ ملک کوئی طاقت اس کے اقتدار کو چیلنج نہیں کر سکتی ۔ قانونی اقتدارِ اعلیٰ پارلیمنٹ میں مرکوز ہے ۔ پروفیسر ڈائسی (DICEY) نے پارلیمنٹ کے لامحدود اقتدار کو انگلستان کے دستور کی اہم ترین خصوصیت بتایا ہے ۔ اس اقتدار کی تشریح اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ :

(۱) کوئی قانون ایسا نہیں جو پارلیمنٹ وضع نہیں کر سکتی ۔

(۲) کوئی قانون ایسا نہیں جس کی پارلیمنٹ تنسیخ یا ترمیم نہیں کر سکتی ۔ اور یہ کہ

(۳) دستورِ انگلستان میں اساسی یا دستوری قوانین اور عام قوانین میں کوئی فرق نہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ نہ صرف قانون ساز ادارہ ہے بلکہ وہ " دستور ساز " بھی ہے ۔

(۱) قانون سازی میں پارلیمنٹ کے لامحدود اختیار کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔ 1701ء میں قانونِ وراثت (ACT OF SETTLEMENT) کے نام سے نہایت اہم قانون وضع کیا گیا ۔ اس کے ذریعہ سے تخت و تاج کی وراثت کے سلسلہ کو متعین کیا گیا ۔ 1707ء میں پارلیمنٹ نے اپنے معمولی طریقۂ کار سے ایک اور بنیادی اور اساسی قانون منظور کیا ۔ اس کی رو سے انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کا اتحاد عمل میں آیا اور اسی قانون کی بنا پر آج تک یہ اتحاد برقرار ہے ۔ یہ بات محتاجِ تشریح نہیں کہ اس قانون نے نہ صرف ان دونوں ممالک

میں اتحاد پیدا کیا بلکہ اس کی وجہ سے ملک کے دستور میں ایک بنیادی تبدیلی وجود میں آئی بسنہ 1800ء میں اسی نوعیت کے ایک قانون[1] سے انگلستان اور آئرلینڈ کو باہم متحد کیا گیا۔ یہ بھی نہایت ہی اہم دستوری قانون ہے۔ کیونکہ اس سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی ترتیب و ترکیب میں بیّن فرق واقع ہوا۔ پارلیمنٹ کے تفوق اور برتری کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے کہ اس نے سنہ 1716ء میں ایک ایسا قانون منظور کیا جس سے اس کی معیاد تین سال کی بجائے سات سال کر دی گئی۔ یہی نہیں بلکہ اس کا اطلاق حاضرہ پارلیمنٹ پر بھی کیا گیا۔ اس قسم کی نظیر سترھویں صدی میں بھی ملتی ہے جبکہ طویل پارلیمنٹ (LONG - P) نے اپنے آپ کو ناقابلِ تحلیل ٹھہرایا اور عملاً ایک دائمی حیثیت اختیار کر لی۔ ان نظائر سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ پارلیمنٹ لامحدود اختیارات کی حامل ہے۔ اگر ایک ایسی پارلیمنٹ جو صرف تین سال کے لئے منتخب کی گئی ہے۔ قانوناً اپنی میعاد کو بڑھا کر سات سال کر سکتی ہے تو وہ اسے ستر سال یا سات سو سال کیوں نہیں کر سکتی؟ اسے کون روک سکتا ہے؟ بعض مبصرین اور علمائے دستور نے قانون ہفت سالہ کو پارلیمنٹ کا ایک غاصبانہ فعل قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس سے ان کے نزدیک منتخب کنندگان کے حقوق غصب ہو جاتے ہیں۔ اسے آپ خواہ کچھ بھی نام دیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹھیٹ قانونی نقطۂ نظر سے پارلیمنٹ کو اس سے باز رکھنے کے لئے دستور کوئی گنجائش فراہم نہیں کرتا۔ بے شک کرامول نے سنہ 1653ء میں اسی قسم کی مبینہ غاصبانہ صورتِ حال کا موثر سدِ باب کیا جبکہ "رمپ" کو برخواست کر کے اس نے ایوان کے دروازوں کو مقفل کر دیا۔ مگر کرامول کا یہ فعل کسی قانون کی بنیاد پر نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ خود ایک زیادتی تھی۔ اسے قانون کا نہیں بلکہ تلوار کا سہارا حاصل تھا۔ طاقت کے استعمال کے مقابلہ میں "قانون" بے چارہ دم سادھ کر چپ ہو بیٹھتا ہے۔ غرض یہ بات صاف ہے کہ پارلیمنٹ پر کسی قسم کی کوئی قانونی تحدید یا پابندی عاید نہیں ہو سکتی۔ ڈائسی نے قانونِ ہفت سالہ کا حوالہ دے کر یہ بات واضح کی ہے کہ پارلیمنٹ اپنے منتخب کنندوں کی نہ تو ایجنٹ ہے اور نہ کسی

---

[1] واضح رہے کہ سنہ 1922ء میں آئرش فری اسٹیٹ کے قیام کی وجہ سے یہ اتحاد باقی نہیں رہا۔ اور اب "EIRE" ایک آزاد مملکت ہے، البتہ شمالی آئرلینڈ "سلطنتِ متحدہ" کے جزو کی حیثیت سے برقرار ہے۔

مفہوم میں ان کی امین یا ٹرسٹی۔ وہ مملکت کے اقتدارِ اعلیٰ کی مُظہر ہے اور اس اقتدار کی حامل بھی۔ قانون ہفت سالہ اس اقتدار کا نتیجہ بھی ہے اور اس کا ثبوت بھی۔

(۲) پارلیمنٹ نہ صرف قانون سازی میں لامحدود اختیار رکھتی ہے بلکہ وہ کسی قانون کو بھی منسوخ یا عارضی طور پر معطل کرسکتی ہے۔ اس بارے میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں 1869ء میں جبکہ "آئرستانی کلیسا کی مسدودی" کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اس وقت پارلیمنٹ کے اس اختیار کے بارے میں شبہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ آیا وہ "قانون اتحاد" (1800ء) — (ACT OF UNION — 1800) کے کسی جُزو یا کسی دفعہ کو منسوخ کرنے کی مجاز ہے۔ اگر یہ اعتراض محض اخلاقی یا سیاسی سطح پر تھا تو اس کے تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن قانونی اعتبار سے اس شک وشبہ اور اس قسم کے اعتراض کا مطلق کوئی جواز نہیں۔ دستوری قانون کے ماہر کی نظر میں قانونِ اتحاد (ایکٹ آف یونین) کسی طرح بھی کسی خصوصی تقدس کا حامل نہیں۔ وہ بھی مثل اور بہت سے معمولی قوانین کے ہے۔ جنھیں پارلیمنٹ روزمرّہ کی ضروریات کے لئے پاس کرتی رہتی ہے۔ اس کی حیثیت خواہ کچھ ہی ہو وہ پارلیمنٹ کے اقتدارِ تنسیخ و ترمیم کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اس اقتدار کے استعمال کی کچھ اور مثالیں بھی ہیں۔ 1727ء سے 1828ء تک پارلیمنٹ ہر سال بالالتزام ایک "قانونِ معافی" (ACT OF INDEMNITY) کی منظوری دیتی رہی۔ اس کا مقصد "منحرفین" (DISSENTERS) کو سہولت بہم پہنچانا تھا۔ ایسے لوگ جو "قانونِ آزمائش" کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی عہدہ کو قبول کرلیتے اور اپنے اعتقادات کی بنا پر کلیسائے انگلستان کے طریقہ کے مطابق "عشائے ربانی" (SACRAMENT.) حاصل نہیں کرسکتے تھے؛ انھیں قانون مذکور الصدر کی تعزیری دفعات کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے پارلیمنٹ ہر سال ایک "قانونِ معافی" منظور کرنے لگی۔ اس طرح ڈسنٹرس کو اس قابل بنایا کہ وہ قانون کی خلاف ورزی بھی کریں اور اس کی زد سے بچ بھی جائیں۔ پارلیمنٹ کا یہ عمل ڈائسی (DICEY) کے نزدیک "قانون شکنی" کو "قانونی جامہ" عطا کرنے کے مترادف ہے اس کی نگاہ میں یہ "قوانینِ معافی" پارلیمنٹ کے اقتدارِ اعلیٰ کا بہترین ثبوت ہیں کہ وہ ہر ناجائز کو بھی جائز کرنے کی مجاز ہے۔

(۳) انگلستان میں دستوری یا معمولی قوانین میں کسی خاص فرق یا امتیاز کا

نہ ہونا ایک کھلی حقیقت ہے۔ قانون سازی میں پارلیمنٹ کے لامحدود اختیارات کے ضمن میں جو بحث اور پیش کی گئی اس میں اس مسئلہ کی بھی واضح تشریح ہو جاتی ہے۔ کرامول اور اس کے ساتھیوں نے دولتِ عامّہ (COMMON WEALTH) کے زمانے میں یہ کوشش کی تھی کہ اساسی اور معمولی قوانین میں ایک حد قائم کی جائے۔ آئینِ حکومت (INSTRUMENT OF GOVERNMENT) کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ پارلیمنٹ کے اختیار کو صرف قانون سازی کے حد تک محدود رکھا جائے اور وہ دستور میں تغیر و تبدل کی مجاز نہ رہے مگر کامن ویلتھ اور پروٹکٹریٹ کی پارلیمنٹوں نے اس اصول کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا اور پارلیمنٹ کے دستور سازانہ کردار کو برقرار رکھنے کے لئے انھوں نے بڑا جاں بازانہ مقابلہ جاری رکھا۔ ان کی اس مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ عود شاہی کے بعد پھر کبھی پارلیمنٹ کے اختیار دستور سازی کو ساقط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

دستور کی بنیاد "قانونی حکمرانی" پر RULE OF LAW

قدیم زمانے سے انگلستان کے دستور میں قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا تصور ایسا رچا ہوا رہا کہ اس کو دستور کی ایک بنیادی خصوصیت سمجھا جاسکتا ہے۔ قانون کی برتری اور تفوق کے تحفظ کے لئے انگریزوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ اور ان کے دستور کا ارتقاء تمام تر اسی تصور کا رہینِ منت ہے۔ قانون کی حکمرانی یا "رول آف لا" کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے اس کے مضمرات کا جائزہ لینا ہوگا۔ "رول آف لا" میں تین بنیادی مضمرات پائے جاتے ہیں:

(۱) یہ کہ قانونی طور پر کسی فرد کی جان و مال کو اس وقت تک ضرر نہیں پہنچایا جاسکتا جب تک اس سے کوئی ارتکاب جُرم نہ ہوا ہو اور یہ جُرم ملک کے عام قانون کے ذریعہ سے عام عدالتوں میں قانونی طور پر ثابت نہ ہوگیا ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ کوئی فرد بھی نہ تو قانون کے اثر سے مستثنیٰ ہے اور نہ اس سے بالاتر۔ نیز یہ کہ بلا لحاظ درجہ و مرتبہ ہر شخص ملک کے عام قانون کا تابع ہے اور ملک کی معمولی اور عام عدالتوں کو ہی اس کے مقدمات کی سماعت کا اختیار حاصل ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ فرد کے حقوق کا منبع اور سرچشمہ قانونِ دستور LAW OF THE

CONSTITUTION نہیں ہے بلکہ انفرادی حقوق جن کو عدلیہ اپنے فیصلوں سے نافذ کرتا ہے وہ دستور کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر دستور کے عام اصول ان فیصلوں کے نتائج ہیں جو وقتاً فوقتاً عدالتیں، انفرادی حقوق کے تحفظ کے لئے صادر کرتی رہتی ہیں۔ گویا عدلیہ کے فیصلے دستوری قواعد اور قوانین کی تشکیل کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

"رول آف لا" کے مضمرات کے تحت پہلی بات جو بیان کی گئی وہ فرد کی شخصی آزادی سے متعلق ہے۔ اس آزادی میں بلا کسی قانونی جواز کے مملکت مداخلت نہیں کرسکتی۔ بظاہر یہ بات بہت معمولی سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب ہم ایسے ممالک کا حال پڑھتے ہیں، جہاں اس کا یکسر فقدان تھا۔ مثال کے طور پر انقلاب سے پہلے فرانس کی حالت کو دیکھئے۔ یہاں اس وقت نہ کوئی قانون تھا اور نہ کوئی ضابطہ۔ کم از کم ایسا کوئی بنیادی قانون موجود نہیں تھا جس سے شخصی آزادی کی حفاظت کا تیقن حاصل کیا گیا ہو۔ سینکڑوں لوگ قید و بند کی مصیبت اٹھاتے تھے۔ ایک مرتبہ جیل میں ٹھونس دیئے جاتے تو پھر ان کے باہر نکلنے کی کوئی امید نہیں رہتی۔ یہ اس لئے نہیں تھا کہ انھوں نے کوئی جرم کیا ہو یا کسی عدالت میں اس جرم کی تحقیقات کی گئی ہو اور فراہمی ثبوت کے بعد انھیں سزا دی گئی ہو، بلکہ ان کا کسی ایسے شخص کو ناراض کرنا کافی تھا، جو اپنے اثر اپنی پوزیشن یا اپنے اقتدار کی وجہ سے ان کو محبوس کرانے کے لئے "حکم نامۂ نظر بندی" (LETTRE DE CACHET) اجرا کروا سکتا تھا۔ اس کا غیظ و غضب ان کو عمر بھر کے لئے آزادی سے محروم کرنے کے لئے کافی تھا۔ فرانس کا مشہور محبس، باسٹیل (BASTILLE) جبر و تعدی کی ایک نشانی اور علامت اسی لئے بنا ہوا تھا کہ یہاں ناکردہ گناہ، سینکڑوں افراد قید و بند کی مصیبت جھیلتے تھے اور انھیں نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی لئے جب انقلاب کا بھونچال آیا تو سب سے پہلے ظلم و تعدی کی اس نشانی کو اس نے مسمار کرکے رکھ دیا۔ "رول آف لا" کی نعمت کی قدر صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس کے فقدان کی وجہ سے ظلم و تعدی کا شکار ہوتے ہیں۔

سترھویں صدی کے انگلستان میں بھی شخصی آزادی کو شاہانہ مطلق العنانی کی وجہ سے زبردست خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ ایسی متعدد عدالتیں ملک میں موجود تھیں جو شخصی آزادی کے صدیوں پرانے بنیادی تحفظات کو یکسر نظر انداز کرتی تھیں۔ یہ خصوصی شاہی

اختیارات کی عدالتیں (PREROGATIVE COURTS.) تھیں۔ جہاں ملک کے عام اور مروجہ قانون کے مطابق نہیں بلکہ مرضی شاہانہ کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ "عدالت اسٹار چیمبر" عدالت ہائی کمیشن" کونسل آف ویلز" اور "کونسل آف دی نارتھ (COUNCIL OF THE NORTH.) وغیرہ عرفِ عام میں تو عدالتیں کہلاتی تھیں مگر فی الحقیقت وہ شاہانہ جبر و تعدی کا آلۂ کار بنی ہوئی تھیں۔ جب تک یہ عدالتیں برقرار رہیں" رول آف لا" کا انگلستان میں بھی کوئی سوال نہیں تھا۔

اس دور میں "شخصی آزادی" صرف خصوصی عدالتوں (PREROGATIVE COURTS) کی وجہ سے ہی خطرہ میں نہیں تھی۔ ملک کی عام عدالتیں بھی شاہانہ مداخلت کی وجہ سے "شخصی آزادی" کی حفاظت سے قاصر تھیں۔ اسٹورٹوں کے عہد میں اس قسم کی مداخلت کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ 1627ء میں" مقدمہ ڈارنل" (یا پانچ نائٹوں کے مقدمہ) کے سلسلہ میں یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ ملک کی کسی عام عدالت میں ارتکاب جرم کے ثابت ہوئے بغیر محض بادشاہ کی ناراضگی کسی بھی شخص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل سکتی ہے۔ اس مقدمہ پر تفصیلی بحث پچھلے صفحات میں کی جا چکی ہے۔ ڈارنل اور اس کے ساتھیوں کو پریوی کونسل کے حکم کی بنا پر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ محروسین نے "عدالت کنگس بنچ" (KINGS BENCH.) میں رجوع ہوکر رہائی از حبس بیجا کے حکمنامہ کی اجرائی کی درخواست پیش کی۔ اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں نظر بند کئے گئے ہیں۔ اس کے جواب میں تاج کی جانب سے نہ تو کوئی فردِ جرم لگائی گئی اور نہ ہی محروسین کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ حکومت کا استدلال یہ تھا کہ بادشاہ بلا اظہار وجود کسی شہری کو بھی مصالح ملکی کی بنیاد پر نظر بند کر سکتا ہے۔ عدالت نے اس استدلال کو تسلیم کر لیا اور مذکور الصدر محروسین کو ضمانت پر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ انگلستان میں سترھویں صدی تک بھی" رول آف لا" کا تحفظ شہریوں کو حاصل نہیں تھا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صدی کی ساری دستوری کشمکش نہ صرف پارلیمانی اور سیاسی آزادی کے لئے تھی بلکہ وہ شخصی آزادی کے تحفظ کے لئے بھی تھی۔ اور اس کا حصول خصوصی عدالتوں کی برخواستگی (1641ء) قانون رہائی از حبس بے جا کی منظوری (1679ء) سے ممکن ہو سکا اور آخر میں قانونِ وراثت (ACT OF SETTLEMENT, 1701) 1701ء

نے ججوں کو بادشاہ کے چنگل سے آزاد کیا اور حقیقی معنی میں "حکمرانی قانون" کے دروازے کھول دیئے ۔ ان ہی قوانین کی بنا پر حکمرانی قانون کی عمارت کھڑی کی گئی ۔

رول آف لا کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ قانون سب کے لئے ایک ہی ہو اور قانون کی نظر میں ہر شخص برابر ہو ۔ اس اصول کی بنا پر تمام سرکاری عہدہ دار، عام اس سے کہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اپنی سرکاری حیثیت میں انجام دیئے ہوئے افعال کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں ۔ اگر ان کے فرائض کی انجام دہی میں کسی شہری کو کوئی ضرر پہنچے تو وہ ان کے خلاف نالش کرکے تاوان حاصل کر سکتا ہے اور اس قسم کے مقدمات کی سماعت کا حق ملک کی عام عدالتوں کو حاصل رہتا ہے ۔ یہ باتیں انگلستان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں ۔ یہاں سرکاری عمال یا عہدہ داروں کے لئے (بشمول وزرار) کوئی علٰحدہ عدالتیں نہیں ہیں، جیسا کہ فرانس میں پائی جاتی ہیں ۔ فرانس میں انتظامی عدالتیں ملک کے عام عدلیہ کے نظام سے جداگانہ اور علٰحدہ قائم ہیں ۔ ایسے تمام مقدمات جن میں کوئی سرکاری عہدہ دار اپنی سرکاری حیثیت میں فریق ہوتا ہے ۔ وہ سب ان انتظامی عدالتوں میں فیصل ہوتے ہیں ۔ انتظامی عدالتوں کے قوانین و قواعد بھی عام قوانین سے مختلف ہوتے ہیں ۔ ایسی صورت میں ایک عام شہری کا موقف جبکہ کوئی سرکاری ادارہ یا کوئی سرکاری عامل اس کے مقابل میں فریق ہو یقیناً کمزور ہو جاتا ہے ۔ اس قسم کے انتظام میں فرد کی شخصی آزادی کا کسی حد تک متاثر ہونا ناگزیر ہے ۔ شخصی آزادی کا حقیقی تحفظ اور اس کی کامل ضمانت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ ہر کہ و مہ کے لئے ملک میں ایک ہی قانون رائج ہو اور اس میں کسی قسم کی دوعملی نہ پائی جائے ۔

حکمرانی قانون کے تیسرے پہلو کی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ۔ انگلستان کے دستور کے ارتقار کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عدالتوں نے جس جرأت و جاں بازی سے انفرادی حقوق کی حفاظت کی ہے اس سے نہ صرف فرد کی آزادی محفوظ رہ سکی بلکہ یہی شخصی آزادی کا تصور دستور کی روح رواں بن گیا ۔ دستور کی اساس اور بنیاد اسی تصور پر قائم ہے ۔

روایاتِ دستور (CONVENTIONS)

دستورِ انگلستان میں رسوم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ۔

دستور پر عمل آوری کا انحصار محض روایات اور "کنونشنز" پر ہے۔ اگر ان رسوم کو دستور سے علٰحدہ کر دیا جائے تو دستور کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ روایات کو دستور کا گوشت پوست سمجھنا چاہیے۔ ان کے بغیر دستور کی کل ایک لمحہ کے لئے بھی حرکت میں نہیں رہ سکتی۔ قوانین بھی بے شک دستور کا ایک اہم جزو ہیں۔ لیکن ان قوانین کو مربوط اور قابل عمل رکھنے کے لئے روایات سے کام لیا جاتا ہے۔ قوانین تو تحریری شکل میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن روایات کو کبھی ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ "قانون دستور" اور "روایات دستور" میں جو فرق ہے اس کو نہیں بھولنا چاہیے۔

قانون پارلیمنٹ کا وضع کردہ اور تحریری شکل میں پایا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے روایات صرف مسلسل عمل درآمد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور دستوری مشین کے چلانے کے لئے یہ اس قدر ناگزیر ہو جاتی ہیں کہ ان کے بغیر دستور معطل ہو جا سکتا ہے۔ "روایات دستور" کی خلاف ورزی کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ قانون غیر متحرک اور ساکن ہوتا ہے۔ لیکن روایات میں حیات اور نمو پذیری ہوتی ہے۔ ان میں حالات کے لحاظ سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی رفتہ رفتہ آتی ہے۔ روایات اچانک تبدیل پذیر نہیں ہوتے۔ قانون میں یکایک تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ "کنونشنز" یا روایات ایک قسم کا ضابطہ اخلاق ہیں جن پر سیاست دانوں کو لازماً عمل کرنا پڑتا ہے۔ ان کا کسی موضوعہ قانون، یا مجموعہ قوانین میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملے گا۔ لیکن اس کے باوجود ان کو وہی تقدس حاصل ہے جو "منشورِ اعظم" یا "عرضداشت حقوق" کی دفعات کو حاصل ہو سکتا ہے۔ انگلستان میں موضوعہ قانون کے پہلو بہ پہلو ایک غیر مکتوبی دستور بھی بتا رہا۔ اس غیر مکتوبی دستور کو "کنونشنز" یا روایات کا نام دیا جاتا ہے۔ روایات دستور کا تفصیلی ذکر ناممکن ہے۔ صرف چند اہم مثالوں کے پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ روایات دستور کی بہترین مثال کیبنٹ نظامِ حکومت کی ہے۔ اس پورے نظام کا انحصار "روایات" پر ہے۔ اس کے لئے کبھی کوئی قانون نہیں بنایا گیا۔ وزیر اعظم کا انتخاب اور تقرر، کابینہ کی تشکیل، وزراء کی "مشترکہ ذمہ داری"، وزیر اعظم کا اکثریتی پارٹی سے چُنا جانا، دارالعوام میں شکست کی صورت میں وزارت کے مستعفی ہونے کا لزوم، ان سب کی بنیاد کلیتہً روایات پر ہے۔

ان اہم باتوں سے متعلق قانون یکسر خاموش ہے ۔ اگر روایات موجود نہ ہوں تو پورا کابینی نظام یکلخت معطل ہوکر رہ جائے ۔ غرض دستور انگلستان کا زیادہ تر روایات پر منحصر ہونا اس کی ایک اہم خصوصیت ہے ۔ کیونکہ اس دستور کا بیشتر حصہ روایات پر اور کمتر حصہ قوانین پر مشتمل پایا جاتا ہے ۔

نظریات اور حقائق کا فرق

دستورِ انگلستان کی آخری اہم خصوصیت اس کے ظاہر و باطن کا فرق ہے ۔ اعضائے حکومت کے اختیارات و فرائض سے متعلق اس میں ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جو شاید کسی زمانے میں صحیح اور درست ہوں تو ہوں لیکن وہ موجودہ صورتِ حال سے قطعاً کوئی تطابق نہیں رکھتیں ۔ تاج کے جو اختیارات گنوائے جاتے ہیں ان میں سے ایک پر بھی فی الحقیقت بادشاہ اس زمانے میں عمل نہیں کرسکتا ۔ مگر پھر بھی ان کے بیان کرنے میں وہی اصطلاحات اور وہی زبان استعمال کی جاتی ہے جو اس عہد کے لئے صحیح ہوسکتی تھی جبکہ بادشاہ حقیقی حکمران تھا ۔ اسی طرح اب بھی ہم پارلیمنٹ کو مقننہ اور کابینہ کو عاملہ کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اب کابینہ صرف عاملہ ہی نہیں بلکہ مقننہ بھی ہے ۔ اس پر پچھلے صفحات میں کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے ۔ تمام قانون سازی کا بنیادی کام بحث مباحثہ سے لے کر اس کو آخری اور قطعی صورت دینے تک کابینہ میں انجام پاتا ہے اور بعد میں پارلیمنٹ سے صرف اس کی منظوری حاصل کرلی جاتی ہے ۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود پارلیمنٹ کو مقننہ اور کیبنٹ کو عاملہ کہنے سے کوئی گریز نہیں کرتا ۔ نظری طور پر اب بھی بادشاہ اپنے وزراء کا انتخاب کرتا ہے ۔ اور اس کے وزراء "ہز مجسٹیز سروینٹس" (HIS MAJESTY'S SERVANTS) کہلاتے ہیں، لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ وزراء کے انتخاب میں اب بادشاہ کا کوئی دخل باقی نہیں رہا ۔ یہی نہیں بلکہ وزیر اعظم کا انتخاب بھی سوائے شاذ صورتوں کے اس کے اختیار میں نہیں ۔

یہ سب باتیں انگلستان کے دستور کے "حقائق" اور "نظریات" کے مابین جو بُعد

ہے اس کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہاں "مفروضات" کچھ اور ہیں اور اصلیت کچھ اور۔ اس کے "حقیقی" اور "نظری" پہلوؤں کا یہ فرق اور اس کے ظاہر و باطن میں عدم مطابقت اکثر اوقات گمراہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے باہر کے مبصرین کے لئے انگلستان کا دستور ہمیشہ ایک بھول بھلیاں ثابت ہوا کیا ہے۔ اور تعجب نہیں کہ وہ اسے حیرت اور اچنبھے کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔ اس کی لچک، اس کی تغیر پذیری، اس کی مرئی اور غیر مرئی صفات سمجھنے اور سمجھانے کی حد تک اسے قدرے مشکل ضرور بنا دیتی ہیں لیکن ان ہی اسباب کی بنا پر غالباً وہ دنیا کا سب سے دلچسپ اور پرکشش دستور بھی ہے۔

چند اہم کتابیں جن سے استفادہ کیا گیا

1- Hallam, H .... Constitutional history of England.

2- Maitland, F.W. ... Constitutional history of England.

3- Anson, W.R. ... The law & custom of the constitution.

4- Dicey, A.V ... The law of the constitution.

5- Low, S. ... The governance of England.

6- Adams, G.B. ... Constitutional history of England.

7- Keir, D.L. .. Constitutional history of modern Britain since 1485

8- Marriot, A.J.R. ... English political institutions.

9. Bagehot, W. ... The English constitution.

10- Muir, Ramsay. .. How Britain is governed.

11- Lowell, A.L. .. The government of England.

12- Hearn ... Government of England.

13- Keith, A.B. . The constitution of England from Queen Victoria to George VI.

14- Keith, A.B. ..... The British cabinet system.

15- Laski, H.V. .. The crisis of the constitution - 1932.

16- Laski, H.J. .. Parliamentary government in England.

17- Hewart, Lord. ... The new despotism.

18- Jennings, W.I. ... The British constitution.

19- Jennings, W.I. ... Cabinet government.